

خبرنامہ
پردیش اُردو اکادمی

Indian Embassy
Mascow

Ministry of External affairs!
South Block
New Delhi - I

اتر پردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

جلد: ۱۰
شمارہ: ۷
جنوری سنہ ۱۹۸۲ء
سالانہ چندہ: پانچ روپے
فی شمارہ: پچاس پیسے

[illegible] خان، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے دفتر اتر پردیش اردو اکادمی قیصر باغ لکھنؤ سے شائع کیا اور [illegible] پریس [illegible] لکھنؤ سے طبع کیا۔

اداریہ

قصۂ خوابِ آور، اسکندر و جم کب تلک

نیا سال مبارک ہو ان لوگوں کو جو ایک بوند کی خاطر کوچہ و بازار میں رسوا ہوئے ہیں اور ان لوگوں کو بھی جنھوں نے آخرکار دوسروں کی پیاس کو اپنی پیاس سمجھا! سنہ ۱۹۸۲ء کا استقبال اس یقین کے ساتھ کرنا چاہیے کہ لسانی آمریت کا طلسم ٹوٹے گا اور جمہوری قدروں کا بول بالا ہوگا ــــــ! اب ہندستان کا ہر نونہال اپنی مادری زبان میں لوریاں سنے گا، اب ہندستان کا ہر سپاہی اس کے دفاع کے لیے اپنی زبان میں رجز پڑھتا ہوا آگے بڑھے گا، اب محبت کرنے والوں کو شرحِ آرزو کے لیے زبانِ غیر کا سہارا نہیں لینا پڑے گا اور اپنے عقائد و مسائل کے ابلاغ و تفہیم میں اب کوئی گونگا اور بہرا نہیں رہے گا۔ اب دو نسلوں کے درمیان زبان حدِ فاصل کی حیثیت نہیں اختیار کرے گی اور اب خون کے رشتوں کو زبان کی اجنبیت متاثر نہیں کرے گی۔ اب نوحۂ غم ہو یا نغمۂ شادی وہ ہمارا اپنا ہوگا۔ ہمارے دل کی گہرائیوں سے ابھرے گا اور ہماری زبان سے ادا ہوگا!

آپ جانتے ہیں کہ ہر یقین کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی اندازِ فکر رہتا ہے اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر یقین کو استحکام ملتا ہے کسی نہ کسی مربوط لائحۂ عمل سے۔ ہماری سب سے بڑی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ ہم ایک متزلزل اندازِ فکر کے حامل رہے اور ایک بے نام و بے جان لائحۂ عمل کے مالک۔ ہم نے سوچا تو دوسروں کے ذہن سے سوچا اور ہم چلے تو دوسروں کے قدموں سے چلے۔ ہم نے کبھی اپنی ذہنی صلاحیتوں کو نہیں پرکھا اور ہم نے کبھی اپنی قوتِ عمل اور اپنے پرِ پرواز کا امتحان نہیں لیا اور سچ بات یہ ہے کہ محبت۔ مادری زبان کی محبت جو تیاگ اور تپسیا مانگتی ہے، ہم اب تک اس کا مظاہرہ نہیں کر سکے۔ ہم حقائق کا سامنا نہیں کرنا چاہتے اور ظواہر پر مرمٹتے ہیں۔ بات ان کی نہیں جنھیں سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں ملا، زیرِ بحث وہ لوگ ہیں جو سرکاری یا نیم سرکاری اداروں

میں اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ حقائق یہ ہیں کہ وہ افسوس ناک حد تک اظہار کی قوت اور تفہیم کی صلاحیت سے عاری ہو چکے ہیں اور ظواہر یہ ہیں کہ اگر اردو پر کوئی ستم اور ٹوٹا یا اگر اردو کے حق میں کسی نے ایک اور قصیدہ پڑھ دیا تو جب تک ہم اخبارات کے ذریعہ اظہار غم یا اعلان تشکر نہیں کر لیتے، چین سے نہیں بیٹھتے۔

اردو اب اس طلسماتی فضا سے اکتا چکی ہے، اب وہ اس گھٹن کو ختم کر کے رہے گی، اب وہ رہبر نہیں اپنا قاری پیدا کرے گی۔ وہ سدِ رمق کی تلاش میں نکلی ہے، وہ ابھی مری نہیں ہے کہ احباب پلاؤ کھائیں اور فاتحہ پڑھیں، وہ اپنا حق حاصل کر کے رہے گی حکومت سے بھی اور اپنے چاہنے والوں سے بھی۔ وہ ہندستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے، ہندستان ہمیشہ زندہ رہے گا اور یہ علامت بھی ہمیشہ زندہ رہے گی ـــــ اسی انداز فکر کے سہارے اور اسی لائحۂ عمل کے بل بوتے پر خاک وطن کے ذرّے ذرّے کو نئے سال کی مبارک باد پیش کی جا رہی ہے۔

میں زندگی کو امروز و فردا کے پیمانے سے ناپنے کا عادی نہیں، مجھے وہ سفر زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے جو شمار سنگ و میل سے بے نیاز کر دے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اپنا احتساب نہیں کرتا۔ اردو کے سیاق و سباق میں میں نے ہمیشہ اپنے کو عوام کی عدالت میں حاضر سمجھا۔ جب اتر پردیش اردو اکادمی کے انتظامیہ کی سربراہی ایک محدود مدت کے لیے مجھے سونپی گئی تو اس کے باوجود کہ یہ ایک نامزد ادارہ ہے، میں نے اسے ایک جمہوری ادارہ سمجھا اور جمہور کے سامنے اپنے کو جواب دہ ٹھہرایا۔ انھیں اس کا حق حاصل ہے کہ وہ میری بے راہ روی پر سخت سے سخت الفاظ میں ٹوک دیں اور یہ بات میرے واجبات میں داخل ہے کہ یا تو میں جمہور کی امنگوں کے مطابق کام کروں یا اس سے الگ ہو جاؤں۔

نئی اکادمی فروری ۱۹۸۱ء کے اواسط میں نامزد ہوئی اور مجھے یہ بھول جانا چاہیے کہ جب میں اکادمی میں باریاب ہوا تو حالات کتنے سخت اور ناسازگار تھے صرف ناکردہ گناہوں کی داد ملتی تو کوئی بات نہیں تھی، طرفگی حالات کو کیا کہیے کہ [illegible]

کی بھی داد ملی۔ اس میں لگا ایں لیے رہا کہ شاید کسی گوشے سے حسرتِ تعمیر کی بھی داد مل جائے!!

صدر اکادمی جناب علی جواد زیدی کی سرپرستی نے، اراکین مجلس عام کے مشوروں نے اور مجلس انتظامیہ کی فعال رہنمائی نے حالات کو سازگار بنا دیا ہے۔ عرقِ انفعال کے سوا ابھی دفترِ عمل میں کوئی ایسی چیز نہیں جو عرصۂ محشر میں پیش کی جا سکے لیکن آثار و قرائن یہ کہتے ہیں کہ اللہ اکادمی محبانِ اُردو کو مایوس نہیں کرے گی۔ اکادمی کے مقاصد محدود و متعین ہیں، کوشش کی جا رہی ہے کہ مقاصد کے حصول کے لیے اکادمی اور تیزی سے آگے بڑھے۔

محمود الٰہی

ضروری نوٹ

دسمبر ۸۱ء کے شمارے کا اداریہ،
"یہی تو ہیں جو ڈبو یا کیے سفینوں کو"
پروفیسر محمود الٰہی چیرمین مجلس انتظامیہ نے تحریر کیا تھا۔

(ادارہ)

دو نمبر کی شاعری

مجھے آپ کی نکتہ رسی اور رمز شناسی پر اعتماد ہے پھر بھی عنوان کے سیاق و سباق میں اتنی وضاحت ضروری ہے کہ میں خدانخواستہ شاعروں کی درجہ بندی کرنے نہیں جا رہا ہوں۔ یہ کام تو نقادوں کا ہے یا قیافہ شناسوں کا یا اس حفاظتی دستے کا جو ہر کوچہ و بازار میں ہماری آپ کی دیکھ ریکھ کے لیے مامور و متعین ہے۔ یہی تینوں فیصلہ کرتے ہیں کہ کون متشاعر ہے، کون بے چہرہ ہے اور کون رہزن۔ میں تو صرف ایک اصطلاح سے بحث کر رہا ہوں جو ان دنوں مقبول انام ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے عطیات میں بلیک مارکیٹنگ اور اسمگلنگ کی اصطلاحیں بھی شامل ہیں۔ جوں جوں ان فنون لطیفہ کی ترقی ہوتی گئی، ان کی تعریفات میں بھی لچک آتی رہی یہاں تک کہ کسی اللہ کے بندے نے اس کے لیے ایک ایسی اصطلاح وضع کر دی جو ہر اصطلاح پر بھاری ہے۔ اس اصطلاح کا نام ہے۔ "دو نمبر"! اگر آپ کسی سے دریافت کریں کہ فلاں ٹھاٹ باٹ سے کیوں رہتا ہے تو یہی جواب ملے گا کہ وہ دو نمبر کا دھندا کرتا ہے۔

لوگ کہتے آئے ہیں کہ شاعر اپنے گرد و پیش کا ترجمان ہوتا ہے مگر کسی کو کیا معلوم کہ اچھا شاعر وہ ہوتا ہے جو کبھی اپنے عمل کو سماج کے عمل میں اور کبھی سماج کے عمل کو اپنے عمل میں ڈھال لیتا ہے۔ اسی کلیے کے تحت ایک بڑے شاعر نے دو نمبر کی شاعری شروع کر دی، پھر تو لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

دو نمبر کی شاعری نہ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتی ہے اور نہ بر سرِ عام سنائی جاتی ہے یہ لب بہ لب اور سینہ بہ سینہ منتقل اور مشتہر ہوتی ہے۔ اگر کسی نے کوئی بہت معرکے کی چیز کہہ دی تو مخصوص نشستوں کے اہتمام میں دیر نہیں لگتی۔ ان نشستوں کے

تو جگہ کی کوئی قید ہے اور نہ وقت کی۔ ان کے لیے دعوت نامہ بھی نہیں جاری ہوتا۔ یہ سارا کام بس ایک اشارے کا رہین منت ہوتا ہے اور اشارہ فہمی کس معیار کی ہوتی ہے وہ ذوق کی زبان سے سنیے:

اشارہ فہم ہے ایسا کہ وہ بیان کرے
زبانِ برگ سے گونگوں کے خواب کی تعبیر

یہ مخصوص نشستیں واقعی مخصوص ہوتی ہیں، کیا مجال کہ کرام و ثقات اور منتخب روزگار حضرات کے علاوہ ان میں کوئی در آئے۔ ان میں جو اشعار پڑھے جاتے ہیں وہ فصاحت و بلاغت کا نادر نمونہ ہوتے ہیں۔ تشبیہیں، استعارے، ترکیبیں اور بندشیں ایسی ہوتی ہیں کہ اردو کی کساد بازاری کا غم غلط ہو جاتا ہے۔ یہاں انتخاب الفاظ پر قدغن نہیں ہے۔ تفحص الفاظ کی زندہ مثال یہاں مل جاتی ہے اور کارخانۂ قدرت میں جتنے اعضا و جوارح گھڑے جاتے ہیں، ان سب کو یہاں مناسب نمائندگی ملتی ہے منظر اور پس منظر کے ساتھ!

لوگ کہتے ہیں کہ دو نمبر کے دھندے سے ملک میں دہرا نظام معیشت چل رہا ہے، ایک وہ جس پر حکومت کا قابو ہے اور دوسرا وہ جسے دو نمبر کا دھندا چلا رہا ہے اسی طرح ملک ادب میں دہرا نظام شاعری چل رہا ہے۔

اگر آپ دو نمبر کی شاعری کے نمونے سے محروم ہیں تو مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ جس طرح حکومت کبھی کبھی عاجز آ کر اعلان کر دیتی ہے کہ جس کے پاس جتنا دو نمبر کا دھن ہو، وہ اس کا اظہار کر دے کہ کوئی باز پرس نہیں ہو گی۔ اسی طرح وہ دن دور نہیں جب دو نمبر کی شاعری کو بر سر عام لانے کا موقع دے دیا جائے گا۔ آخر سودا، میر، انشا، مصحفی اور نظیر اکبر آبادی کے یہاں بھی دو نمبر کی شاعری کے بعض نمونے ہیں کہ نہیں اور آخر یہ نمونے بازار میں آئے کہ نہیں؟

نیاض

گوشۂ رشید احمد صدیقی

پیدائش :ــــــــ ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء

وفات :ــــــــ ۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء

اردو کے مقدمے کی وکالت میں مایوسی اور بے دلی کا اظہار اس بنا پر درست نہیں کہ وہ ناسازگار حالات سے دوچار ہے۔ اس کی حمایت اس لیے ضروری ہے کہ فرائض میں داخل ہے کہ وہ ایک ایسی قوم، ملک و تہذیب اور صحت مند تقاضوں کی آوردہ ہے جو اپنی حیثیت اور خدمات کے اعتبار سے عزت اور منزلت کی سزاوار رہ چکی ہے۔

اردو کے مسائل پر

رشید احمد صدیقی

کے خیالات

آزادی کے فوراً بعد سے مسلمان کبھی اردو کے اپنے ادارے (تعلیم گاہیں) قائم کرنے کے لیے بھاگے بھاگے پھرے ہیں اور کبھی ہندی کی طرف دوڑے ہیں کہ کہیں ان کے بچے ہندی سے نا آشنا رہ کر ہندی کی دنیا میں پیچھے رہ کر پامال نہ ہو جائیں۔ ہندی سیکھنے کی طرف سے کچھ مطمئن ہوتے ہیں تو معاً اردو کا خیال آتا ہے اور بے اختیار دوڑے ہوئے واپس آتے ہیں کہ اس سنگلاخ سرزمین کو کہاں تک کارآمد بنا سکیں!

آپ سعی صفا و مروہ کی روایت سے واقف ہوں گے جو ارکان حج کا بڑا اہم رکن ہے یعنی کس طرح حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت پر ان کی ماں حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش میں بے اختیار بھاگتی ہوئی دور تک چلی جاتیں معاً حضرت اسمٰعیلؑ کی تنہائی، تشنگی اور تحفظ کا خیال آتا تو بے قرار و بے اختیار ہو کر ان کی خبر گیری کے لیے واپس آتیں۔ اردو کے تحفظ کی تنظیم اور ہندی کی بالادستی کی تنظیم جن فریقوں کے ہاتھ میں ہے، اُن سے آپ واقف ہیں۔ مسلمان انھی دونوں صفا و مروہ کے درمیان بھاگتے نہ پھریں تو کیا کریں! حضرت اسمٰعیلؑ کی ایڑی رگڑنے سے آب صافی کا چشمہ اُبل پڑا تھا، دیکھیے اردو کے پاؤں یا ناک رگڑنے سے کیا برآمد ہوتا ہے!!

سہ لسانی فارمولے میں اگر اردو کی تعلیم کی گنجائش نہیں نکلی یا گنجائش نکلنے نہیں دی جاتی تو جن کی مادری زبان اردو ہے، اُن کو اپنے بچوں کے لیے اردو کی تعلیم کا بندوبست اپنے اپنے طور پر کرنا پڑے گا۔ یہ پوزیشن کتنی ہی تکلیف دہ کیوں نہ

نہ ہو، لازم ہے مفر نہیں قیمت چاہے کتنی دینا پڑے۔

عجیب مصیبت ہے، اردو اور اردو سے متعلق ہر بات خواہ وہ علمی و تہذیبی ہو یا جان و مال اور آبرو سے متعلق، یتیم کا مال بن گئی ہے ہر کس و ناکس جس طرح چاہتا ہے طبع آزمائی اور دست درازی کرتا رہتا ہے۔

اردو کا ذکر یہاں یقیناً بے محل ہے لیکن اس سے مقصود اپنی ایک نفسیاتی افتاد کا اظہار ہے لیکن صحیح یا غلط، اور معلوم نہیں کیوں اور کب سے یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ زبان کے علاوہ اردو بہت کچھ اور بھی ہے، جیسے ایک قیمتی ورثہ، ایک قابل قدر روایت، ایک نادر آرٹ، ایک مسحور کن نغمہ، قابل فخر کارنامہ، کوئی پیمان وفا یا اس طرح کی کتنی اور باتیں جو محسوس ہوتی ہیں لیکن بیان نہیں ہو پاتیں۔ چنانچہ کسی کو غلط اردو بولتے سنتا تو سمجھتا کہ بولنے والا قابل اعتنا نہ تھا یا کسی معذوری میں مبتلا ہے تو ہماری ہمدردی کا مستحق ہے۔ رفتہ رفتہ جب یہ دیکھنے میں آیا کہ اردو پر طرح طرح کے الزام لگائے جا رہے ہیں اور اس کو زک پہنچانے اور ختم کر دینے کے اہتمام ہو رہے ہیں تو معلوم نہیں کتنے حجاب آنکھوں کے سامنے سے دور ہو گئے اور اردو کا جواب حال ہوا ہے، اس سے یقین آچلا ہے کہ اس کے بارے میں ابھی ابھی جس حسنِ ظن کا اظہار کر چکا ہوں، وہ غلط نہ تھا!!

ایک زمانے میں سب سے زیادہ روشن خیال وہ سمجھا جاتا تھا جو خدا کا قائل نہ ہو۔ آج سب سے بڑا محب وطن وہ ہے جو اردو کا دشمن ہو۔ دیکھنے میں یہ آ رہا ہے کہ اردو ہر جنگ میں تکبیر کا کام دیتی ہے اور ہر جیت میں تاوان کا۔

میں بذاتِ خود اردو کو ہندوستانی قوم و قومیت کے عناصرِ ترکیبی میں سمجھتا ہوں۔

تنویر احمد علوی

رشید احمد صدیقی

کچھ یادیں

پروفیسر رشید احمد صدیقی میرے لیے ان ادبی شخصیتوں میں تھے جن کو میں نے اپنے طالبعلمانہ مطالعہ کے دوران ایک خواب کی طرح دیکھا تھا اور میں کبھی یہ خیال بھی نہیں کر سکتا کہ ایسی کسی بڑی ادبی شخصیت سے کبھی میری ملاقات بھی ہو سکتی ہے۔ میں ایک دور افتادہ گاؤں میں ٹیچر تھا جہاں تک ان جیسے بڑے ادیبوں کی تحریریں تو ادبی رسائل کی صورت میں پہنچ جاتی تھیں مگر ان تک مجھ ایسے کسی معمولی انسان کے پہنچنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

۱۹۵۳ء میں جب پہلی بار مرحوم سید ظہیر الدین علوی صاحب سے ملنے کے لیے علی گڑھ گیا تو وہ مجھے شعبہ میں بھی لے گئے مگر رشید صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تین برس اور بیت گئے ۱۹۵۶ء میں ریسرچ کرنے کے لیے میں دوبارہ علی گڑھ پہنچا تو اب رشید صاحب کی خدمت میں باقاعدہ حاضری کا اتفاق ہوا۔ دعرش ملسیانی مرحوم نے میرے لیے سفارشی خط لکھا تھا) اس خط کے ذکر کے ساتھ علوی صاحب نے مجھے رشید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ میں اپنے داخلے کے سلسلہ میں اتنا پریشان تھا کہ بس رشید صاحب کا منہ تکتا رہا کہ یہ کیا فرماتے ہیں اس وقت سوائے اپنے مسئلہ کے اور کوئی بات ذہن میں نہ آئی۔

داخلہ کی بات طے ہوئی موضوع کیا ہو اس پر میں نے پروفیسر آل احمد سرور سے مشورہ کیا تو موصوف نے میرے لیے تحقیق کے موضوع " ذوق۔ سوانح اور انتقاد کو طے کیا اور مطالعہ کے لیے کچھ تذکروں کے نام اپنے قلم سے تحریر فرما دیے یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے کسی تذکرہ کے نام سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ نسیم قریشی صاحب نے میرے کام کے لیے ریسرچ کا بنیادی خاکہ مرتب کیا اور رشید صاحب نے اس کی منظوری مرحمت فرمائی۔

رشید صاحب ایک دو بات سے زیادہ نہیں کرتے تھے اور شعبہ کے افراد کے درمیان اکثر میں نے اُن کو خاموش بیٹھے ہوئے دیکھا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ میز کے ساتھ

وسط میں لگی ہوئی کرسی پر جسے میں کرسی صدارت خیال کرتا تھا، کبھی نسیم قریشی صاحب، کبھی معین احسن جذبی صاحب اور کبھی علوی صاحب بیٹھے نظر آتے تھے اور رشید صاحب تھوڑے سے فاصلہ پر برابر میں بچھی آرام کرسی پر تشریف رکھتے تھے۔

ان کے چہرے پر اکثر سنجیدگی چھائی رہتی تھی جیسے وہ کچھ سوچ رہے ہوں، تمام اساتذہ ان کا احترام کرتے تھے لیکن شعبہ میں افسرانہ رعب و داب کی فضا موجود تھی کم از کم میں نے محسوس نہیں کیا۔

میں اکثر سوچا کرتا تھا ____________ کہ رشید صاحب اپنی تحریروں میں اس قدر شگفتہ مزاج ہیں بات میں سے بات اور نکتہ میں سے نکتہ پیدا کرتے ہیں لیکن ویسے بولتے تک نہیں ان کی حس مزاح کا اظہار ان کی تحریر کے ماسوا تقریر میں کیسے ہوتا ہے ایک بار جب میں نسیم قریشی صاحب کے ساتھ شعبہ میں بیٹھا ہوا تھا ایک خاتون کسی کام سے آئیں اور چلی گئیں تو معلوم نہیں کیوں رشید صاحب ایک بہت لطیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "نسیم صاحب ہمارے تہذیبی دور کا المیہ یہ ہے کہ جوان مرد کو کام اور ایک جوان عورت کو شوہر نہیں ملتا"

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ رشید صاحب کے یہاں حس مزاح کا اظہار اس لطیف طنز کی شکل میں ہوتا ہے۔

ایک بار میں اور نسیم قریشی صاحب رشید صاحب کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے کمرے میں ادھر ادھر کچھ کرسیاں بچھی تھیں دیوار سے لگی ہوئی ایک بڑی سی تخت بچھی تھی اس پر سفید چاندنی اور قالین بچھا تھا اسی پر رشید صاحب کی نشست تھی یہ وہ دن تھے جب رشید صاحب کی تصنیف "شیفتہ بیانی میری" کتابت کی منزل سے گزر رہی تھی کتابت شدہ پہلے اوراق رشید صاحب کے سامنے رکھے تھے جب ہم لوگ پہنچے تو وہ انہیں کو دیکھ رہے تھے فرمانے لگے نسیم صاحب اگر کاتب اسی طرح تصرفات کرتا رہا تو یہ کتاب میری نہیں اسی کی ہو جائے گی۔

جب مجھے ۱۹۵۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کی تاریخ کی پہلی ڈاکٹر آف لٹریچر کی

ڈگری ملی تو میں سلام کے لیے حاضر ہوا پروفیسر اسلوب احمد انصاری بھی ساتھ تھے ان کے باغیچہ کے ملحقہ برآمدے میں ملاقات ہوئی میں نے باغیچہ کے گلابوں کی تعریف کی ہنس کے فرمانے لگے خوشی کی بات ہے کہ ذوق پہ مسلسل تحقیقی کام کرنے باوجود آپ کی خوش مذاقی اور طبیعت کی شگفتگی باقی ہے

محمد حسین آزاد پر گفتگو آئی فرمایا آزاد کی بات سچی ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو اچھی بہت لگتی ہے قاضی عبدالودود صاحب نے بڑی تحقیق فرمائی ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن اس طرح کی ہزار تحقیقات کے بعد بھی دل یہ چاہے گا کہ بات آزاد ہی کی مانی جائے۔

وفات سے کچھ ہی زمانے پہلے ایک بار پھر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی ایک "مدخولۂ گورنمنٹ" قسم شخصیت کے ذکر میں فرمانے لگے یعنی حسن بن صباح کی جنت آج کے زمانہ میں بھی ہو سکتی ہے مگر اس میں داخل ایسے شخص کو کیا جاتا ہے جو کسی بہت بڑے قومی جرم کا مرتکب ہونا بخوشی قبول کرے۔

مجھے اسی روز بلکہ تھوڑی دیر کے بعد واپس ہونا تھا گھڑی دیکھنے لگا تو فرمایا وقت کا احساس آپ کو نہیں مجھے ہونا چاہیئے آپ کے پاس تو بہت وقت ہے خوش رہیئے خدا حافظ۔ آج بھی جب آخری ملاقات کے یہ لمحے یاد آتے ہیں تو مجھے اپنی اس حرکت پر کتنی ندامت ہوتی ہے کہ نہیں بتا سکتا۔

میری تحریروں میں یہ نقص بتایا جاتا ہے کہ ان میں "علی گڑھ" بہت ہوتا ہے۔ اس لیے وہ لوگ جو علی گڑھ سے کم یا بالکل واقف نہیں ہوتے، ان کو ان مضامین یا اس طرح کی باتوں سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس حرکت سے بعض احباب مجھ سے چڑنے بھی لگے ہیں۔ ان سب سے مجھے بھی ایک شکایت ہے، وہ یہ کہ وہ خود علی گڑھ سے کیوں نہیں واقف ہیں۔ اردو جاننا اور علی گڑھ سے واقف نہ ہونا بجائے خود کسی فتور کی علامت ہے۔ اردو کا نام علی گڑھ بھی ہے!!

(رشید احمد صدیقی)

پروفیسر نذیر احمد

رشید احمد صدیقی چند یادیں

پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کو سب سے پہلے میں نے لکھنؤ یونی ورسٹی میں دیکھا جب وہ یونی ورسٹی کے کسی کام کے لیے تشریف لائے تھے۔ ان کی جو تصویر میرے ذہن میں تھی وہ اس سے بالکل جدا نکلے، ان کے مزاح وظرافت سے میرے خیال میں ان کی جو تصویر ابھری تھی وہ ایک ایسے ہنسوڑ شخص کی تھی جو پرگو، مجمع پر چھا جانے والا اور پرشور شخصیت کا مالک ہو، لیکن وہ نہایت متین، سنجیدہ، کم گو اور باوقار ٹھہرے ذہنی تصویر ٹوٹنے کی تنہا مثال میری ہی نہ تھی یونی ورسٹی کا کام ختم ہونے پر فارسی و اردو شعبے کے سب اساتذہ کے ساتھ لال بارہ دری میں چائے پینے تشریف لائے جہاں یونی ورسٹی کے دوسرے اور اساتذہ پہلے سے موجود تھے جب پروفیسر آل احمد سرور نے رشید صاحب کا تعارف ان لوگوں سے کیا تو سب کو نہایت اچنبھا ہوا، گویا ان کے ذہن میں جو رشید صاحب تھے، وہ حقیقی رشید صاحب سے بالکل جدا تھے،

رشید صاحب کی وضع قطع سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی صاحب طرز انشار پرداز ہیں جن کے طنز و مزاح نے اردو ادب میں نئی راہ نکالی ہے۔

میں مارچ ۱۹۵۷ء میں علی گڑھ آیا، میرے یہاں لانے میں منجملہ چند اور بزرگوں کے، ان کا بھی ہاتھ تھا، علی گڑھ تاریخ ادب اردو سے منسلک ہوا تو ان کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا اور میں ان کی پرتاثیر شخصیت سے نہایت درجہ متاثر ہوا ۱۹۵۹ء میں مجلہ "فکر و نظر" کے اجرا کا منصوبہ تیار ہوا، جنوری ۱۹۶۰ء میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ اس مجلے سے ان کی والہانہ محبت تھی اس کے لئے وہ خود مضمون لکھتے دوسروں سے لکھواتے اور حاصل کیے ہوئے مضامین کو بغرض اصلاح غور سے پڑھتے، اس کے چھپنے کا انتظار بڑی شدت سے کرتے جب نکلتا تو سب سے پہلے انہیں کے ہاتھ میں پڑتا، اس کو دیکھ کر ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی، پورے رسالے کو چند بار پڑھتے اور کئی روز تک اسی کا چرچا

رہتا۔ پھر دوسرے شمارے کی تیاری شروع ہوتی پورے تین ماہ اس کی تیاری اور اہتمام اور انتظام میں گزرتا۔ ۱۹۶۵ء تک اس رسالے سے رشید صاحب کا تعلق رہا اور اس زمانے میں رشید صاحب کا فن اپنے عروج پر تھا اس میں ان کے بعض وہ مضامین شائع ہوئے جنھیں ان کی بہترین تخلیق قرار دیا جا سکتا ہے۔

راقم اکثر ان کی خدمت میں حاضری دیتا، اکثر بعد نماز عصر حاضر ہوتا، تھوڑی ہی دیر میں ہاتھ میں جائے نماز لیے ہوئے مکان کی پُشت والے صحن یا دالان میں نشست ہوتی، مغرب کی نماز میں وہیں پڑھتا۔ گفتگو ہمیشہ علمی و ادبی ہوتی۔ جب تک تاریخ ادب اردو سے تعلق رہا وہی گفتگو کا موضوع تھا۔ 'فکر و نظر' کا اجرا ہوا تو پھر ساری گفتگو کا مرکز یہی مجلہ قرار پایا، ادب کے علاوہ اسلامی تہذیب سے بھی ان کی خاصی دلچسپی تھی

علمی انکسار کا یہ عالم تھا کہ کسی معاملے میں اپنے شاگردوں تک سے رجوع کرنے میں ان کو کوئی عار نہ ہوتا، فارسی کے معاملے میں وہ پروفیسر ضیا احمد بدایونی سے رجوع کرتے، کبھی کبھی راقم کو بھی یاد کر لیا کرتے، کتابیں جمع کرنے کا شوق نہ تھا، البتہ پڑھنے کا بے پناہ شوق تھا، اس کے لیے کتاب خانے سے کتابیں منگاتے کبھی کبھی فارسی شعبے سے بھی کتابیں منگا لیا کرتے، خط لکھتے، تو کاغذ معمولی ہوتا لیکن لفافے کے اندر ضرور رکھتے اور احتیاط سے اس کو چسپاں کرتے، دستی خط کے لفافے پر بھی نام اور مفصل پتا بڑے اہتمام سے درج فرماتے۔

باوجود سادگی اور انکسار کے طبیعت میں بڑی نفاست تھی جس کا ثبوت ان کے گھر کے چپے چپے سے فراہم ہوتا ہے۔ ان کے خوشنما لان، ان کے گلاب کے تختے، ان کی نفاست کی زندہ یادگاریں ہیں۔ جو حضرات ان کے یہاں کھانے کی محفلوں میں شریک ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کا معیار کتنا بلند تھا، گو وہ پرہیزی کھانا کھاتے

مختصر یہ، رشید صاحب کی صحبت میں میں بہت رہا ہوں اور ان سے بہت فیض بھی اٹھایا ہے چنانچہ اس سلسلے کے کافی واقعات مرے ذہن میں محفوظ ہیں لیکن ان کی جمع آوری خود ستائی کا موجب ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے واقعات کے قلم بند کرنے سے احتراز کرتا رہتا ہوں۔

شجاعت علی سندیلوی

رشید صاحب

"مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے"

جنوری ۱۹۷۷ء کے پہلے پندرھواڑے میں، زبان و ادب اور ملک و ملت کی دو یگانۂ روزگار ہستیاں داغِ مفارقت دے گئیں۔ ۶ر جنوری ۱۹۷۷ء کو مولانا عبدالماجد دریابادی کا انتقال ہوا۔ ابھی ان کی وفات کا غم تازہ ہی تھا اور آنسو خشک بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ۱۵ر جنوری ۱۹۷۷ء کو رشید احمد صدیقی بھی سدھار گئے۔

"زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے"

رشید صاحب نے ۸ر جنوری ۱۹۷۷ء کو مولانا عبدالماجد مرحوم کے غم میں تعزیت نامہ لکھا تھا، اس کے یہ چند جملے اب بھی دل پر نقش ہیں۔

"مرحوم کی وفات سے کتنی وہ طویل قیمتی اور نوع بہ نوع خدمات کی یاد تازہ ہو گئی جن پر مرحوم کی گرانقدر شخصیت اثر انداز رہی"۔ . . . وہ ایک نشانِ منزل تھے جس کو انھوں نے ہمارے علم و دانش اور تہذیب و ثقافت کے راستے میں بہت دور تک لا کر نصب کر دیا تھا۔ مرحوم کی مذہبی، ادبی اور اخلاقی خدمات کی تفصیل پیش کرنا ابھی تو کیا بہت دنوں تک ناممکن رہے گا۔"

یہ خط رشید صاحب نے محبی و عزیزی ڈاکٹر ہاشم قدوائی کے نام تحریر فرمایا تھا۔ لکھنے والے اور پڑھنے والے کو کیا معلوم تھا کہ جس دن ایک بزرگ اور باکمال ہستی کا تعزیت نامہ لکھا اور بھیجا گیا، لکھنے والے کی زندگی کا آخری ہفتہ ہے، اور وہ اس کے بعد ٹھیک ایک ہفتہ ۱۵ر جنوری ۱۹۷۷ء کو، سب سے رخصت ہو جائے گا۔ دنیائے اردو اپنے ایک منفرد طرز کے باکمال سے محروم ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا!

رشید صاحب کی یاد آتی ہے، بہت سی بھولی بسری باتیں یاد آنے لگتی ہیں، سب سے

زیادہ ان کی شگفتہ بیانی یاد آتی ہے، بات میں سے بات پیدا کرنا یاد آتا ہے اور ــہ

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں

علی گڑھ یونی ورسٹی سے ان کا گہرا اور اٹوٹ تعلق یاد آتا ہے، پھولوں کے راجا گلاب سے ان کی محبت و محویت یاد آتی ہے، ان کا وہ آفاقی جملہ یاد آتا ہے، جس میں انھوں نے مغلیہ حکومت کی سب سے زیادہ حسین اور عظیم یادگاریں، اردو، تاج محل اور غالب کو قرار دیا ہے۔ یہی وہ یادگاریں ہیں جن سے ہندوستان کی عظمت رفتہ کا احساس و شعور، دنیا کو ہوا اور اس کو بین الاقوامی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی متانت و ظرافت، انسانیت و شرافت، شفقت و محبت یاد آتی ہے کہ خلوت و جلوت میں جہاں کہیں بھی ہوتے، اپنی پرکشش باتوں سے دلوں کو موہ لیتے۔ ان کی "گل افشانی گفتار" سے ہر ایک محظوظ و مسرور ہو جاتا۔

رشید صاحب کی زبان کی لطافت، اور بیان کی شگفتگی سے میں متاثر، بہت پہلے ہو چکا تھا، ان کی سیرت و شخصیت کے متعلق محمد سمیع صدیقی صاحب اکثر تذکرہ کرتے لیکن ان سے ملاقات کرنے کا شرف، غالباً سنہ ۵۱ء میں پہلی بار مجھے حاصل ہوا۔ جامعہ اردو کی باگ ڈور جب سید ظہیر الدین علوی صاحب کے سپرد کی گئی تو مرحوم نے اس کی بقا، ترقی اور توسیع کے لیے جد و جہد شروع کی، نہ معلوم کس طرح وہ میرے نام اور پتہ سے واقف ہوئے، انھوں نے جامعہ اردو سے تعاون کرنے کا خط لکھا، اور میں نے ہر ممکن خدمت کرنے کا یقین دلا دیا۔ اسی سلسلے میں، مرحوم نے مجھے علی گڑھ بلایا۔ اس وقت جامعہ اردو کا دفتر یونی ورسٹی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ دفتر میں صرف ایک پارٹ ٹائم کلرک تھے باقی سارا کام علوی صاحب ہی انجام دیتے تھے، میں ان کی اَن تھک محنت اور لگن سے بے حد متاثر ہوا انھیں کے ساتھ رشید احمد صدیقی صاحب نائب شیخ الجامعہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کم سخنی اور کم آمیزی میری فطرت یا کمزوری ہے۔ رشید ملے تو بڑے تپاک سے، مگر گفتگو بہت مختصر رہی، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ رشید صاحب بھی خاموش طبع ہیں۔ اور بات چیت بہت کم کرتے ہیں۔ علوی صاحب مسلسل بولتے رہے۔ اس کے بعد، مجھے جامعہ اردو کی کمیٹیوں میں ممبر کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔ سال میں دو یا تین مرتبہ ان کمیٹیوں میں سے کسی نہ کسی کمیٹی کی میٹنگ ہوتی اور مجھے شرکت کرنی پڑتی۔ رشید صاحب سے کسی نہ کسی میٹنگ میں ضرور ملاقات ہوتی۔ دو چار مرتبہ ملنے کے بعد، رشید صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کا

اندازہ تھا۔ وہ بہت سادہ مزاج اور سادگی پسند تھے۔ simple living & high thinking کا نمونہ تھے۔ لیکن ذہانت و فطانت اور فہم و دانش میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اپنی ظرافت و شرافت، اپنی فقرہ بازی اور حاضر دماغی سے مشکل سے مشکل مسئلہ کو آسان بنا دیتے تھے۔ ایک میٹنگ میں، علوی صاحب نے یہ معاملہ رکھا کہ کشمیر میں جامعہ اردو کی جعلی سندیں شائع کر لی گئی ہیں اور معقول معاوضہ کے ساتھ انھیں فروخت کیا جا رہا ہے، ہر امتحان کی ایک ایک سند بھی علوی صاحب نے پیش کی۔ رشید صاحب ان کو بغور دیکھتے رہے اس کے بعد ڈاکٹر علیم صاحب کو دے دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ان پر دستخط تو جناب کے ہی ہیں آپ ان کو کیسے جعلی ثابت کر سکتے ہیں؟ رشید صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا مجھے کب انکار ہے کہ یہ میرے دستخط نہیں ہیں۔ ہاں، میں نے خود سے نہیں کیے ہیں۔ یہ تو دستخط کرنے والے کا کمال ہے کہ اس نے رشید احمد صدیقی کی بجنسہ نقل کر دی۔ اس کو تو انعام دینا چاہیے۔ ایسے آدمی بڑے کام کے ہوتے ہیں۔ اس پُر لطف تبصرہ کے بعد طے ہوا کہ قانونی کارروائی کی جائے۔ اس قسم کے نہ جانے کتنے مسئلے نصابی، امتحانی اور تاریخ کمیٹی میں آتے اور رشید صاحب انھیں ہنستے ہنساتے حل کر دیتے۔

رشید صاحب کو علی گڑھ یونیورسٹی سے جو گہرا ربط اور تعلق تھا وہ کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ ان کا دل و دماغ، جسم و جان، سب علی گڑھ کے لیے وقف ہو گیا تھا شاید ہی کوئی ایسا مضمون یا خطبہ ہوگا جس میں کسی نہ کسی نہج سے علی گڑھ یونیورسٹی کی تعلیمی اور تہذیبی قدروں کا ذکر نہ ہو۔ وہ علی گڑھ کو ملک و ملت کی آبرو سمجھتے تھے، اور اس کو ایک 'مردِ خدا' (سرسید) کا ایسا کارنامہ سمجھتے تھے، جو 'رنگِ ثبات و دوام' رکھتا ہے۔ جب مسلم یونیورسٹی کے خلاف مسلسل اور منظم محاذ قائم کرنے کی کوشش کی جانے لگی، اس کے اقلیتی کردار کو تبدیل کرنے کے مشورے ہونے لگے اور ملت کی اس متاعِ عزیز کی بنیادی خصوصیات اور تعلیمی و تہذیبی قدروں کو ختم کرنے کے منصوبے بنائے جانے لگے، تو رشید احمد صدیقی، کے دل پر کیا بیتی؟ اس کا پُرسوز اظہار، ان کے مکاتیب میں [illegible] علی گڑھ کی بشارتوں نے ان کو اور بھی مایوس کر دیا تھا اس بیچ میں انھیں کوئی ایسا لفظ یا بشارت کہیں سے سنائی نہیں دی تھی۔ اس کا ردِ عمل رشید صاحب پر سخت، شدید اور مایوس کن ہوا۔ [illegible] جو انھیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھا اب ان کے لیے وبالِ جان بن گیا اور وہ "ایسی اجنبی جگہ" جہاں کوئی نہ ہو کی تمنا کرنے لگے۔ "طبیعت میں پراگندگی اور انتشار" کی انتہا ہو گئی، "نہ گھر میں جی لگتا ہے نہ باہر" کبھی وطن جانے کا قصد کرتے ہیں تو "وحشت کو دیکھ کے گھر یاد آ جاتا ہے" رشید

صاحب کا کرب و اضطراب، اس وقت اور زیادہ ہو جاتا ہے جب یونی ورسٹی بل کے سلسلے میں علی گڑھ رستخیز بے جا کا شکار ہو کر کرفیو کی زد میں آجاتا ہے۔ پروفیسر مسعود خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"شام ہوتے ہی کرفیو بھی نافذ ہو گیا۔ ادھر یونی ورسٹی بل کے سلسلہ میں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے اس کی بقول آپ کے دھمک اب شروع ہوئی ہے لیکن بھنک بہت پہلے سے مل رہی تھی، اب دھماکے کا انتظار ہے۔ زلزلے کے یہی لوازم ہیں۔"

آگے چل کر کس سوز کے ساتھ اپنے عزم کا اظہار کر رہے ہیں۔

"مسعود صاحب! ایک بات کہتا رہا ہوں اور کہتا رہوں گا کہ ہم جس متاع کو عزیز رکھتے ہیں یا ہم کو رکھنا چاہیے اس کی وکالت، حمایت اور حفاظت سے باز نہیں آسکتے فرد کا یہی مقام ہے۔ یہی فرد، مرد مومن کہلاتا ہے۔ یہ لڑائی حق کے لیے لڑی جاتی ہے ہارنے جیتنے کے لیے نہیں اس لیے اس کا انجام یا انعام، شہادت یا سعادت ہوتا ہے۔ جس کے لیے زندہ ہیں اور رہنا چاہتے ہیں اس کے لیے مرنے میں کیا حرج ہے؟"

رشید صاحب کو اردو سے بھی اتنا پیار تھا، جتنا علی گڑھ سے۔ اردو کی مخالفت کا طوفان لسانی عصبیت نے اس زور کے ساتھ اٹھایا کہ اردو دنیا تلملا اٹھی، رشید صاحب نے قلمی جہاد شروع کر دیا اور طنز کے تیر اس انداز سے چلاتے ہیں کہ اردو دشمن بھی زخم خوردہ ہونے کے باوجود لطف اندوز ہوتے رہے۔ اسی طرح اردو رسم الخط پر ان کی رائے یہ تھی کہ اس کو ہرگز نہ بدلا جائے، ان کے خیال میں،

"اگر مجھے اردو شعر و ادب کا مطالعہ اردو خط کے بجائے کسی اور رسم خط میں کرنا پڑے تو میرا ذوق، میری عافیت اور میری بینائی تھوڑی دیر کے لیے جواب دے جائیں گے۔"

رشید صاحب کی کن کن باتوں کا ذکر کیا جائے؟ ان سے ملنے، ان کی تحریریں پڑھنے کے بعد یادوں اور تاثرات کی کوئی حد نہیں رہتی۔ میں نے یہ چند تاثرات، ان کی اور ان کے چاہنے والوں کی نذر کر دیے، اُن کے اُٹھ جانے کے بعد بھی کئی مرتبہ علی گڑھ جانا ہوا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ علی گڑھ کے در و دیوار اب بھی اپنے اس فرزند رشید کے غم میں سوگوار ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ،

رفتید و لے نہ از دلِ ما

مجروح سلطان پوری

رشید صاحب!

بمبئی
۱۱ر دسمبر ۱۹۸۱ء

برادر عزیز محمود الٰہی صاحب!

رشید صاحب کے ساتھ جب ہمارے جغادری قسم کے نقاد حضرات تک کبھی کبھی انصاف نہیں کر پاتے تو میں، جو نہ نقاد ہوں نہ مضمون نگار، کہاں تک ان کی قدر آور شخصیت کا سراپا تاثرات کی شکل میں پیش کر سکوں گا۔ ہمارے نقاد تو ایک ہی سانس میں رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کا نام اس طرح لیتے ہیں جیسے کوئی غالب اور داغ کا نام ایک ساتھ ایک ہی اثر تیہ کے اظہار کے طور پر لے۔ خیر یہ تو اہل نقد و نظر کا معاملہ ہے، میں ناحق اس میں اپنا قلم پھنسا رہا ہوں۔ پھر بھی مجھے اپنے طور پر تو کچھ کہنا ہی ہے۔

شیخ سعدی کے بعد، (اردو میں) غالب اور ان کے بعد رشید صاحب ایسے صاحب طرز ہیں جن کے کتنے ہی جملے مصرعوں کی طرح یوں مشہور ہیں کہ لوگ انھیں تحریر و تقریر میں اپنی تائید کے طور پر دہراتے ہیں۔ طنز و مزاح کے ذریعے زندگی کے لیے نقاد نظر اور صحیفۂ اخلاق مرتب کرنے کا ہنر جنھیں آتا ہے، ان ناموں میں رشید صاحب کا نام مشرقی زبانوں کی حد تک بیسویں صدی میں شاید پہلا ہو۔

بھائی، یہ موضوع جس پر ایک کتاب سے کم میں گفتگو ممکن نہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ چند تاثراتی اور طائرانہ قسم کے فقرے کیا کر سکیں گے۔ وہ ایک ایسے ادیب و فلسفی تھے جو عام طور پر طنز و مزاح کی زبان میں گفتگو کرتے تھے مگر طنز و مزاح ان کے لیے طغرائے امتیاز نہیں تھا، وہ اس سے بہت بلند تھے۔ ان کا ایک ہی جملہ جو انھوں نے ایک خط میں (جو میرے نام نہیں تھا) لکھا تھا، میرے خیال میں ان کے جینیس کا

اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے ـــ "مردِ مومن کا مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے" یہ جملہ کتنی سرحدوں کو توڑ کر انسانیت اور اس کی اعلیٰ اقدار کو سینے سے لگاتا ہے، ایسے اہلِ نظر سمجھیں گے۔ تنگ نظر اس جملے سے خاصا پریشان ہو سکتا ہے۔ ہونے دیجیے، اس بے چارے کا تو کام ہی یہی ہے۔

مجھ سے ایک بار انتقال سے تقریباً ۶، ۷ ماہ قبل ایک خط میں فرماتے ہیں:

"ایک فرمائش کی تعمیل کیجیے، اقبال کی کسی اردو غزل کو سامنے رکھ کر ایک غزل لکھ کر بھیجیے، چاہے اس طریقِ فکر کو آپ پسند کرتے ہوں یا نہیں، فرمائش تعمیل کے لیے ہوتی ہے، پسند ناپسند کو نہیں دیکھتی۔"

چنانچہ حسبِ تعمیل حکم اقبال کی غزل:

"پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن ـــ کو سامنے رکھ کر وہ غزل کہی جو ابھی کچھ ہی دنوں پہلے "نیا دور" لکھنؤ میں شائع ہوئی تھی۔ مطلع کا پہلا مصرع تھا: "داغ سے مہکی ہوئی زخموں سے لالہ پیرہن"۔ اگر یہ غزل سامنے ہو تو اب ان کی رائے دیکھیے:

"غزل بہت اچھی ہے اس اعتبار سے اور کہ اس میں نہ اقبال کی پیروی ہے نہ حافظ و غالب کی تقلید مگر احترام تینوں کا ملتا ہے۔"

ان جملوں پر میں ان کی نقادانہ صاحب نظری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا جبکہ غزل کہتے وقت اور کہہ چکنے کے بعد بھی میری نظر اپنے اشعار کے ان روایاتی رشتوں پر نہیں تھی۔

میری یادداشت بہت ہی ماشاء اللہ قسم کی ہے ورنہ ان کی عالمانہ باتوں سے جو صرف میرے سامنے ہوئیں، صفحے بھرے جا سکتے تھے۔

رشید صاحب نے نماز زندگی میں کم ہی پڑھی ہو گی مگر نمازی کا احترام کرتے تھے۔ انتقال کے وقت بستر پر لیٹے لیٹے کہا، مجھے اٹھاؤ۔ پھر کہا اب اس ہیئت میں

لاکر میرے سر کو بستر پر جھکا کر رکھ دو جیسے سجدہ کرتے ہیں۔ اللہ کا لفظ ادا ہوا اور پھر —
باقی رہے نام اللہ کا!

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

خاک پائے رشید
مجروح

؎ نیا دور لکھنؤ کے ستمبر ۱۹۸۱ء کے شمارے میں یہ غزل شائع ہوئی تھی۔ غزل یہ ہے:

داغ سے مہکی ہوئی زخموں سے لالہ پیرہن — کس قدر ملتی ہے شاخ دار سے شاخِ چمن
فرشِ گل، مینائے مے، شمعِ سحر، سازِ سخن — سب اٹھے لیکن نہ اٹھا میں خرابِ انجمن
مژدہ اے یارانِ تشنہ دل سے پھوٹا پھر لہو — اے شبِ تار عزیزاں پھر جلا داغِ کہن
ساز میں یہ شورشِ غم لائے مطرب کس طرح — اس کی دھن پابندِ نے، نغمہ ہمارا نے شکن
دیکھیے کب تک بلائے جاں رہے اک حرفِ شوق — دل حریصِ گفتگو اور چشمِ خوباں کم سخن

سچ تو ہے مجروح نے اس دل سے کچھ پیماں لیے
بے خبر لیکن کہاں سے لے اڑا مرغِ چمن

(ادارہ)

سلمیٰ صدیقی

ابّا میاں

جنوری ۱۹۷۷ء سے اب تک جانے کتنی بار ارادہ کیا کہ ابا میاں (پروفیسر رشید احمد صدیقی) کے بارے میں کچھ لکھوں۔ لیکن لکھنے کی نوبت اب تک نہیں آئی۔ شاید اس لیے کہ سوچنے کی رفتار، لکھنے کی رفتار سے مات کھا جاتی ہے۔ اپنے بچپن سے اب تک کی زندگی پر ابا میاں کا وجود جاری و ساری ہے۔ کیا سوچوں اور کیا لکھوں اور کہاں سے شروع کروں۔ میں نے جان بوجھ کے "شخصیت" کا ذکر نہیں کیا ہے کہ ابا میاں کی شخصیت کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ بظاہر ایک گوشہ نشین، درویش صفت اور عزت پسند انسان کے بارے میں لکھنا کتنا آسان ہوتا اگر وہ ابا میاں کی ذات نہ ہوتی۔

اپنے وسیع و کشادہ گھر کے ایک کمرے میں انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر زمانہ گزارا اور باہر کی دنیا سے کٹ کے دنیا کے جدید ترین فلسفوں، جدید ترین ادب اور جدید ترین فیشن سے ایسی واقفیت رکھتے تھے کہ بسا اوقات ان کی تفصیلی گفتگو جو کسی بھی موضوع پر ہو سکتی تھی حیرت کا باعث ہوتی تھی۔ صرف علی گڑھ اور ندوہ ہی کے نوجوان طلبا کی ذہنی کیفیت یا ذہنی رجحانات ہی کو وہ کھلی کتاب کی طرح نہیں پڑھتے تھے بلکہ یورپ اور امریکہ کے طرح طرح کے ادبی، مذہبی، سیاسی اور سماجی مسائل اور "ہلچل" کے بارے میں ایسی قطعیت سے بات کرتے تھے کہ عقل چکرا جاتی تھی اور میں ان سے پوچھتی کہ آخر آپ کو "ہپی ازم" کے بارے میں کیسے یہ معلومات ہیں یا "ہرے راما ہرے کرشنا" کے نوجوان سادھو، گرو اور سوامی کو آپ نے کہاں دیکھا یا یورپ اور امریکہ کے نائٹ کلب پب اور ڈسکو تھک کے اسرار و رموز آپ نے کیسے جانے، ٹیلی ویژن کے پروگرام کے بارے میں آپ کی تجاویز اچنبھے میں ہیں کہ

آپ نے آج تک ٹیلی ویژن دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ یہ باتیں اور ایسی باتیں سنتے تو مسکرا دیتے تھے۔ ان کے مسکرانے کی متعدد سطحیں تھیں اور ان سطحوں تک پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ بہت ساری باتیں تو ان کی مسکراہٹ ہی حل کر دیتی تھی اور بہت سارے فیصلے ان کی ایک مسکراہٹ رد کر دیتی تھی۔ ان کو قریب سے جاننے والوں کے سوا ان "مسکراہٹوں" کی اونچ نیچ کو کوئی اور سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک بار وفات سے چند ماہ قبل جب میں ان سے آخری بار ملی تھی تو میں نے ان سے یہ بات خاص طور پر پوچھی تھی کہ آپ فلم اور ٹیلی ویژن کے بارے میں صرف پڑھ کے اتنا نہیں جان سکتے، آخر وہ کون سا ذریعہ ہے جو آپ کو ایسی ٹکنیکل باتیں سمجھاتا ہے۔ کچھ دیر چپ رہ کر بولے "بھئی آج کل میں زیادہ تر وقت ٹیلی ویژن ہی دیکھتا رہتا ہوں۔" میں تھوڑی سی چونکی تو بولے "ہاں تمہارا خیال صحیح ہے وہ ٹیلی ویژن تو نہیں ہوتا ہے میرے سامنے جو سب لوگ دیکھتے ہیں۔ لیکن میرے سامنے گذشتہ ستر پچھتر سال کی تصویریں جس طرح آتی رہتی ہیں اس کا صرف میرا اپنا ہی Brand کا ٹیلی ویژن متحمل ہو سکتا ہے۔ اپنے بچپن کا گھر کیسا خوبصورت اور صاف شفاف نظر آتا ہے۔ اسکول سامنے ہوتا ہے۔ اسکول کے ساتھی بھی نظر آتے ہیں اور سب سے خوبصورت اور مشفق چہرہ اپنی والدہ کا نظر آتا ہے جب وہ میرے انتظار میں ڈیوڑھی پر آ کے کھڑی ہو جاتی تھیں ...... پھر طالب علمی کا زمانہ، علی گڑھ کے سب دوست جن میں سے بیشتر آگے جا چکے ہیں... اس کے بعد وہ باتیں اور صورتیں جو صرف نوجوانی ہی کے زمانے کی تھیں۔ پھر تمہاری ماں کی آمد ــــ تم سب کی پیدائش، تم سب کا بچپن ...... اور تم سب کا ایک ایک کر کے دور ہوتے جانا اور گھر کے سناٹے میں اضافہ اور تنہائی کا زہر ــــ سب کچھ تو میں اس ٹیلی ویژن پر دیکھتا رہتا ہوں جو کسی کو نظر نہیں آتا ہے... اسے کبھی بند بھی نہیں کرتا ہوں کہ مرے بند کئے یہ بند بھی نہ ہوگا...... : ہاں ...... وہ وقت بھی دور نہیں جب کبھی ٹیلی ویژن کی فلم ہی نہیں اس کو دیکھنے والے پر بھی پردہ ڈال دیا جائے گا ــــ ہر ایک کھیل کے اختتام پر ایسا ہی ہوتا ہے" اور ۱۵ جنوری سنہ ۱۹۷۷ء کو اس انوکھے ٹیلی ویژن کا آخری پروگرام ختم ہوا اور بجھ کر گیا

ریحانہ حیدر ترجمہ: صابر گودڑ، مارشیس

رشید صاحب سے ایک ملاقات

جب میں نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کے انتقال کی خبر سنی تو میرا خیال یکایک میری ڈائری کے اس ورق کی طرف گیا جسے میں نے اپریل ۱۹۷۱ء میں علی گڑھ میں رشید صاحب سے ملنے کے بعد دہلی میں بیٹھ کر لکھا تھا۔

دہلی کے شور و ہنگامے اور تگ و دو میں ذہنی سکون بہت کم ملتا ہے۔ ہم لوگ یہاں خاصے تھکے ہوئے تھے اور ہمیں یہاں آرام قطعی میسر نہیں تھا اس لیے امی اور میں نے ۹ر اپریل ۱۹۷۱ء کو علی گڑھ میں ایک روز قیام کا قصد کیا۔ ہماری گاڑی جوں جوں شہر سے دور بھاگتی جا رہی تھی ہمیں ایک غیر معمولی دماغی سکون کا احساس ہو رہا تھا وہ دن واقعی بہت اچھا تھا نہ سردی کا زیادہ تھی اور نہ گرمی معلوم ہو رہی تھی۔ خاص طور پر ہمیں دوبارہ علی گڑھ دیکھنے اور پروفیسر رشید احمد صدیقی سے ملنے کی بے تابی تھی۔ راستے بھر میں نے خالہ جان، بیگم ظفر الاسلام، روبینا، اور سلیم جو ہمارے ساتھ تھے ان لوگوں نے خوب باتیں کیں۔ باتوں کا سلسلہ ابھی ختم نہ ہونے پایا کہ ہم اپنی منزلِ مقصود یعنی علی گڑھ پہنچ چکے تھے۔

جب ہم علی گڑھ یونیورسٹی کے حدود میں پہنچے تو ماحول میں ہم نے ایک زبردست تبدیلی پائی۔ پرسکون، عطر بیز اور پرلطف راستے بالکل خاموش، نہ گاڑیوں کا شور و غل نہ

ریحانہ حیدر صاحبہ ہندوستان میں پاکستان کے سابق سفیر سجاد حیدر صاحب کی بیٹی ہیں۔ انھوں نے انگریزی میں یہ مضمون لکھا تھا اور اس کا ترجمہ جناب صابر گودڑ (مارشیس) نے اس وقت کیا تھا جب وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طالب علم تھے۔ یہ غیر مطبوعہ مضمون ڈاکٹر اصغر عباس صاحب شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے توسط سے آیا ہے جس کے لیے ادارہ ان کا اور ان کے توسط سے مضمون نگار اور مترجم کا شکرگزار

لوگوں کا جم غفیر۔ کیمپس بہت بڑا نہیں لیکن صاف ستھرا، گندگی سے پاک سڑکیں، خوبصورت اور شاندار عمارتیں اور کھلتے ہوئے پھول ہر طرف نظر آئے۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے ہم یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس تقریباً دوپہر کو پہنچے۔ تھکاوٹ کا احساس ہم کو ذرا بھی نہیں تھا کھانے کے بعد ہم نے یونیورسٹی کا ایک طواف کیا۔ اور دلکش مناظر اور مسجد کے جمال و جلال کا نظارہ کرتے ہوئے، اور خوبصورت قطار اندر قطار درختوں سے گزرتے ہوئے ہم رشید صاحب کے یہاں پہنچے۔

رشید صاحب کے گھر میں داخل ہوئے تو ایک عجیب و غریب کیفیت سے دوچار ہوئے۔ وہ محبت و خلوص وہ پرلطف ماحول بھلا کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔ جیوں ہی ہم گھر کے اندر داخل ہوئے ہمیں گلاب سے بھرا ہوا ایک باغ ملا جس کے کنارے پر مالی بیٹھا ہوا بیگم رشید احمد صدیقی کے لیے پھولوں کے گجرے تیار کر رہا تھا مالی نے ہمارا خیر مقدم کیا اور باغ میں ایک گوشے کی طرف جہاں چند کرسیاں تھیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں کے بعد پروفیسر رشید احمد صدیقی اور ان کی بیگم صاحبہ آگئیں۔ ان لوگوں سے مل کر واقعی ایک عجیب تجربے سے دوچار ہوئی۔ امی جان رشید صاحب کی تحریروں کی شیدائی ہیں انھیں ابھی تک اپنے کالج کی دلچسپ باتیں یاد ہیں وہ بتاتی ہیں کہ انٹرنس کے امتحان کے بعد ان کے بھائی جان نے انھیں کتابوں کا ایک بھاری بھرکم پارسل بھیجا تو اس میں "مضامین رشید" کی بھی ایک جلد تھی جسے امی جان اردو ادب کی الہامی کتاب سمجھتی تھیں۔

باغ میں بیٹھے باتوں کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا تھا ہم علی گڑھ کے متعلق کافی دیر تک باتیں کرتے رہے کہ کس طرح ایک مرد مومن نے ایک صدی قبل نامساعد حالات میں اس ادارہ کی بنیاد رکھی تھی جس نے آنے والے زمانے میں جدید ہندوستان کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ میری دادی اماں نے ہمیں یہاں بتایا کہ جب وہ چھوٹی تھیں۔ تو دہرہ دون جانے کے لیے سہارن پور میں ٹرین بدل رہی تھیں۔ پلیٹ فارم پر ایک نورانی صورت فرشتہ صفت بزرگ سفید داڑھی اور ترکی ٹوپی پہنے ہوئے بیٹھے تھے دادی اماں کے ابا جان نے جوں ہی انھیں دیکھا ان سے مردانہ ملنے کے لیے دوڑے۔ دادی اماں سے

جب اپنے ابو سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ سرسید احمد خاں ہیں۔

دادی اماں اپنی پٹاری میں ہمیشہ سرسید کی تصویر رکھتی تھیں جیسے وہ اپنا سرمایہ حیات سمجھتی تھیں۔ ہم یہاں گزشتہ سال بھی سعید ماموں کے ساتھ آ چکے ہیں جنھوں نے ہمیں لائبریری، لکچر روم، ہاسٹل اور وہ کمرہ بھی دکھایا تھا جہاں وہ رہتے تھے۔ وہ کرکٹ ٹیم کے کپتان تھے ان کے ساتھ ہم نے رشید صاحب سے ملاقات کی تھی وہ ان کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ وہ رشید صاحب سے اس طرح ملے جیسے وہ اب بھی ایک طالب علم ہوں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ادبی کارناموں کو دیکھیں تو اس میں طنز و مزاح کی اہمیت دیکھی ہوگی۔ ان کا مسحور کن قلم ہمیں ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتا ہے جہاں ہم یہ کہنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں: "دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا......" میں رشید صاحب کی باتوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ شفقت بھی تھی اور حوصلہ افزائی بھی۔ مجھے اگر ان کی باتوں گھنٹوں سننے کو ملیں تب بھی مجھے بوریت محسوس نہ ہو۔ رشید صاحب کی بیگم صاحبہ کے اخلاق و اطوار نے بھی ہمیں بہت متاثر کیا وہ ایک نیک دل اور ملنسار خاتون ہیں ان کی خوبصورت چمکیلی آنکھیں چغتائی کی یاد دلاتی ہیں۔ ہم رشید صاحب کے یہاں پانچ بجے پہنچے تھے اور اب رات کے نو بج رہے تھے۔ رشید صاحب نے ہمیں اپنا آٹوگراف بھی دیا۔ اپنے دستخط کے ساتھ انھوں نے جو جملے لکھے تھے اس میں اسلام کی سادگی اور کشادگی اور فراخدلی پر زور دیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ جس طرح ہماری مسجدیں بلند اور کشادہ اور عظمت کی حامل ہیں اسی طرح مسلمانوں کا دل بھی کشادہ ہونا چاہیے۔ اقبال کے متعلق بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وہ ایک آفاقی شاعر ہیں اور ان کی شاعری کسی ایک فرقہ کے لیے مخصوص نہیں۔ اقبال نے اردو زبان کو نئی زندگی بخشی ہے۔ باتوں باتوں میں رشید صاحب نے میری تعلیم کے سلسلے میں دریافت کیا اور جب اردو کا ذکر چھڑ گیا تو انھوں نے امی جان سے کہا کہ انسان کے اندازِ گفتگو کو دو طریقے سے پرکھا جا سکتا ہے جب وہ خوش ہو یا جب وہ ناراض ہو۔ انھوں نے مجھے اقبال کے مطالعہ کا مشورہ دیا اسی وقت سے مجھے اقبال سے دل چسپی پیدا ہوئی۔ رشید صاحب کے بغیر علی گڑھ کا تصور میرے لیے ممکن نہیں، دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

پروفیسر محمود الٰہی

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

یہ صحیح ہے کہ رشید احمد صدیقی صاحب طرز انشاپرداز تھے ایسے صاحب طرز کہ جن کی نثر کا ہر لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم ہوتا ہے یہ بھی صحیح ہے کہ وہ ان مسلمان دانش وروں میں تھے جنھوں نے سیکولرازم کے آئینے میں علی گڑھ کی اصل تصویر دیکھی اور دکھائی یا علی گڑھ کے سیاق و سباق میں انھوں نے سیکولرازم کو آئینہ دکھایا ان کی شخصیت کا ایک روپ اور بھی ہے اور وہ روپ ایسا ہے جس کا وجود شاذ و نادر ہی اساتذہ اردو سے مل جاتا ہے رشید صاحب پیشے کے لحاظ سے اردو کے استاد تھے اور اس پیشے کو بغض و کینہ کی لاگ اور تر دامنی سے انھوں نے جس طرح دور رکھا اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ان کے دور معلمی کو ایک صحیفۂ اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے جس پر ہمیشہ اور ہر حال میں انھوں نے حرف بحرف عمل کیا اگر اس عمل کا عشر عشیر بھی دوسرے اساتذہ میں آجاتا تو آج اس پیشے میں کشاکش و کشمکش کی جو تنگ ظرفی راہ پا گئی ہے وہ ایک موضوع سخن کی حیثیت سے عام نہ ہوتی!! ان کا ذہن نہ تو درباری تھا اور نہ دریوزہ گرانہ ورنہ علی گڑھ میں اور اس کے باہر وہ کیا کچھ نہیں ہو سکتے تھے لیکن وہ جو کچھ ہوئے وہ درباریوں اور دریوزہ گروں کو کہاں نصیب!

رشید صاحب مناصب و منازل کی کسی دوڑ میں شریک نہیں ہوئے انھوں نے یہ تو کیا کہ وہ جس راستے پر گامزن ہوتے اگر کوئی دوسرا اسی راستے پر آ جاتا اور ان سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتا تو وہ خود بیٹھ جاتے اور اسے آگے نکل جانے دیتے لیکن

انھوں نے کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں دیا کہ اردو والوں کی دوڑ کا تماشا ہم دیکھ کر آئے ہیں۔ رشید صاحب ۱۵ اپریل ۱۹۵۵ء کو جس آبرومندی اور سربلندی کے ساتھ ریٹائر ہوئے تھے وہ گویا اساتذۂ اردو کے صحیفۂ اخلاق کا حرف آخر تھا۔

ایک طرف مجلس انتظامیہ کے اراکین انھیں ملازمت میں توسیع دینے کے درپے تھے بس ان کے ایک اشارے کی ضرورت تھی تو دوسری طرف رشید صاحب کا موقف واضح تھا کہ وہ ایسی توسیع نہیں چاہتے جو صاعقہ و شعلہ و سیماب کے عالم سے گزری ہو۔ رشید صاحب نے کبھی نہ تو دوسرے درجے کی بات سوچی نہ کی اور نہ لکھی۔ ان کا فن کیا تھا اس کے تجربے کے لیے کسی دوسرے درجے کا قلم کارآمد نہیں ہو سکتا شاید یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد جب ملک میں ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر انعام و اکرام کا سلسلہ شروع ہوا تو رشید صاحب کا نام کسی فہرست میں نظر نہیں آیا وہ تو یہ کہئے کہ اترپردیش اردو اکادمی اور ساہتیہ اکادمی نے ان کی عمر کے آخری دور میں اردو والوں کی لاج رکھ لی ورنہ رشید صاحب کے ساتھ جو بھی ناانصافیاں روا رکھی گئی تھیں وہ ہمارے دانشوری کا گریباں چاک کرنے کے لیے کافی تھیں۔

یہ کون نہیں جانتا کہ فن کار کی ہر تخلیق میں اس کا باطن منعکس رہتا ہے لیکن خطوط اور وہ بھی نجی خطوط میں تو ظواہر کا گزر بھی نہیں ہوتا مکتوب نگار کا کردار افسانے کا نہیں، ناول کا کردار ہوتا ہے جو زندگی کے ہر سرد و گرم کو محیط رہتا ہے خطوط سے شخصیت کی گرہیں کھلتی ہیں اور رشید صاحب کی بے ہمہ اور باہمہ شخصیت اسی پر آئینہ ہو سکتی ہے جس نے ہر حال میں انھیں دیکھا ہو لیکن ایسا موقع انھوں نے دیا کب کسی کو۔ وہ گفتگو تک میں محتاط رہتے تھے اسی لیے ان کے جذبات میں جو تموج تھا اور ان کے افکار میں جو بے پایانی تھی، ان کا حال معلوم کیوں کر ہوتا۔ وہ تو زہر کو پی جاتے تھے اور اس طرح اسے ہضم کر لیتے تھے کہ وہ خون بن کر رگ و پے میں دوڑنے لگتا تھا اور کیا مجال کہ کوئی قطرۂ خوں نوک قلم تک آ جائے ان کا ہر لفظ آغشتہ خوں ہوتا تھا اور اس خون کی زہرناکی کا تجزیہ آسان نہیں اسی لیے ان کی شخصیت کا پیچ و خم خود ان کا طرۂ امتیاز بن گیا تھا خطوط میں رشید صاحب کچھ کھلتے ہوئے نظر آتے ہیں

لیکن ان کا ہر خط ایک بیمیا کی سی نمو د ر کھتا تھا اور یہ کون بتائے کہ کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا؛ وہ جیسے خط لکھتے تھے اس پر یہ قدغن لگاتے تھے کہ یہ خطوط چاک کر دیے جائیں اور انھیں کبھی شائع نہ کیا جائے۔

ایک بار تو انھوں نے اخبارات میں اشاعت کے لیے ایک گشتی مراسلہ مرتب کر لیا تھا جس میں انھوں نے بڑی شدت کے ساتھ اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ میرے خطوط اور نجی تحریریں وغیرہ شائع نہ کی جائیں بلکہ انھیں تلف کر دیا جائے مگر جب رشید صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر احسان رشید سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی نے اس گشتی مراسلے کو اشاعت کے لیے جاری نہیں ہونے دیا تو رشید صاحب نے پروفیسر مسعود حسین خاں کو لکھا۔

• ملفوفہ ٹائپ شدہ عبارت پڑھ کر اپنے پاس رکھ لیجیے اور میرے مرنے کے بعد یا ضرورت ہو تو اس سے پہلے بھی اس کے مطابق عمل درآمد کیجیے گا۔ میں نے اس کو بعض اردو اخبارات میں چھپوانے کا ارادہ کیا تھا لیکن احسان نے بڑی سختی سے اس کی مخالفت کی۔ انھوں نے جو دلائل دیے وہ یقیناً پوچ تھے لیکن کچھ عرصے سے میں نے اپنا دستور العمل بنا رکھا ہے کہ دل پر کتنا ہی جبر کیوں نہ ہو اپنے لڑکوں کی بات مان لوں تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ بڈھا نہ خود مرتا ہے نہ ہم سب کو جینے دیتا ہے میری مشکل یہ ہے کہ مقررہ وقت سے پہلے خودکشی بھی نہیں کر سکتا، پھر کیا کروں یہ لڑکے کم عقل سمجھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ بوڑھے ذی حس نہیں ہوتے بہر حال اس خط کو تلف کر دیجیے گا ٹائپ شدہ ورق (جس میں یہ تحریر ہے کہ میری نجی تحریریں وغیرہ شائع نہ جائیں) رکھ لیجیے گا ممکن ہے آل احمد سرور صاحب اور اس قبیل کے لوگ کبھی میرے خطوط شائع کرنے کا ارادہ کریں اور آپ یہ دستاویز پیش کر سکیں۔

وصیت

رشید صاحب کی شخصیت پر لکھنے والے یہ جانتے تھے کہ ان کے خطوط سے استفادہ کیے بغیر ان کا مقالہ تشنۂ تکمیل رہے گا لیکن وہ رشید صاحب کے حکم یا وصیت سے انحراف کیوں کر کرتے، وہ تو غالب کے الفاظ میں اس کیفیت کے شکار تھے

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجیے
حیا ہے اور یہی گو مگو تو کیوں کر ہو

آخر پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس حصار کو توڑا اور ان کے انتقال کے معاً بعد انھوں نے "مکاتیب رشید احمد صدیقی" کے نام سے وہ خطوط شائع کر دیے جو انھیں لکھے گئے تھے ہر چند رشید صاحب کا ہر جملہ ان کی شخصیت کے مطالعے میں مفید ہوگا اور اس لحاظ سے نظامی صاحب کے نام لکھے گئے خطوط کی بڑی اہمیت ہے لیکن جو خطوط پروفیسر مسعود حسین خاں کو لکھے گئے ہیں ان کی بات ہی کچھ اور ہے مسعود صاحب ان کے صرف شاگرد اور رفیق کار نہیں تھے بلکہ ان کے سب سے بڑے معتمد تھے .... ایسے معتمد جن سے رشید صاحب کھل کر بات کر لیتے تھے اور بات بھی ایسی جس کے کچھ جملے محولہ بالا خط میں موجود ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے مسعود صاحب کے علاوہ ان کے شاگردوں میں کوئی ایسا نہیں ملا جس نے ہر حال میں رشید صاحب کے درد دکھ کو اپنا دکھ درد سمجھا ہو۔ رشید صاحب کی رضا جوئی میں مسعود صاحب کو کیا کیا پاپڑ بیلنا نہیں پڑے مگر اس سعادت مند شاگرد نے کبھی اپنی وفاداری نہیں بدلی۔ رشید صاحب کے رٹائرمنٹ کے بعد میری مراسلت مسعود صاحب سے بعض ایسے امور پر رہی ہے جن میں رشید صاحب کا ذکر ناگزیر تھا۔ اس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ مسعود صاحب کے ہوتے ہی رشید صاحب کو کسی غم کی ضرورت نہیں ہے اور یہی بات یہ ہے کہ رشید صاحب مسعود صاحب کو بمنزلۂ اولاد سمجھتے تھے .... اور یہی وہ پہلو بھی ہے جو کسی کو یہ یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ رشید صاحب کے سارے خطوط شائع ہو جائیں مگر وہ خطوط منصۂ شہود پر نہیں آ سکتے جو مسعود صاحب کو

لکھے گئے تھے لیکن شاید پروفیسر خلیق احمد کی عرض مشتاقانہ مسعود صاحب کی جرأت رندانہ کا محرک بن گئی اور اسی جولائی ۱۹۸۱ء میں انھوں نے "رقعات رشید صدیقی" کے نام سے وہ ۵۰۰ خطوط شائع کر دیئے جو رشید صاحب نے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۷۷ء تک کی مدت میں انھیں لکھے تھے۔

مسعود صاحب نے "رقعات رشید صدیقی" کا دیباچہ اس طرح شروع کیا ہے۔

"رشید صاحب کے "ادب ممنوع" کو بر سر عام لانے کی یہ جرأت رندانہ ان کی ہدایت اور اپنی شرافت کو خطرے میں ڈال کر کی جا رہی ہے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ مسعود صاحب کو کسی معذرت کی ضرورت نہیں تھی۔ کہتے ہیں کہ کچھ امور ایسے ہیں جن کی وصیت شریعت میں قابل اعتنا نہیں اسی طرح شرفائے ادب کسی عظیم فن کار کے پرائیوٹ خطوط کی عدم اشاعت کے بارے میں اس کی وصیت سے انحراف کرتے آئے ہیں کیونکہ یہ خطوط ساری دنیا کی ملکیت بن جاتے ہیں مسعود صاحب نے ان خطوط کی اشاعت سے حق بحق دار رسید والی بات پوری کر دی ہے۔ یہی نہیں۔ خود رشید صاحب نے دوسروں کے بعض پرائیویٹ خطوط کی اشاعت کا برا نہیں مانا تھا۔ جب میں نے لکھا کہ مہدی افادی نے اپنی بیگم کو جو خطوط لکھے تھے وہ مجھے مل گئے ہیں اور میں انھیں شائع کرنا چاہتا ہوں تو انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ خطوط کے مطالعے کے دوران مجھے بعض بڑے نازک مقامات سے گزرنا پڑا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان مقامات سے صرف نظر کروں کہ نہ کروں۔ میں نے رشید صاحب سے مشورہ طلب کیا تو انھوں نے ۳ر جنوری ۱۹۶۳ء کو مجھے لکھا:

"مہدی افادی کے خطوط کی طباعت و اشاعت ضرور کیجئے۔ اب رہا یہ کہ ان کی خانگی زندگی میں کیا نزاکتیں ملتی ہیں اور ان سے کس طرح عہدہ برآ ہوا جائے۔ اس کے بارے میں کیا عرض کروں سوا اس

کہ جہاں نزاکت کا احساس ہو وہاں یا تو قدم نہ رکھیئے یا "سرسری"
گزر جائیے۔ مگر، جہاں تک آپ نے جو باتیں تحریر کی ہیں، وہ کچھ
ایسے دشوار گزار مراحل معلوم نہیں ہوتے تفصیل کے بجائے صرف
اشارہ یا تذکرہ کر دیجیئے اور ایسا کرنا آپ یقیناً جانتے ہیں۔"

شرافت نفس

رقعات رشید صدیقی کے مطالعے سے جو پہلا تاثر قائم ہوتا ہے، وہ وہی ہے ان کی شخصیت کا دوسرا نام ہے یعنی شرافت نفس اور انسان دوستی اس کے صفحات میں بکھری ہوئی ہے۔ جن لوگوں نے رشید صاحب کے صحیفۂ اخلاق کے بارے میں کچھ سن رکھا ہے، وہ اس کتاب کے اوراق سے ان کی توثیق کر سکتے ہیں لیکن اصل توثیق تو ان لوگوں سے ہوگی جنھوں نے رشید صاحب کو دور یا قریب سے دیکھا ہے وہ کیوں جائیے، وہ لوگ تو مجسم توثیق ہیں جنھوں نے رشید صاحب سے "علم و تمیز" سیکھا اور پھر انھیں کو نشانہ بنایا۔

رشید صاحب ۱۹۵۸ء میں ریٹائر ہوئے اور ۱۹۷۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ زندگی کے یہ آخری ۱۹ سال انھوں نے کس پامردی اور حوصلے کے ساتھ گزارے، یہ رقعات اس کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ آمدنی کے ذرائع محدود بلکہ مسدود، جسمانی اور روحانی کرب کا ہجوم بیگانوں کا تو ذکر ہی کیا، اپنوں کی سرد مہری لیکن رشید صاحب کی چال ڈھال، وضع قطع اور افتاد طبع میں کوئی انحطاط نہیں آیا۔ جب وہ علی گڑھ کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو باتیں وہ یونی ورسٹی سے اپنے تعلق کے زمانے میں اجمال کے ساتھ کہتے تھے اب ان کی تفصیل بیان کر رہے ہیں۔ اسی طرح اردو کے بارے میں اپنے موقف پر اصرار کرنا ان کا دوسرا موضوع قلم تھا۔ مسعود صاحب اردو کے استاد ہی نہیں اس کے ادا شناس بھی ہیں اس لیے رشید صاحب نے ان سے اردو کے بارے میں جو گفتگو کی ہے اسے دستاویزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

خوب تر کی تلاش

ان خطوط کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رشید صاحب اپنے خیالات کو سپرد قلم کر لینے کے بعد بھی خوب سے خوب تر کی تلاش میں منہمک رہتے تھے دراصل انھیں الفاظ کے انتخاب کا ملکہ حاصل تھا وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ کوئی دوسرے درجے کی بات ان کے قلم سے نکلے یا سیاق و سباق میں کوئی نقطہ ایسا آ جائے جو دوسرے درجے کا کہا جائے اسی لیے اپنے مضامین میں وہ کاٹ چھانٹ اور کتر بیونت کرتے رہتے تھے۔ اپنی تحریروں کا وہ کس شدت اور غلو کے ساتھ احتساب کرتے تھے اس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے جب ان کی "آشفتہ بیانی میری" کتابت اور طباعت کے مرحلے سے گزر رہی تھی تو انھوں نے میرے سپرد کام کیا تھا کہ میں ان کے لکھے ہوئے اوراق کو اس طرح نقل کر دیا کروں کہ کاتب کو پڑھنے میں کوئی دقت نہ ہو اور اس طرح کتابت و طباعت کی غلطیوں کے امکانات کم سے کم ہو جائیں۔ میں نے پہلے دن جو صفحات نقل کیے اور ان کی منظوری کے لیے پیش کیے تو انھوں نے پڑھنے کے بعد کہا کہ یہ اوراق وہ کل واپس کر دیں گے اب کیا دیکھتا ہوں کہ ان اوراق پر جا بجا چیپیاں لگی ہوئی ہیں میں نے وہ اوراق دوبارہ نقل کیے اور کاتب کے حوالے کر دیے، جب کتابت شدہ کاپیاں آئیں تو رشید صاحب نے کہا کہ وہ ترمیمات کی نشان دہی خود کریں گے۔ دوسرے دن "ہدایت نامہ" موصول ہوا کہ فلاں سطر میں یوں لکھی جائیں اور فلاں پیراگراف یوں کر دیا جائے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ خود رشید صاحب اپنے مسودے پر چیپیوں کی اتنی تہیں لگا دیتے تھے کہ شکل و صورت کے لحاظ سے وہ بے انتہا بے ڈول ہو جاتا تھا اور اس کا مطالعہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں تفحص الفاظ سے جو بحث کی تھی رشید صاحب کے مضامین اس کا عملی نمونہ ہوتے تھے۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ رشید صاحب کے خطوط اس عمل حذف و ترمیم سے عاری رہتے تھے اسی لیے ان خطوط کی اہمیت اور بھی ہے۔ ان سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ فی البدیہہ کیا اور کیوں کر لکھتے تھے میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے خطوط کی عدم اشاعت پر جو زور دیتے رہتے تھے، اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ الفاظ کے انتخاب اور ان کے محل استعمال

سے مطمئن نہیں رہتے تھے اگر رشید صاحب اپنے خطوط پر نظر ثانی کر لیا کرتے تو پھر کوئی خط مکتوب الیہ تک نہ پہنچ پاتا۔

ضبط و تحمل

رشید صاحب کے ضبط و تحمل کا حال کسے نہیں معلوم۔ مالی صعوبتوں کے زمانے میں تو وہ اور بھی لیے دیے رہتے تھے۔ ان کی طبیعت میں فیاضی تھی اور گھر کے اخراجات پر قابو پانا ان کے بس میں نہیں تھا لیکن کیا مجال کہ وہ کسی کی امداد کے خواہاں ہوتے۔ وہ تو حسن طلب کا فن بھی نہیں جانتے تھے ورنہ جس کا دوست ڈاکٹر ذاکر حسین جیسا صدر جمہوریہ ہوا اسے کیا کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ دراصل مصیبتوں کے زمانے میں وہ بھی محتاط ہو جاتے تھے اور کبھی بھی کسی پر یہ نہیں کھل سکتا تھا کہ رشید صاحب مالی معاملات میں کسی سے کم ہیں۔

معلمی ایک مقدس پیشہ ہے اور اس تقدس کو وہ ہر حال میں قائم رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی قناعت پسند طبیعت نے اس پیشے کو تجارت نہیں بنایا۔ اگر انھیں سعی و سفارش کے بغیر ممتحنی مل جاتی تو وہ اسے بطیب خاطر قبول کر لیتے تھے، اسی طرح کتابوں کی رائلٹی کے نام پر اگر انھیں کچھ مل جاتا تو اسے وہ اپنا حق سمجھتے تھے یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی اس حق سے بھی دستبردار ہو جاتے تھے۔ بس یہی ان کی آخری حد تھی وہ نہیں جانتے تھے کہ ستاروں کے آگے بھی کوئی دنیا ہے اور جان کر بھی وہ کیا کر لیتے، وہ تو پر پرواز سے عاری تھے۔

ایک زمانہ ایسا آیا، جب ضعیفی اور علالت کی وجہ سے وہ ممتحنی کا کام بھی نہیں کر سکتے تھے، حسن اتفاق کہ اسی زمانے میں اتر پردیش میں اردو اکادمی قائم ہوئی جس کے اغراض و مقاصد میں یہ بات بھی شامل تھی کہ مصنفین کو علاج معالجے کے لیے مالی امداد دی جائے اور کتابوں پر انعامات دیئے جائیں۔ رشید صاحب سے جو لوگ قریب تھے، انھوں نے سوچا کہ کیا کوئی ایسی صورت نکل سکتی ہے جس سے رشید صاحب استفادہ کر سکیں۔ اس موضوع پر پروفیسر مسعود حسین خاں اور پروفیسر محمد حسن سے میری مراسلت بھی جاری تھی۔

مناسب یہ سمجھا گیا کہ رشید صاحب کو اکاڈمی علاج کی سہولتیں فراہم کرے مگر یہ کس کی ہمت کہ رشید صاحب سے اس امر خاص میں رجوع کرے۔ آخر کار ایک طرف خورشید الاسلام صاحب کی تحریک پر مسعود صاحب نے انھیں لکھا اور دوسری طرف براہ راست میں نے رشید صاحب سے درخواست کی کہ اگر اکاڈمی کوئی پیش کش کرے تو وہ اسے قبول کرلیں۔ اس تحریک کے جواب میں رشید صاحب نے مسعود صاحب کو بھی خط لکھا اور مجھے بھی۔ مجھے رشید صاحب نے جو کچھ لکھا، اس کے اظہار کا یہ موقع نہیں ہے۔ مسعود صاحب کو انھوں نے یہ جواب دیا۔

"آپ ...... صاحب کو فی الفور لکھ دیں کہ مجھے اس رقم سے معاف فرمایا جائے جو علاج معالجے کے لیے مریض اور بیمار مصنفین کو دی جاسکتی ہے بفضلہ میری حالت اتنی زار و نزار نہیں ہے" وغیرہ۔

وہ تو یہ کہیے کہ اس زمانے میں اردو اکاڈمی نے مجموعی خدمات کے اعتراف میں رشید صاحب کو پانچ ہزار روپیہ کی رقم پیش کی ورنہ خدا جانے وہ اردو اکاڈمی کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے۔ رشید صاحب کو انعام و اعتراف خدمات کے باب میں اتنا نظر انداز کیا گیا کہ اگر کوئی واقعی مخلصانہ انداز میں ان کا نام مجموعی والی فہرست میں شامل کرنے کی کوشش کرتا تو وہ اس سے بھی مطمئن نہ ہوتے۔ مسعود صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"اکاڈمی کے انعامات کے سلسلے میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے یا کرایا ہے وہ میرے لیے غیر متوقع نہ تھا۔ آپ نے ہمیشہ ایسا ہی کیا ہے اور کامیاب رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے۔ ۴، ۵ ممبروں میں آپ کو تائید کہاں کہاں سے ملتی ہے۔ "جنوں کو خیال ہے کہ ...... کوشاں ہیں اور آپ نے جن صاحب کو لکھنؤ لکھا ہے ان کا میلان شاید موصوف کی طرف ہے۔ علی گڑھ کے بزرگ کے بارے میں حسن ظن رکھتے ہیں لیکن پس و پیش ہے، ماضی کا

مسلسل تجربہ سامنے ہے۔ کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ ملا صاحب کا رجحان فیض یاب ثابت ہوگا، اس لیے کہ موصوف کا اثر (انجمن کے راستے سے) ...... صاحب پر مسلم ہے۔ آپ سے کبھی ملا صاحب کی ملاقات ہوتی ہے؟

رشید صاحب کا یہ اجمال بڑی تفصیل کا محتاج ہے اور میں اس وقت اپنے کو اس لائق نہیں پاتا کہ تفصیل بیان کروں، میں صرف اتنا کہوں گا کہ رشید صاحب کی خدمات کا اعتراف جب اردو اکاڈمی نے کیا تھا تو کسی اختلاف کا کیا سوال، ان کے مقابلے میں کوئی نام بھی پیش نہیں ہوا تھا۔

"رقعات رشید" سے اسی طرح کی بعض حیرت انگیز باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ رشید صاحب کے سارے خطوط منظر عام پر آجائیں۔ رشید صاحب نے ۱۹۵۵ء تک جو خطوط پروفیسر آل احمد سرور کو لکھے تھے وہ نوادر کی چیز ثابت ہوگی۔ اسی طرح پروفیسر محمد حسن کے پاس ابھی ان کے بہت سے خطوط و رقعات ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ پروفیسر محمد حسن نے ان کے "ملفوظات" بھی محفوظ کر لیے تھے۔ رشید صاحب خطوط کے باب میں "بسیار نویس" تھے اور مجھے یہ یقین ہے کہ انھوں نے جو خطوط لکھے تھے، ان میں سے اکثر مکتوب الیہم کے پاس محفوظ ہوں گے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان کے خطوط کو شائع کر کے انھیں واقعی محفوظ کر لیا جائے۔ اب ایسے خطوط لکھنے والے کہاں ملیں گے۔

رشید احمد صدیقی کے چند غیر مطبوعہ خطوط

(۱) رشید حسن خاں کے نام!

ذکاء اللہ روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

بدھ، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء

خان صاحب مکرم۔ سلام شوق

آپ کی بھیجی ہوئی دونوں کتابیں گلزار نسیم اور باغ و بہار ملیں پہلی حال ہی میں، دوسری اس سے بہت پہلے۔

بہت دنوں سے "کشاکش غم پنہاں" میں مبتلا رہتا تھا، ان سے فرصت تو کیا ملتی، کچھ دنوں سے اس میں "غم پیدا" بھی شامل ہو گیا اور کیسا غم پیدا! مگر شاید انگریز قوم ہی نے ایسے موقع کے لیے کہا ہے، "یہ سب کھیل ہی کا جزو ہے"، کھیل ڈالو، کیا قوم ہے یہ بھی!!

گلزار نسیم اور باغ و بہار کو اپنی توجہ و تحقیق کا مرکز بنا کر آپ نے مجھ جیسے بہتوں پر یہ احسان کیا ہے۔ بعض کتابوں سے میرا رشتہ کچھ اس طرح کا ہے جیسا اقبال نے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کہا ہے کہ ہم اپنی ہر طاقت و تکبر کو بھول کر آغوش مادر میں صرف طفل سادہ رہ جاتے ہیں جیسے کھوئی ہوئی جنت میں پھر سے آباد ہو گئے ہوں، وغیرہ۔

باغ و بہار، گلزار نسیم اور چند اور کتابیں میرے لیے ایسا ہی درجہ رکھتی ہیں۔ پڑھنے لکھنے کی تمام عمر مشق بہم پہنچائی، شہرت پائی، نفع کمایا، کبھی کبھی "ہمچو من دیگرے نیست" کا بھی گمان گزرا لیکن باغ و بہار، گلزار نسیم، فسانۂ آزاد، مثنوی میر حسن، الف لیلہ اور اس قبیل کی بعض دوسری کتابوں کے آغوش میں پہنچ کر اپنے کو طفل سادہ ہی محسوس کرنے لگتا ہوں لیکن "عبارت اشارت اور ادا" کا وہ لطف پہلے کبھی نہیں آیا تھا جو اب آیا۔ آپ نے خوب کیا کہ صحت کے ساتھ صحیح نسخہ چھپوا دیا اور آخر میں ایک فرہنگ کا اضافہ کر دیا۔ آپ کے لیے یہ سفر کتنا دشوار رہا ہوگا لیکن آئندہ آنے والوں کے لیے یہ راستہ کتنا

صاف، ہموار اور خوشگوار ہو گیا۔ ان پر آپ کا کتنا بڑا احسان ہے، دیانتکر نسیم اور میراثن پر بھی۔ یہ سب سے موزوں اور قیمتی نذر عقیدت ہے جو ایک فن کار دوسرے فن کار کو پیش کر سکتا ہے۔

لوگوں کی مصروفیت اور زندگی و زمانے کے طرح طرح کے تقاضے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ شعر و ادب میں درک حاصل کرنا درکنار، ان سے آشنا اور لطف اندوز ہونے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ آپ نے یہ کام آسان کر دیا۔ مگر اب بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنے شعر و ادب، اپنی تہذیب اور اپنی روایات کی گراں مائیگی، نزاکت و نفاست سے موجودہ اور آئندہ نسلوں کو آشنا کرانے کے لیے ضروری ہے کہ مزید سہولتیں فراہم کی جائیں یعنی وضاحتی نوٹس کا اضافہ کیا جائے۔ حوصلہ اسی کار کھیے، پورا کرنے والا خدا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں بسیار شیوہ ہائے بتاں کی مانند شعر و سخن کے بھی شیوے ہیں۔

ایک زمانے میں دہلی کوئی جانے لگتا اور صاحب علم و فن با اثر و اقتدار ہوتا تو اس سے تاکید سے کہہ دیتا کہ رشید حسن خاں پر لطف و نوازش کی نظر رکھنا۔ شکر ہے کہ اب آپ اس سے بے نیاز ہو گئے۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ آج یہ لکھنے کا موقع مل رہا ہے کہ ہر ہوشیار اور ذی استعداد نوجوان پر جہاں تک ممکن ہو سکے رشید حسن خاں لطف و نوازش کی نظر رکھیں!! یہ بہت بڑی امانت ہے جو آپ کے سپرد کی جا رہی ہے۔

عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں کی خدمت میں دعا و سلام مخلص
رشید احمد صدیقی۔

ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
شنبہ، ۱۲ ستمبر ۱۹۷۲ء سلام شوق

آپ کی تالیف انتخاب ناسخ ملی۔ یہ کرم اب آپ کی وضعداری اور میری عزت افزائی میں داخل ہو چکا ہے۔ آنکھوں کی طرح طرح اور دیرینہ تکالیف کے سبب سے لکھنا پڑھنا بہت محدود ہو گیا ہے اور اس انبساط و افتخار سے تقریباً محروم ہو چکا ہوں جو اس عبادت سے کبھی حاصل ہوا کرتا تھا۔ تاہم جب بھی متعلقہ آزار چشم پوشی سے کام لیتے ہیں تو ہیرا پھیری کر لیا کرتا ہوں۔

پہلے سے اب آپ کی تحریروں کی سطح اور لب و لہجہ بہت بلند ہو گیا ہے، آتا

بلکہ بذاتِ خود آپ کا شمار ایسے بہتر محققین میں کرنے لگا ہوں جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس پر آپ کو بھی کچھ کم خوشی یا تعجب نہ ہوا ہوگا کہ یہ امتیاز نسبتاً بہت جلد آپ کے حصے میں آیا۔ یونی ورسٹیوں کی اکثر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری اور اس کے پانے والوں کی طرف سے آپ کو ایک طرح تلخی یا الرجی کا ایسا آزار جس کا سبب نہ معلوم ہوسکا ہو، تھی۔ خیال تھا کہ یونیورسٹی سے وابستہ رہنے کی صحت مند فضا سے آپ کو اس سے نجات ہو گئی ہوگی لیکن اس انتخاب میں ایک جگہ اس کا اظہار ملا۔ آپ اسے کلیتہً ترک کر دیجیے۔ آپ محسوس کریں گے کہ آپ کو توقع سے زیادہ فائدہ پہنچا۔ طنز و تعریض کا حربہ سب سے آخر میں کام میں لانا چاہیئے اور جلد ہی باز آجانا چاہیئے۔

انتخاب ناسخ میں آپ کی قابلیت وسیع اور گہرا مطالعہ اور ترقی پسندی پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ یہ آیندہ ترقی کی بڑی مبارک نشاندہی کرتی ہے۔ پیام تعلیم میں آپ کے مضمون سے بچے کھلم کھلا اور بوڑھے چوری چھپے فائدہ اٹھائیں گے۔ انتخاب کے تعارف کے آخر میں ایک فقرہ نظر سے گزرا۔ "اس صناعی میں آج بھی دل کشی کی چمک اور دل چسپی کی مقناطیسیت اپنا اثر دکھاتی ہے"۔ یہ بڑی مبتدیانہ عبارت ہے۔ اتنا لکھ دینا کافی تھا۔ "اس صناعی میں آج بھی دل کشی ہے"۔ ارمغان مالک کی تنقید میں ایک جگہ آپ نے "مبالغہ آفریں" کا فقرہ لکھا ہے۔ لفظ مبالغہ کی جو اور جتنی حیثیت ہے، اس کو مدِنظر رکھیے تو "آفریں" کے ساتھ اس کا ربط نہیں ہوتا۔ غالب نے اس لفظ "آفریں" کو جو حیثیت دی ہے، اس کو اس مصرعہ میں ملاحظہ فرمایئے!

بہار آفرینا، گنہ گار ہیں ہم!

حکومت ہی کے درباروں میں PROTOCAL (محکمۂ تشریفات) نہیں ہوتا ادب اور انشا پردازی میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

احباب کو تسلیم۔ دعا ہے کہ آپ مسرور و مع الخیر ہوں

مخلص

رشید احمد صدیقی

ذاکر باغ، یونی ورسٹی علی گڑھ

بدھ ۱۳ر ستمبر ۱۹۶۲ء

شفقی۔ تسلیم

۷ر ستمبر کا مفصل نوازش نامہ ۱۱ر ستمبر کو موصول ہوا تھا۔ شکریہ۔ آپ پاس کی

بدعنوانیوں پر آپ نے جس بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے وہ کہیں کہیں بے صبری اور بیزاری تک پہنچ گئی ہے۔ اس سے انکار نہیں لیکن یہ ناگفتنی کہاں نہیں ملتی۔ اس سے اچھے لوگ اپنے اوپر زندگی تلخ نہیں کر لیتے بلکہ اپنی اچھی اور اعلیٰ صلاحیتوں کا سہارا لے کر ضمیر اور ذوق کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ غم و غصہ کرنے یا ملول و بیزار رہنے سے اپنے کو نقصان پہنچتا ہے اور بدخواہ خوش ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسا سودا کبھی نہیں کرنا چاہیے۔

آپ نے ناسخ کی شاعری اور لکھنؤ کی تہذیب کی جس وسعتِ نظر قابلیت اور سلامتِ طبع سے وضاحت اور وکالت کی ہے وہ نہایت درجہ قابلِ تعریف اور اتنی ہی قابلِ اتباع ہے۔ میرا خیال ہے کہ یکسو ہو کر آپ اس طریقۂ کار کو ترقی دیتے رہیں گے تو جلد ہی ایک مستند محقق ہی نہیں بہترین تنقید نگار بھی تسلیم کیے جانے لگیں گے۔ یہ قِران بہت کم دیکھا گیا ہے۔ اس سے فن اور فنکار دونوں میں گراں مائیگی آتی ہے۔ اس کے لیے اور باتوں کے علاوہ یہ ضروری ہے کہ آپ کے دل میں ہر چیز کے لیے جگہ ہو یہاں تک کہ آپ کا برا چاہنے والا بھی برا چاہنے سے شرمانے لگے۔ یہ منزل و منزلت آسان نہیں ہے ورنہ میں اتنا زور نہ دیتا۔ معیاری کتب کی تالیف و تہذیب میں آپ کا حصہ کچھ کم معیاری نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ دن زیادہ دور نہیں جب آپ کا نام ایسے کاموں میں بطور سند کے لیا جانے لگے گا۔ ایسا ہونا شروع ہو گیا ہے جس کے لیے آپ ہم سب کی تہنیت کے یقیناً مستحق ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور آپ کی مدد فرمائے۔ آمین

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۲) پروفیسر محمود الٰہی کے نام

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ جمعہ ۱۵/ مئی سنہ ۱۹۶۴ء

محمود الٰہی صاحب مکرم۔ سلام شوق

ابھی ابھی آپ کا خط اور سانحے کی خبر ملی۔ جو چاہتا تھا کہ نہ ہو، وہی ہوا کہ بہ ہر حال اگر نہ طویل علالت کے بعد میرے بیٹے مسعود الٰہی کے انتقال کی خبر۔ مرحوم اس کی رفتارِ صحت معلوم کرنے کے لیے برابر خط لکھتے رہتے تھے۔

اولاد کے مرنے کا غم ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ہو کر رہ چکا ہے اور روز بروز کم ہونے کے بجائے تازہ ہوتا جاتا ہے تو آپ پر کیا گزری ہوگی!

کتنے بیم و رجا کے بعد وہی ہوا جس سے بچنے کی دعائیں مانگی گئیں، کتنے جتن کیے گئے، معلوم نہیں اور کیا کیا نہ کیا گیا ہوگا! صبر کیجیے یا نہ کیجیے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یوں بہت سی باتوں کا خیال کر کے کر لیجیے تو اچھا ہے۔ ایسے صدمے میں ماں باپ جو چاہیں کر ڈالیں، خدا کو باز پرس نہ کرنا چاہیے۔ البتہ ماں کو ہر وقت ہر طرح سے تسلی دیتے رہیے۔ اس سے آپ دونوں کا غم ہلکا ہو جائے گا۔ ماں کو آپ سے کہیں زیادہ غم ہوگا، اس کو صرف آپ ہی کم کر سکتے ہیں۔ اپنے اس فرض کو ادا کیجیے۔

آپ کے پچھلے خط کا جواب نہ دے سکا، اکثر یاد آتا تھا لیکن کچھ کر نہ پاتا تھا۔ جو مقالہ آپ کے پیش نظر ہے، اس کو لکھ ہی ڈالیے۔ میرے مشورے کے بغیر معتبر و مستند ہوگا۔ آج کل طبیعت کا حال کچھ اس طرح کا ہے کہ ٹھکانے کا کوئی کام کرنے کی جیسے سکت نہ باقی رہی ہو۔ بہت دنوں سے یہی حال ہے لیکن کیا کروں کہ کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔

آپ تعطیل میں مکان پر ہوں گے، وہاں کا پتہ نہیں معلوم، آپ نے صرف ٹانڈہ لکھا، اس لیے احتیاطاً یونی ورسٹی کے پتے پر یہ خط بھیجتا ہوں۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

اتوار، ۱۰ر فروری سنہ ۷۴ء

محبی و مشفقی۔ تسلیم

۲ر کا نوازش نامہ ۸ر کو موصول ہوا۔ معلوم نہیں کہاں کہاں بھٹکتا یا کس مپرسی میں رہا۔ آپ نے جو خوش خبری دی ہے[1] وہ جتنی غیر متوقع تھی، اس سے کہیں زیادہ اس نے آپ کی دیرینہ شرافت اور وضع داری کی یاد تازہ کر دی۔ کیسے بتاؤں جس آشوب سے ہم سب گزر رہے ہیں، اس میں آپ جیسے عزیزوں کا اظہار خلوص و محبت کس درجہ متاثر و مسرور کرتا ہے۔ اس خوش خبری کی سب سے پہلی اطلاع آپ کے مسرت نامے سے ملی۔ کسی نے بتلایا کہ ریڈیو سے یہ خبر بہت بعد میں موصول ہوئی۔ اسی حیص بیص میں تھا کہ کہیں ادھر سے تصدیق ہو جائے تو آپ کا شکریہ ادا کروں۔

---

[1] اتر پردیش اردو اکادمی نے مرحوم کی مجموعی خدمات کا اعتراف کیا تھا۔

جس احترام و عقیدت سے آپ مجھے اکثر یاد کرتے رہتے ہیں اسی خوشی اور شکر گزاری سے مدتیں گزریں مجھے شعبہ میں آپ کی رفاقت یاد آتی ہے۔ خلوص اور اپنی وضع کے کیسے کھرے INVESTMENTS تھے کہ آج تک ان کے PREMIUM ہم دونوں کے حصے میں آرہے ہیں!!

کچھ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ ادارہ کس طرح کن منازل سے گزرا یعنی کس کس کی کہاں کہاں ہر سر معرکہ لگی ہوئی تھی۔ گو مصلحت یہی ہے کہ یہ سرگرمیاں پردۂ خفا میں رہیں لیکن کیا کیجیے کہ نفس کا یہ مطالبہ کتنا ہی نامناسب ہو، قدرتی ضرور ہے۔

خدا حافظ
رشید احمد صدیقی

ذاکر باغ
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ منگل، ۲۸؍ جنوری ۷۵ء

مکرمی و شفقتی تسلیم

نوازش نامہ موصول ہوا۔ لڑکیوں کی تعلیم کے داخلہ کے بارے میں آپ نے جن دشواریوں کا اظہار کیا ہے، ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھیے، پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ ایک سہارا پردۂ غیب کا بھی ہوتا ہے!

"عزیزانِ علی گڑھ" آپ کو پسند آیا۔ ضرور آیا ہوگا اس لیے کہ آپ علی گڑھ کے نیازمندوں میں بھی ہیں اور ناموروں میں بھی۔ اس نسبت سے خدا آپ کو مسرور و مفتخر رکھے۔

یوپی اردو اکیڈمی سے آپ نے میرے علاج کے لیے کچھ امداد پانے یا لینے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پارسال بھی شاید آپ ہی نے اس کا ذکر کیا تھا۔ اس پیش کش کا میں نے شکریہ ادا کیا تھا لیکن معاف کیے جانے کی درخواست کی تھی۔ آج بھی اس کا اعادہ کرتا ہوں، بڑی احسان مندی کے ساتھ۔ آپ مجھ سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ میرے آپ کے بہت سے رفقائے کار اور اردو کے خدمت گزار ایسے ہیں جو اکیڈمی کے اس کرم کے مستحق اور منتظر ہوں گے، ان کی طرف چشمِ التفات دیکھیے۔ مجھے اللہ اور علی گڑھ نے اس طرح کے عطیات و امداد سے اب تک مستغنی رکھا ہے۔ ان دونوں سے جب تک انحراف نہیں کرتا، انشاء اللہ اسی پر اکتفا کر سکوں گا جو ملا یا ہوا ہے۔

البتہ ایک مسئلہ ایسا ہے جس پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں[2]۔ پار سال اکیڈمی نے پانچ ہزار کا ایوارڈ میری مجموعی خدمات کے سلسلے میں منظور کیا تھا۔ پچھلے سال میری کتاب "ہمارے ذاکر صاحب" کو جامعہ بک ڈپو لمیٹڈ، دہلی نے انعامی کتب کے انتخاب کے لیے پیش کیا تھا۔ کتاب کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کو میری "دیرینہ مجموعی خدمات" میں شامل کر کے قابل اعتنا نہیں قرار دیا گیا اور منظور شدہ پانچ ہزار کے ایوارڈ میں اس کو بھی جگہ دی گئی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر یہ کتاب اسی سال شائع ہو کر پیش نہ کی جاتی تو میری دیرینہ مجموعی خدمات سے اس کو حذف سمجھ کر پانچ ہزار کے ایوارڈ کا مجھے مستحق قرار نہ دیا جاتا۔ مجھے نہیں معلوم، میرے ساتھ جن دو حضرات کو یہ ایوارڈ دیا گیا ان کی بھی کوئی تازہ ترین تصنیف ایسی تھی جس کے طفیل ان کو اس ایوارڈ کا مستحق سمجھا گیا، یا کیا؟

مختلف انعامات کے لیے مختلف CATAGORIES مقرر ہوں گی جن کے تحت انعامات دیے جاتے ہیں یا نہیں دیے جاتے؟ پانچ ہزار کے ایوارڈ میں سے دوسری CATAGORIES کی جمع تفریق مشکل ہی سے سمجھ میں آتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ اسی سبب یا نقص کی بنا پر اس سال بھی (جب کہ وہ میعاد کے اندر ہے) "ہمارے ذاکر صاحب" کو انتخاب سے حذف کیا گیا، شاید!

بہر حال ایک بات تھی جو اکثر ذہن میں آتی رہی۔ ایوارڈ کمیٹی کا فیصلہ اپنی جگہ پر مسلم اور قابل احترام جس کو میں ملحوظ رکھتا ہوں اور رکھوں گا۔ ممکن ہے، میرا نقطۂ نظر صحیح نہ ہو۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] مرحوم نے جون پور کی دو لڑکیوں کے لیے دریافت کیا تھا کہ ان کا داخلہ پی ایچ۔ ڈی (اردو) میں ہو سکتا ہے کہ نہیں۔ [2] اتر پردیش اردو اکادمی نے جس سال مرحوم کی مجموعی خدمات کا اعتراف کیا تھا اسی سال مرحوم کی تصنیف "ہمارے ذاکر صاحب" اکادمی کے انعام کے لیے داخل کی گئی تھی۔ اکادمی کے ضوابط میں یہ صراحت تھی کہ کسی مصنف کو سال زیر بحث میں صرف ایک انعام مل سکتا ہے۔ خدا جانے مرحوم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ "ہمارے ذاکر صاحب" کے انعام کی رقم بھی "مجموعی خدمات" کی رقم میں شامل کر دی گئی ہے۔ اس غلط اطلاع نے مرحوم کو متاثر کیا اور صحیح صورت حال معلوم کرنے کے لیے خط میں یہ چند سطریں لکھیں۔

(۴) شبنم سبحانی کے نام[1]

ذکاءاللہ روڈ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ جمعرات، ۵ مارچ ۱۹۶۸ء

مشفقی۔ تسلیم

"دوام" کا مارچ کا شمارہ موصول ہوا۔ "عزیزانِ ندوہ سے خطاب" پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے جس عزت و محبت سے میرا ذکر کیا ہے، اس کے لیے تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ دعا کرتا ہوں کہ "دوام" کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ آپ کو تہذیب اور شعر و ادب کی مسلمہ روایات کو فروغ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

یونی ورسٹی، علی گڑھ

۲۵ مارچ ۶۸ء

عزیز گرامی! سلام مسنون

۲۱ مارچ کا مسرت نامہ موصول ہوا۔ میری آنکھوں میں تکلیف ہے۔ معالج نے لکھنے پڑھنے سے منع کیا ہے۔ ممکن ہے کچھ ہی دنوں میں آپریشن کی نوبت آجائے۔ یوں بھی لکھنے پڑھنے کا کام کر دیا ہے۔ اس لیے آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۱۱ اپریل ۱۹۶۸ء

مکرمی! تسلیم

نوازش نامہ مورخہ ۶ اپریل موصول ہوا۔ میرے جن خطوط کے بارے میں آپ نے تحریر

---

[1] سید عبدالباری شبنم سبحانی کے زیرِ ادارت ٹانڈہ، ضلع فیض آباد سے ماہنامہ 'دوام' شائع ہوتا تھا۔ یہ رسالہ زیادہ دن تک جاری نہیں رہ سکا۔ شبنم سبحانی صاحب آجکل گنپت سہائے پوسٹ گریجویٹ کالج، سلطان پور میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔

فرمایا ہے، آپ چاہیں تو اُن کو شائع کر سکتے ہیں۔ یہ کسی اصول کی بنا پر نہیں صرف میری ذاتی پسند و ناپسند کا مسئلہ ہے۔ میں دوستوں اور عزیزوں کو تصنع، تکلف یا ضابطے کا خط نہیں لکھتا، لکھ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے نہیں چاہتا کہ اس نوع کے ذاتی معاملے میں دوسرے شریک ہوں۔ جو اصحاب میری اس خواہش یا درخواست کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے، ان پر میرا کوئی اختیار نہیں ہوتا ورنہ ایسا نہ کرتے۔ اپنے نفع کے مقابلے میں دوسرے کے ضرر کو قابل لحاظ سمجھنا آج کل کے زمانے میں بڑا مشکل کام ہے۔ بایں ہمہ اگر میرے ان خطوط سے 'دوام' کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہے تو ان کو شائع کر دیجیے جیسا کہ عریضے کی ابتدا میں عرض کر چکا ہوں۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

ذاکر باغ، یونی ورسٹی، علی گڑھ

۲۸ اپریل ۶۸ء

مکرمی! تسلیم

والا نامہ صادر ہوا۔ 'دوام' کے وسیلے سے اردو ادب کی ترقی اور اقدار عالیہ کی تائید آپ جس انہماک اور قابلیت سے کر رہے ہیں، اس کا دل سے معترف ہوں۔ اللہ تعالیٰ استقامت بخشے۔ آمین۔

میرے بارے میں آپ نے جن اچھی باتوں کا اظہار کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں اس سے نفس خوش ہوتا ہے۔ ضمیر پر چاہے جو گزری ہو نوجوانوں کو ایسے مشاغل میں منہمک دیکھ کر

بڑی تقویت ہوتی ہے کہ بوڑھا اور ازکار رفتہ ہو کر جو باتیں سوچتا یا چاہتا ہوں وہ اتنی بے وقعت نہیں جتنی کہ عام طور پر سمجھی جاتی ہیں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

ذاکر باغ۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ
۱۸؍ اکتوبر ۶۵ء

مکرمی! تسلیم

نامۂ گرامی موصول ہوا۔ بہت سی معذوریوں کے سبب سے فرمائش کی تعمیل نہ کر سکوں گا۔ نادم ہوں۔

آپ نے اپنا نام صاف نہ لکھا جسے باوجود کوشش نہ پڑھ سکا۔ اس لیے پتے پر ایڈیٹر لکھنا پڑا۔ خط میں ہمیشہ اپنا نام صاف اور پورا لکھنا چاہیے تاوقتیکہ اس کا یقین نہ ہو کہ جسے خط لکھا جا رہا ہے، وہ لکھنے سے پورے طور پر واقف ہے۔ اسی طرح حوالے میں نمبر اور تاریخ واضح ہونے چاہئیں۔ آپ کے اس خط میں یہ سب گنجلک ہیں۔ کسی کا حوالہ نہیں دے سکتا۔

آپ نے خط میں جس مقصد کا ذکر کیا ہے، اس سے یہ باتیں غیر متعلق ہیں پھر بھی خطوط نویسی کے یہ آداب ملحوظ رکھنے چاہئیں۔ ان کا بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

ذکاء اللہ روڈ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ
(تاریخ ندارد)

محترمی! تسلیم

بجواب بالا عرض ہے، 'دوام' ملتا رہتا ہے۔ آپ کے کرم کا شکر گزار ہوں۔ مضامین معیار، مقصد، زبان، بیان، ترتیب و تزئین ہر اعتبار سے دوام قابلِ تعریف رسالہ ہے۔ آپ صاحبان ہمارے تشکر یے کے مستحق ہیں کہ باوجود چند در چند دشواریوں کے ایسا اچھا رسالہ شائع کر رہے ہیں۔ بعض مجبوریوں کے سبب سے آپ کی فرمائش کی تعمیل سے قاصر رہوں گا۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

قرۃ العین حیدر مسلم یونی ورسٹی میں مہمان پروفیسر:

اردو کی ممتاز افسانہ نگار محترمہ قرۃ العین حیدر کی مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے تقرری عمل میں آئی ہے۔ انھوں نے یکم دسمبر ۸۱ء کو اپنے عہدے کی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ ان کی تقرری کے سلسلے میں مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں خیر مقدمی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت شعبۂ اردو کی صدر پروفیسر ثریا حسین صاحبہ نے کی۔

پروفیسر محمود الٰہی ہندی سنستھان کے رکن نامزد:

گورنر اتر پردیش نے ہندی سنستھان کی مجلس انتظامیہ کی تنظیم نو کرتے ہوئے پروفیسر محمود الٰہی چیرمین مجلس انتظامیہ اتر پردیش اردو اکادمی کو اس کا رکن نامزد کیا ہے۔

یاد رہے کہ غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس کے موقع پر وزیر اعلیٰ اتر پردیش نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اردو اکادمی کے چیرمین کو ہندی سنستھان کا رکن اور ہندی سنستھان کے چیرمین کو اردو اکادمی کا رکن ہونا چاہیئے تاکہ دونوں اداروں میں رابطہ استوار رہے۔ یہ نام زدگی اسی سلسلے میں کی گئی ہے۔

مغربی بنگال اردو اکادمی کو انعام دینے کے لیے کتابیں مطلوب

مغربی بنگال اردو اکادمی یکم جنوری ۱۹۸۱ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۸۱ء کے درمیان شائع ہونے والی معیاری اور مستند اردو کتابوں کے مصنفوں کو انعامات دینے کے لیے درخواستیں طلب کرتی ہے، انعامات کے لیے اکادمی میں کتابیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۱ جنوری ۱۹۸۲ء ہے۔

ہندوستان بھر میں مطبوعہ اردو کتابوں پر تین ہزار روپے کے تین، دو ہزار روپے کے تین اور پندرہ سو روپوں کے چھ انعامات دیے جائیں گے، جب کہ مغربی بنگال میں مطبوعہ کتابوں پر تین ہزار روپے کے دو، دو ہزار روپے کے دو، پندرہ سو روپوں کے چار انعامات دیے جائیں گے۔ دیگر بیس کتابوں پر پانچ پانچ سو روپوں کے انعامات ہندوستان بھر کے لیے ہوں گے جن میں مغربی بنگال کے مصنفین بھی شامل ہوں گے۔ انعامات کے لیے کتاب کی آٹھ آٹھ جلدیں سکریٹری مغربی بنگال اردو اکادمی ۱۰، اسندر موہن ایونیو کلکتہ ۱۴۔ کو اس طرح بھیجی جائیں کہ وہ اپنی مقررہ تاریخ تک ضرور موصول ہو جائیں۔ تاخیر سے موصول ہونے والی کتابیں انعامی مقابلہ میں شامل نہ کی جائیں۔ بنگال اردو اکادمی سال زیر غور میں ناشرین کو بھی انعام دے گی۔ تفصیلات کے لیے سکریٹری مغربی بنگال اکادمی سے رجوع کیجیے۔ کتابیں داخل کرنے کی آخری تاریخ ۳۱ جنوری ۱۹۸۲ء

اردو اکادمی کی پانچ نئی مطبوعات

اترپردیش اردو اکادمی نے ماہ نومبر میں پانچ کتابوں کا سیٹ شائع کیا ہے۔ جس میں اردو کے ممتاز شاعر علامہ آرزو کے دو شعری مجموعے فغان آرزو اور جہان آرزو بھی شامل ہیں۔ اکادمی کلیات آرزو حصوں میں شائع کرنے کا ارادہ کر چکی ہے۔

آرزو صاحب کی دو مزید کتب مراثی آرزو اور متفرقات آرزو زیر اشاعت ہیں۔ اس کے علاوہ اکادمی نے ماہر انیسیات جناب مسعود حسن رضوی ادیب کی کتاب "انیسیات" کا دوسرا اڈیشن بھی شائع کر دیا ہے۔ یہ اس کتاب کا فوٹو آفسیٹ اڈیشن ہے جس کی قیمت کم رکھی گئی ہے۔ دو مزید کتابیں، جو بی اے کے نصاب سے متعلق ہیں اور جن کے پہلے اڈیشن ختم ہو چکے تھے، اب فوٹو آفسیٹ سے شائع ہو گئی ہیں۔ ا

Uttar Pradesh Urdu Akademi REG. NO.
KHABARNAMA JAN. 82 LW/NP 126

اردو کے

ادبی جرائد کی دنیا میں

ایک معتبر نام

اترپردیش اردو اکادمی کا دوماہی علمی و ادبی مجلہ

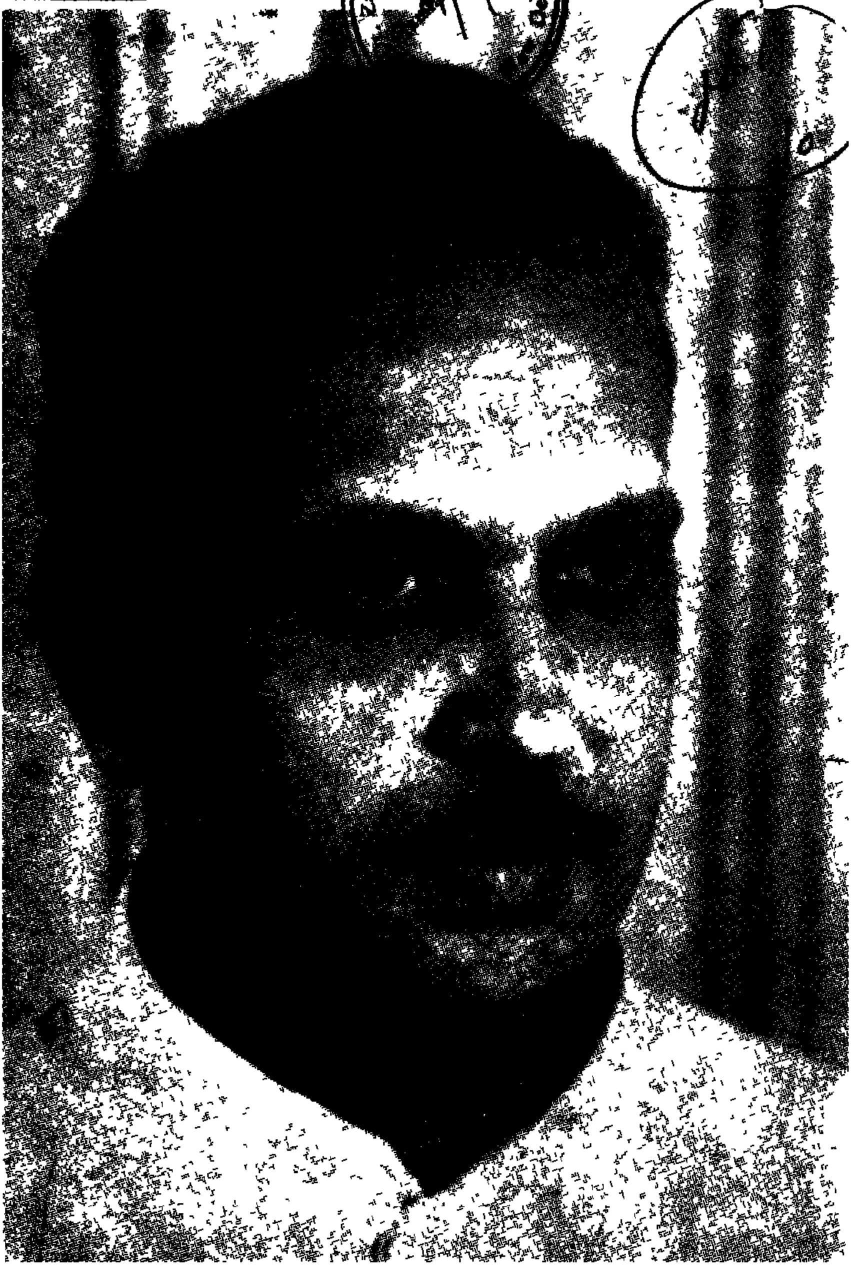
اکادمی

ملک کے ممتاز ... تحقیقی اور تنقیدی ... کاوشوں کا مجموعہ

خبرنامہ

ضمیمہ

دہلی اُردو اکادمی



خصوصی ضمیمہ

اترپردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

جنوری ۱۹۸۲ء

عزیز الجبار خاں، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے دفتر اترپردیش
اردو اکادمی، قیصر باغ لکھنؤ سے شائع اور نامی پریس، نخاس
نے طبع کیا

اداریہ

.....چراغ راہ میں جل گئے

مرد کی زبان ایک ہوتی ہے ——— وزیراعلا جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے اس قول کو عملی شکل میں پیش کر کے دکھا دیا۔ انھوں نے گزشتہ اپریل میں اعلان کیا تھا کہ اختتام سال سے پہلے یعنی ۳۱؍دسمبر ۱۹۸۰ء تک یو۔پی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا جائے گا اور جب کسی نے اس وعدے کے سیاق و سباق میں کسی تذبذب کا اظہار کیا تو موصوف نے یہی جواب دیا کہ مرد کی زبان ایک ہوتی ہے۔

ہم جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ محبان اردو کے شکریے کا اصل استحقاق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی صاحبہ کو ہے جنھوں نے کانگریس (آئی) کے انتخابی منشور میں اردو کے حقوق کا اعتراف کیا تھا اور اب ان حقوق کو قانونی شکل میں بھی تسلیم کر لیا۔

جمہوریت میں حقوق اور فرائض لازم و ملزوم ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ محبان اردو اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں، ہمیں اس حقیقت کو ایک بار پھر ثابت کر دینا ہے کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور یہ کہ اردو قومی یک جہتی اور مشترکہ تہذیب کی نمائندہ زبان ہے۔ اردو کو جو کچھ بھی ملا ہے، ہمارے اسی عمل سے ملا ہے اور آیندہ جو کچھ بھی ملے گا، ہمارے اسی عمل سے ملے گا۔

محمود الٰہی

خبر نمبر ۱۴

لکھنؤ۔ ۱۱- پوس سنہ ۱۹۰۳ء
۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۸۱ء

اُردو کو دوسری زبان کے طور پر استعمال کی منظوری

ریاست بہار میں اردو کے متعلق کیے گئے فیصلے کے طرز پر اتر پردیش کابینہ نے اردو کو دوسری زبان کی حیثیت سے مخصوص طور پر استعمال کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ اس سلسلے میں آئندہ اسمبلی اجلاس میں ضروری قانونی کارروائی کی جائے گی۔

پروفیسر محمود الٰہی

ضربِ موسم تو پڑی، بندِ بہاراں تو کھلا!!

زبانیں عام طور پر اپنے علاقے اور اپنے ملک کی نسبت سے موسوم ہوتی ہیں۔ عربی، فارسی، انگریزی، بنگلہ، تامل، تیلگو، پنجابی، سندھی، بھوجپوری، میتھلی اور دوسری زبانیں اس کلیے کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ چند مستثنیات ہیں جن میں اردو سرِفہرست ہے اور اسی استثنا نے اسے ہمیشہ میدان کارزار میں رکھا اور اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے اسے جو کبھی لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ اس نے روشِ عام سے ہٹ کر اپنے لیے ایسا نام تجویز کیا جو ہندستان کی رنگا رنگی کا عکاس ہو اور جو اس کی کثرت کو "تماشائے بیک کف بردنِ صددل" میں تبدیل کر سکے۔ ماضی کے حادثات اور واقعات کی توجیہیں اکثر گمراہ کر دیتی ہیں۔ ایک "لشکری" زبان کا وجود میں آنا اور پھر بعد میں چل کر مختلف علاقوں اور زبانوں کے مابین ایک رابطے کی شکل میں اس کا ابھرنا ہندوستان کا مقدر تھا جو قوت سے فعل میں آیا۔ بعض شرفائے زبان و ادب نے اسے کتنا ہی کم رو اور مبتذل کیوں نہ سمجھا ہو، حقیقت تو یہ ہے کہ اردو دلوں میں گھر کرتی گئی اور ۱۸۵۷ء تک ملک کا ایک بڑا حصہ اس کے زیرنگیں ہو چکا تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اردو کے اس سفر میں کسی نے زیرِ لب شکایت بھی نہیں کی کہ یہ زبان اس پر مسلط کی جا رہی ہے یا یہ کہ اس زبان کا تعلق کسی ایک مذہبی گروہ سے ہے اور دوسرے گروہوں کے لیے یہ شجرِ ممنوعہ ہے۔ جس طرح مختلف قوتوں کے اختلاط سے ہندستان میں ایک نئی تہذیب پروان چڑھتی رہی، اسی طرح مختلف زبانوں کے امتزاج سے ایک نئی زبان ارتقا کی منزلیں طے کرتی رہی مگر کیا تہذیب اور کیا زبان، ان دونوں کے امتیازات میں سرِفہرست یہ ہے کہ پہلے یہ ہندستان کے مزاج میں ڈھلیں اور اس کی

اپنی ہوکر ہی قبول عام کی منزل کی طرف گام زن ہوئیں۔ اردو کا ارتقا ہندستان کے تہذیبی ارتقا کی ایک کڑی ہے۔ اس حقیقت کو نقاب اندر نقاب رکھنے کے لاکھ جتن کیے جائیں یہ ہمیشہ بے حجاب رہے گی!

دوسرے جدید علوم کی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی والے ہندستانیوں سے زیادہ علم اللسان اور لسانی مسائل سے واقف تھے۔ کمپنی والے کھل کر تو نہیں لیکن جہاں تہاں جملۂ معترضہ کے طور پر ہندستان کے دو بڑے مذہبی گروہوں کو دو مختلف لسانی گروہوں میں تقسیم کرنے لگے۔ یہ کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کر بیٹھتے تھے جو لسانی کشاکش کی ایک زیریں لہر کا باعث بن جاتی۔ جب ملک مکمل طور پر انگریزوں کے زیر اقتدار آگیا تو لسانی مسائل پیدا کئے جانے لگے یہاں تک کہ علی گڑھ تحریک کے وجود میں آنے سے پہلے یہ احساس عام کیا جانے لگا کہ اردو کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے۔

جب کشاکش شروع ہوتی ہے تو بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو عقل کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ معرکہ آرائیوں میں زیادہ تر دکھتی رگیں چھیڑی جاتی ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حریف گروہوں میں جذباتیت راہ پا جاتی ہے۔ اردو ہندی کی کشاکش میں جذباتیت نے جو کردار ادا کیا ہے، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

اردو نے اپنے ارتقائی سفر میں کبھی ہندی کے لیے یا ملک کی دوسری زبانوں کے لیے سدِ راہ کی حیثیت اختیار نہیں کی۔ ہندی تو بطور خاص ایک زبان کی حیثیت سے برابر ترقی کرتی رہی۔ جب اردو اور ہندی کو کسی نہ کسی مذہبی گروہ کے ساتھ مختص کرنے کی لے زیادہ تیز ہوگئی تو ایک طبقے نے پہلے ذہنی اور جذباتی طور پر، پھر عملی طور پر اردو کی مخالفت میں ہندی کی طرف مراجعت کی!

مسلمان اور غیر مسلموں کا ایک بڑا طبقہ اردو سے چپکا رہا۔ ردعمل کے طور پر نہیں بلکہ مجبوری حالات کے طفیل اس نے اردو سے اپنی وابستگی ختم نہیں کی۔ یہ لوگ مراجعت کرتے تو کس طرف کرتے؟

ان کے سامنے کوئی اور متبادل نہیں تھا۔ وہ صدیوں پہلے

ہندستانی مزاج میں ڈھل کر من و تو کی تفریق ختم کر چکے تھے۔ مسلمانوں کے پاس دینی عقیدے کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ان کے اور دوسرے ہندستانیوں کے مابین حد فاصل کا درجہ رکھتی۔ مسلمانوں کے دنیاوی شعائر میں ہندوستان کتنا دخیل ہے یہ سامنے کی چیز ہے، کوئی موضوع تحقیق نہیں ہے۔ مسلمانوں نے عربی سے تعلق صرف مذہب کی حد تک قائم رکھا۔ فارسی جو مدتوں ان کے افکار کا آئینہ رہی۔ رفتہ رفتہ ان سے دور ہوتی گئی اور انھوں نے اپنے سارے فکری سرمایے کا مظہر اردو کو قرار دیا۔ مسلمانوں کے پاس کوئی متبادل نہیں تھا کہ وہ اردو کو ترک کر کے کسی اور زبان کو اختیار کرتے۔ اسے حالات کا جبر کہیے یا کچھ اور۔ مسلمان (اور غیر مسلموں کا بھی ایک بڑا طبقہ) اپنے فکری سرمایے اور اپنی روایات کے سیاق و سباق میں یک لسانی ہو کے رہ گیا تھا اس لیے اردو سے اس کی وابستگی مقتضائے حال کے مطابق تھی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ اردو پر صرف مسلمانوں کا حق ہے۔ اگر صرف مذہبیات کو لیا جائے تو دوسرے مذاہب کا سرمایہ اس میں کم نہیں ہے مگر ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک اردو کی حمایت اور اس کی مخالفت کے نام پر جو کچھ کہا گیا اور سنا گیا، اس کا بھول جانا ہی اچھا ہے۔ یاد رکھنے کی بس ایک بات ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے کہ اس دور ابتلا میں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں ایسے افراد کی تعداد قابل لحاظ تھی جو زبان کے مسائل کو ان کے صحیح پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور جو اس امر میں راسخ العقیدہ تھے کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور جو اردو کے مسئلے کو کسی طرح مذہبی مسئلہ نہیں سمجھتے تھے۔ سچ بات یہ ہے کہ ان کی اصابت رائے نے اردو اور ہندی کی آبرو کو ہمیشہ محفوظ رکھا۔

ملک جب آزاد ہوا اور جمہوریت کو اس نے اپنا نصب العین قرار دیا تو اردو کے سیاق و سباق میں اس کا یہ نصب العین کھرا نہیں اترا۔ اردو والوں نے جس خندہ پیشانی کے ساتھ ہندی کی اولیت اور اس کی سرکاری حیثیت کو قبول کیا، زبانوں کی کشاکش کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اردو والے صرف یہ چاہتے ہیں کہ زبان کے معاملے میں ان کے ساتھ انصاف کیا جائے اور ایک زندہ قوم کے جو

لسانی تقاضے ہوتے ہیں، وہ پورے کیے جائیں۔ وہ اپنے مطالبات سیاسی جماعتوں اور حکومتوں کے سامنے پیش کرتے رہے اور اس عمل میں جس گاندھیائی عدم تشدد کا انھوں نے مظاہرہ کیا، زبانوں کی کشاکش کی تاریخ میں اس کی بھی مثال نہیں ملتی۔

شریمتی اندرا گاندھی جب برسر اقتدار آئیں تو انھوں نے اردو کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا اور ان کے معقول حل کی طرف پیش قدمی کی۔ انھوں نے مختلف ریاستوں میں اردو کی اکادمیاں قائم کرائیں اور انھیں فعال بنانے کی کوششیں کی۔ پچھلے عام انتخابات میں انھوں نے اپنی جماعت یعنی کانگریس (آئی) کے منشور میں یہ وعدہ کیا تھا اور یہ وعدہ انھوں نے پورا کیا کہ اردو کو اس کے جمہوری حق دے دیے جائیں گے۔ کانگریس (آئی) کو عوام نے حکومت بنانے کے لیے منتخب کیا اور اسے ایفائے عہد کا موقع ملا جس کی پہلی مثال بہار کی حکومت نے قائم کی۔ اتر پردیش کے وزیر اعلا نے ۸۱ء میں یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ بھی اختتام سال سے پہلے اردو کو دوسری زبان کا درجہ دے دیں گے۔

اردو عوام کی زبان ہے اور عوام کے مطالبات کو حکومتیں زیادہ دنوں تک ٹال نہیں سکتیں۔ اردو کو بہت پہلے اس کا موقع ملنا چاہیے تھا کہ وہ ایک جمہوری ملک میں اپنا جمہوری کردار ادا کر سکے۔

۱۹۴۷ء سے اب تک اردو کو اس کا جمہوری حق دلانے کے لیے جو جد وجہد کی گئی، اس کی تاریخ لکھنے کے لیے ہزاروں صفحات کی ضرورت ہوگی۔ اس شمارے میں بعض محبان اردو کے خطبات یا ان کے اقتباسات شائع کیے جا رہے ہیں، جو جد وجہد کی مختلف منزلوں کی نشاندہی کر سکیں گے۔

اُردُو

جدّوجہد کے آئینے میں

میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن زبان نہیں چھوڑ سکتا کیوں کہ زبان میری ذات کا آئینہ ہے، میری میراث ہے، میری تاریخ ہے اور میری زندگی ہے۔

پنڈت آنند نراین مُلّا

ڈاکٹر ذاکر حسین

کا

صدارتی خطبہ

کارکنانِ انجمن ترقی اردو (ہند) کی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ

بتاریخ ۲۶ جولائی ۱۹۵۳ء

دوستو! میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا۔ اس کانفرنس میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ جو کام آپ نے ڈیڑھ سال سے کچھ اوپر ہوا، اپنے ذمہ لیا تھا اس کو کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچانے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یہیں اسی ہال میں ۲۳ دسمبر ۱۹۵۱ء کو اردو علاقائی زبان کنونشن کے نمائندہ اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ۲۰ لاکھ اردو دوستوں کے دستخط حاصل کر کے دستورِ ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے ماتحت اتر پردیش میں اردو کی جائز حیثیت کو تسلیم کرانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس وقت ۲۱ لاکھ دستخط ہمارے پاس موجود ہیں۔ اتر پردیش کے شہر شہر، قصبہ قصبہ، تحصیل تحصیل ۵۰ مرکزوں میں ۴۵۰۰ سے اوپر رضاکاروں نے ہر مذہب و ملت کے اردو بولنے والوں سے اس محضر پر ۲۱ لاکھ دستخط حاصل کئے ہیں۔ جلسوں، جلوسوں بغیر، بے شور و شغب، سیاسی شورش کے رائج الوقت اسلوب سے، اپنی بات منوانے کے چالو ڈھنگ سے بہت الگ انداز میں، خاموشی اور متانت سے، پھیلا ہوا کام انجام کو پہنچایا گیا ہے۔ میں کام کرنے والوں کو اس پر مخلصانہ مبارکباد دیتا ہوں۔ اور مجھے سچی خوشی ہے کہ یہ کام اس طرح ہوا کہ جس طرح ہوتا تھا اس لیے کہ کام کے انداز میں مجھے کام کی اصلی روح کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس میں اپنے مطالبہ کی سچائی پر بھروسہ دکھائی دیتا ہے، اس میں ہندستانی سماج کی معقولیت پر اعتماد دکھائی دیتا ہے

باوجود ظاہری اسباب مایوسی کے اعتماد:

دلم بکوئے تو باصد ہزار نومیدی
بہ ایں خوش است کہ امیدواری گذارد

اس میں مجھے وہ نقشہ دکھائی دیتا ہے جو کہیں شعوری کہیں نیم شعوری طور پر کام کرنے والوں کے سامنے اپنے دیس اور اس کے مستقبل کا ہے، اس جمہوری سماج کا نقشہ اس کی اس جمہوری ریاست کا نقشہ جس کی بنیاد عدل و انصاف پر ہوتی ہے۔ جس کے ذمہ داروں کو بس ایک لگن ہوتی ہے کہ اس کی یہ بنیاد دن پر دن پکی اور مضبوط ہوتی جائے جس کی اخلاقی ترقی ہی ان کے نزدیک اس کی ساری دوسری ترقی اور مضبوطی کا پیمانہ ہوتی ہے، جو برابر اس کے جتن کرتی رہتی ہے کہ اپنے شہریوں کی کوشش سے، اپنے قانون سے، اپنے عملداروں کے کردار سے، اس میں ہر وہ گروہ، ہر طبقہ، بلکہ ہر آدمی کی اخلاقی شخصیت کی پوری ترقی کا راستہ روز بروز سہل سے اور سہل ہوتا جائے، مجھے اس میں ایک ملی جلی گنگا جمنی تہذیب و تمدن کا نقشہ دکھائی دیتا ہے جس سے ہماری قومی زندگی عبارت ہے، اس چمن کا نقشہ جہاں ہر رنگ میں بہار کا اثبات ہوتا ہے، جہاں "لالہ و گل و نسرین" کے جدا جدا رنگ سے لوگ چڑتے نہیں خوش ہوتے ہیں، جہاں کثرت میں وحدت تلاش کرنے کی خو عام ہے، جہاں کل اپنے کو جزو کا رقیب نہیں مانتا، اس کی تقویت کو اپنی مضبوطی جانتا ہے، مجھے اس میں لاکھوں شہریوں کا یہ یقین جھلکتا دکھائی دیتا ہے کہ ہماری ریاست کی نیو اخلاق، نیکی اور انصاف پر ہے، اور اس نیو کو مضبوط بنانا ان کا فرض ہے، اس لیے کہ نہ اخلاقی انفرادی شخصیت ایک دم بنی بنائی، ترشی ترشائی ہاتھ آتی ہے، نہ اخلاقی ریاست۔ یہ دونوں برابر بنتی رہتی ہیں، بگڑتی بھی رہتی ہیں۔ قدم آگے بھی بڑھتا ہے، کبھی کبھی پیچھے بھی۔ خوش نصیب ہے وہ ریاست جس کی ہر لغزش پر اس کے شہری چونک اٹھیں اور اسے پھر سیدھے راستہ پر لے آئیں۔ مجھے تو انجمن ترقی اردو کی پروبش میں اردو کو اس کا حق دلانے کی کوشش میں یہ سب دکھائی دیتا ہے۔

جو لوگ اس میں محض کسی کی ضد، یا محض کسی کی سہولت پسندی، کسی کی فرقہ پرستی کسی کی پاکستان دوستی، کسی کی ہندوستان دشمنی، کسی کی ہندی دشمنی دیکھتے ہیں یا اوروں کو دکھاتے

ہیں وہ بڑی ہی غلطی پر ہیں۔ دوستو! اس کی تہ میں تو ہماری جمہوری زندگی کا بنیادی سوال پنہاں ہے کہ اس دیس میں جس کی لاٹھی ہوگی بھینس اسی کی مانی جائے گی۔ کیا ایک زبان دوسری زبان کو یا زبانوں کو، ایک اسلوب زندگی دوسرے اسلوب کو، ایک طرز فکر دوسرے طرز فکر کو اپنے زور سے دیس نکالا دے سکے گا یا سب کے سب میل جول، باہمی رواداری اور تعاون سے اس کی زندگی ترقی کرے گی؟ کیا یہاں زندگی کے مسئلے زور و جبر، ڈرا دھمکاوے سے حل کئے جائیں گے یا محبت اور سمجھنے سمجھانے سے؟ کیا یہ دیس اپنی زندگی کی دلفریب رنگا رنگی کی قدر کرے گا یا بس ایک بھوری بھوری، مٹیالی سی یک رنگی زیادہ بھائے گی؟ کیا یہ ایک جمہوریت کا پرفضا چمن بنے گا، آنکھوں کا نور، دل کا سرور، یا کسی جاگیردار کا کرہی کا کھیت؟

دوستو! میں نے ابھی جو اشارہ کیا ہے کہ لوگ ہمارے مطالبہ کی تہ کو نہیں پہنچے۔ اور اس کی من مانی تعبیریں کرتے ہیں تو وہ میں نے خالی اٹکل سے نہیں کہا ہے۔ یہ سب باتیں کہی گئی ہیں اور کہی جارہی ہیں۔ کوئی کھلم کھلا تیز اور کڑوے انداز میں کہتا ہے، کوئی ذرا دھیمی لے میں، مگر بار بار کہا گیا ہے کہ اردو کو علاقائی زبان بنانے کی کوشش فرقہ وارانہ کوشش ہے۔ اس میں مذہبی فرقہ پرستی کارفرما ہے، یہ مسلم لیگی ذہنیت کا مظاہرہ ہے تقسیم ہند سے پہلے ملک میں ہندو مسلم تعلقات کی کشیدگی، سیاسی لیڈروں کی ضرورت مذہبی جذبات کو مشتعل کرکے سیاسی مقاصد حاصل کرنے..... ان سب نے اردو کے موجودہ مسئلہ پر بہت سے پردے ڈال دئیے ہیں اس سلسلہ میں بہت سے ہندو مسلمانوں نے، بہت سے اردو والوں ہندی والوں نے بہت کچھ کہا اور بہت کچھ کیا جس پر کوئی بجا طور پر فخر نہیں کرسکتا۔ اس قصے کو بار بار یاد کرنے یا دہرانے سے کسی کا فائدہ نہیں سوائے ان کے جن کے فائدہ کو روکنا ضروری ہے، یعنی ان کو جو ہماری قومی زندگی کے قوام کو درست نہیں ہونے دینا چاہتے، جو جمہوریہ ہند کے دستور کے دشمن ہیں جو ملک میں ایک نا مذہبی رواداری ریاست کے قیام کو پسند نہیں کرتے مگر مجھے اس وقت مسلمانوں کی طرف سے کچھ کہنا نہیں ہے، اس وقت تو اردو کا ذکر ہے اور کیسا ستم ہے کہ اردو پر اور اردو کے حامیوں پر کوئی فرقہ پرستی کا الزام لگائے کہ اردو کسی فرقہ کی زبان ہے، کسی مذہب کی زبان نہیں ہے، کسی خاص نیت سے مصنوعی گھڑی ہوئی زبان

نہیں ہے۔ یہ زندگی کی ریل پیل میں انسانوں کی میل جول کا پھل ہے، لوگوں کی، جنتا کی زبان ہے، جن کے دل کو کچھ لگی تھی اور وہ اسے دوسرے بھائی انسانوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کے دلوں کی بولی ہے یہ فقیروں اور خادمانِ خلق کی زبان ہے، بازار میں کاروبار اور لین دین سے بنی ہوئی زبان ہے، منڈیوں میں مبادلۂ اجناس کے ساتھ مبادلۂ افکار کے عمل کا نتیجہ ہے، ان کی زبان ہے جو کسی خاص روایات سے ایسے لپٹے ہوئے نہ تھے کہ ہر نئی بات سے بھڑکیں، ہر نئے اسلوب سے بدکیں، لوگوں ہی سے نہیں لفظوں سے بھی گھن کریں۔ یہ وسعتِ قلب کی زبان ہے، رواداری کی زبان ہے، محبت اور پریم کی زبان ہے، اسی لیے ایسی کشادہ دامن زبان ہے، ایسی پذیر زبان ہے، ایسی جاندار زبان ہے۔ یہ اس ملک کے، اس اتر پردیش کے علاقہ کے بسنے والوں کے رابطۂ دلی اور رابطۂ ذہنی کا نتیجہ ہے، اور ان بسنے والوں میں ہندو، مسلم، سکھ کا کوئی امتیاز نہیں۔

غضب ہے دوستو! اگر کوئی تربھون ناتھ ہجر، رتن ناتھ سرشار، پروفیسر رام چندر سدرشن، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، برجموہن دتاتریہ، اور کشن پرشاد کول کی زبان پر مذہبی فرقہ واریت کا بہتان باندھے۔ دیا شنکر نسیم، جوالا پرشاد برق، برج نرائن چکبست، درگا سہائے سرور، رگھوپتی سہائے فراق، منشی نول کشور، لالا سری رام، پنڈت منوہر لال زتشی، سر تیج بہادر سپرو، منشی دیا نرائن نگم اور مہاراج کشن پرشاد کی زبان پر مذہبی تنگدلی کی تہمت لگائے۔ جس میں آریہ سماج تحریک کا تمام تر مواد موجود ہو، جس میں عیسائی مشنریوں نے پورا کام لیا ہو، اسے مسلمانوں کی زبان، مسلمانوں کی زبان چلا چلا کر بتانا اور تعصبات مذہبی کی ہوا دے کر نفرت کی آگ بھڑکانا کیسی ناروا بات ہے؟ بڑا ستم ہے دوستو! اگر جانا بوجھا ظلم نہیں تو کسی بے سر پیر کی بے تک بات ہے یہ، اور اگر بد دیانتی نہیں تو کیسی نادانی ہے؟

پھر مذہبی تعصب سے پورا کام نہ چلے تو سیاسی تعصب بھڑکایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اردو بدیسی زبان ہے۔ لیکن کیا کیجیے کہ تاریخی اور ادبی شواہد پکار پکار کر کہتے ہیں کہ نہ یہ بدیسیوں کی زبان ہے نہ بدیسی زبان ہے۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو اس میں افعال، اور حروف اور عام ضرورت کے اسم سب ہندی ہیں۔ صوتی اعتبار سے دیکھیے

تو اس کا ایران و عرب سے کوئی رشتہ نہیں۔ اس میں آوازوں کی بہت بڑی تعداد ہندستانی ہے۔ اور تو اور رسم خط تک میں کہ اس کے غیر ملکی ہونے پر بہت زور دیا جاتا ہے درجنوں ہندستانی آوازیں ہیں جیسے ڑ۔ ڈ۔ ٹ۔ ڈھ۔ ڈھ۔ ڑھ، ٹھ، بھ۔ پھ۔ جھ، چھ، کھ، گھ وغیرہ جنھیں کون غیر ملکی بتا سکتا ہے؟ مگر کہنے والوں کا منہ کون بند کرے؟

پھر کہنے والوں نے کہا کہ اردو کو اس کا جائز حق دلانے کی تحریک ہندستانی قومیت میں تفرقہ ڈالنے کی تحریک ہے۔ اس کا جواب کیا دوں؟ کون نہیں جانتا کہ اس تحریک کے حامیوں نے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ اردو کو ہندستان کی قومی سرکاری زبان مان و۔ اگرچہ تقسیم ہند سے پہلے کے سیاسی بحران سے ملک بچا رہا ہوتا تو یہ مطالبہ بھی چنداں بیجا نہ ہوتا۔ مگر جب سے ہمارے دستور اساسی میں ہندی کو قومی زبان مانا گیا ہے۔ اردو والوں نے اس کی کوئی مخالفت نہیں کی۔ اردو کے ہر پلیٹ فارم سے اس کی تاکید ہوتی ہے کہ اردو جاننے والوں کو ہندی بھی سیکھنی چاہیئے۔ اگرچہ گاندھی جی کی یہ ہدایت کہ ہندی جاننے والوں کو اردو بھی سیکھنی چاہیئے۔ اب آسانی سے کہیں سننے میں نہیں آتی، اردو کا حق ایک ملکی زبان کی حیثیت سے مانگنے کو اور اتر پردیش کے علاقہ میں اس کو بھی ایک سرکاری زبان منوانے کی کوشش کو قومی تفرقہ کی کوشش کیسے کہا جا سکتا ہے؟ ہمارے ملک کی وحدت تو ایسی وحدت اور اس قسم کی کثرت میں وحدت ہے کہ ۱۴ بڑی زبانوں کو ملک کی زبانیں تسلیم کرنے سے قومی وحدت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور اگر اتر پردیش کی وحدت اس تجویز سے خطرہ میں نظر آتی ہو تو یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی ریاست میں دو یا دو سے زیادہ زبانوں کو تسلیم کرنے سے اس کی تہذیبی وحدت میں رخنے نہیں پڑتے۔ اس وقت بھی پنجاب اور مدھیہ پردیش میں ایک سے زائد زبانیں سرکاری طور پر تسلیم کی جاتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۳۹ء میں جنگ شروع ہونے پر جب میں جرمنی سے گرتا پڑتا سوئزرلینڈ پہنچا تو زیورچ میں ایک قومی نمائش خوش سلیقگی، خوش مذاقی اور خوش انتظامی کا نمونہ تو تھی ہی مگر اس چھوٹی سی قوم کی سیاست لسانی کی بھی ایک عجیب موثر مثال یہاں سامنے آتی تھی۔ نمائش لاکھوں ہی چیزوں کی تو تھی۔ میلوں میں پھیلی ہوئی، زندگی کے سب شعبوں پر حاوی۔ میں نے تو ایسی نمائش [illegible]

دیکھی نہیں۔ اس عظیم الشان نمائش میں ہر چیز جو دکھائی گئی تھی، چھوٹی ہو یا بڑی اس کی تشریح تین زبانوں میں ہر چیز کے ساتھ درج تھی۔ اس وقت سوئزرلینڈ کی حالت جنگ کی وجہ سے خاصی نازک تھی، بتیس دانتوں میں ایک زبان۔ ہر لمحہ یہ خطرہ تھا کہ کسی فریق جنگ کی فوجیں اس ملک کو اپنی راہگزر نہ بنا ڈالیں۔ قومی اتحاد کا جذبہ بکمال پر تھا۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کی تشریح تین زبانوں میں کر کے کسی کو یہ گمان نہ ہوتا تھا کہ وحدت قومی پر ضرب پڑ رہی ہے۔ بلکہ وحدت قومی کے قیام میں اس رواداری سے زیادہ کوئی اور چیز معین نہ تھی۔ ملک کے ہر بچے کو یہ نمائش سرکاری خرچ پر دکھائی گئی تھی۔ اس لیے کہ یہ ان کی قومی تعلیم کا سب سے اہم موثر منصوبہ تھا۔ اب سوئزرلینڈ نے ایک چوتھی زبان کو بھی جسے کوئی ۵۰ ہزار آدمی بولتے ہیں قومی زبان تسلیم کر لیا ہے۔ اور اگر اب کوئی قومی نمائش ہوئی تو ہر چیز کی تشریح چار زبانوں میں کی جائے گی اور ایسا نہ کرنے کے بہانے نہ ڈھونڈے جائیں گے۔ اپنے شہریوں کے جائز حقوق کو پورا کرنے سے، ان کے جذبات کا احترام کرنے سے، ان کے لیے سہولتیں بہم پہنچانے سے، ان کی عزیز اور چہیتی چیزوں کی حفاظت اور ترقی میں ان کی مدد کرنے سے وحدت قومی پیدا ہوتی ہے۔ جذبہ قومی ایک زندہ کارفرما جذبہ بنتا ہے، وفاداری ایک ذہنی وابستگی اور روحانی دل بستگی بن جاتی ہے، اس کے مطالبے نہیں کیے جاتے، اس کے ثبوت نہیں مانگے جاتے۔ ساری قومی زندگی کی خوش نیتی، اور خوش عملی، منصفانہ خوش معاملگی اور برادرانہ رواداری ایسے ایک بے ساختہ فطری کیفیت کی طرح ہر شہری کے ذہن میں رچا دیتی ہے وحدت قومی کا جذبہ نہ دو زبانیں ماننے سے مرتا ہے نہ خالی فقرہ بازیوں، طفل تسلیوں یا دھمکیوں سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم کہ آج اپنی آزاد قومی زندگی کے ابتدائی دور سے گزر رہے ہیں، ہمیں اس گر کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ وحدت قومی کا نام دل میں نفرت اور کینہ رکھ کر نہیں لینا چاہیے اس کے لیے زبان کو شدھ کرنے کی ضرورت نہیں دل کو صاف کرنا لازم ہے۔

پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو تو کوئی الگ زبان نہیں وہ تو ہندی کا ایک خاص اسلوب ہے۔ یا مظہر العجائب! اس زبان کی حمایت مسلم لیگی ذہنیت کا مظاہرہ بھی ہے

اس کے حامیوں کو ہجرت کا مشورہ بھی ہے، وہ بدیشی زبان بھی ہے ایک غیر ملکی تسلط کی ناقابل برداشت یادگار بھی ہے، اور وہ کوئی الگ زبان بھی نہیں ہے یہ خوب ہے صاحبو! اس سے ٹھنڈا اس سے گرم، دونوں قسم کے الزام تو درست نہیں ہو سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو اور ہندی ایک جڑ سے نکلے ہوئے دو تنے ہیں لیکن دونوں تنے الگ الگ بڑھے ہیں، یہ دونوں زبانیں ایک ہی سوت سے پھوٹے ہوئے دو دھارے ہیں، مگر یہ دونوں دھارے الگ الگ بہتے رہے ہیں اور اپنی موجودہ صورت میں ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ اس لیے اردو بولنے والوں کے مطالبہ کو ان کی زبان کو اس کا واجب حق ملنا چاہیے۔ یہ کہہ کر ٹالنا کہ اردو تو ہندی کا محض ایک اسلوب ہے، ذہنی دیانت کا پتہ نہیں دیتا۔ اس وقت تو اردو ایک علیحدہ زبان ہے جو ہندستان کی دوسری زبانوں کی بہ نسبت مشترک قواعد کی وجہ سے ہندی سے قریب تر ہے۔ مگر ہر صورت میں اس کا لہجہ، محاورہ اور اس کے ادبی اسالیب ہیں جو اسے ہندی سے ممتاز کرتے ہیں اور نئی ہندی جس ڈگر پر ڈالی جا رہی ہے۔ افسوس ہے کہ اس سے یہ فرق بڑھ ہی رہا ہے، گھٹ نہیں رہا ہے۔ یہ تو معروف عام ہے کہ دستور ہند نے اردو کو دوسری بڑی ہندستانی زبانوں کے ساتھ ایک علیحدہ زبان تسلیم کیا ہے۔

دلیل میں اسی قسم کا ایک نکتہ وہ لوگ بھی نکالتے ہیں جو فرماتے ہیں کہ اردو کو علاقائی زبان بنانے کے کیا معنی؟ اس کا علاقہ کہاں ہے؟ اس نکتہ کے سلسلہ میں ایک لطیفہ بیان کروں تو معاف فرمائیں۔ ابھی دو روز ہوئے اسی مسئلہ پر ایک دوست سے گفتگو ہو رہی تھی، ان کے ہاتھ میں اقبال کے بال جبریل کا نسخہ تھا۔ انھوں نے جھٹ اسے کھولا اور بتایا کہ بہ نیت فال کھولا ہے تو اس قطعہ کا دوسرا شعر سامنے آیا۔

وہی اصل مکان و لامکاں ہے
مکاں کیا شے ہے، انداز بیاں ہے
خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے!

بہرحال یہ درست ہے اور بجا کہ اردو ان معنوں میں علاقائی زبان نہیں ہے

جن معنوں میں بنگالی، تامل یا مراہٹی ہیں۔ اس کی نوعیت ایک کل ہند زبان کی بھی ہے۔ ملک میں ہر جگہ ہر کونے میں اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں اور اردو والوں کا یہ مطالبہ بھی ہرگز نہیں کہ اتر پردیش کا کوئی علاقہ اردو کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ اور نہ یہ مطالبہ ہے کہ ہندی کو ہٹا کر کسی علاقہ میں اردو کو جگہ دی جائے۔ صورت حال مختصراً یہ ہے کہ اس وقت اتر پردیش میں پڑھے لکھے لوگوں میں تقریباً ۲۵۔ ۳۰ فیصد اپنی تمام ضروریات کے لیے اردو کو استعمال کرتے ہیں اور ان میں سے بہت تھوڑے لوگ ہیں جو ہندی سے بھی واقف ہیں۔ اتر پردیش کی سرکار نے زبان کے بارے میں جو قانون بنایا ہے اور عام طور پر اردو کے ساتھ جو رویہ رکھا ہے اس سے ان ۲۵۔ ۳۰ فیصدی پڑھے لکھے لوگوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود یہ گویا ان پڑھ ہیں۔ اتر پردیش میں جہاں اردو پھلی پھولی اور پروان چڑھی اس کو دبانے اور مٹانے کی کوشش سخت ناانصافی ہے۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں؟ اردو ہندی میں رقابت کی کوئی وجہ نظر آتا۔ دونوں ساتھ ساتھ ترقی کر سکتی ہیں۔ ایک کی ترقی سے دوسرے کا کوئی نقصان نہیں۔ ہندی کو چونکہ اتر پردیش کی اکثریت استعمال کرتی ہے اس لیے لازمی طور پر سرکاری اور غیر سرکاری کاروبار میں اس کا رواج زیادہ ہوگا لیکن اردو کو بھی ایک معتد بہ تعداد استعمال کرتی ہے اس لیے اس کو بھی سرکاری کاروبار میں ایک جگہ ضرور ملنی چاہیئے۔ سرکاری نظام کو ساری آبادی کا خیال رکھنا لازم ہے اور انتظام ایسا ہونا چاہیئے کہ پردیش کی سب آبادی کو فائدہ اور آرام ہو۔ اگر اس مسئلہ پر ہمدردی اور انصاف سے غور کیا جائے تو مجھے اس کے حل میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی۔ میری رائے میں حکومت کو یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ۔

(۱) سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اگر کوئی شخص اردو میں کوئی درخواست دے تو وہ قبول کی جائے۔

(۲) سرکار کے اہم اعلانات اور قوانین اردو میں شائع ہوں تاکہ جو لوگ ہندی سے پوری طرح واقف نہیں ہیں وہ ان سے بے بہرہ نہ رہیں۔

(۳) ابتدائی تعلیم میں اردو کو بھی ذریعہ تعلیم تسلیم کیا جائے اور جہاں اردو میں پڑھنے والے طلبا کافی تعداد میں ہوں، اردو کے ذریعہ سے ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا جائے

مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کا ہونا مسلّمہ تعلیمی اصول ہے اور سرکاری طور پر بھی تسلیم کیا جارہا ہے۔ مادری زبان کا تعین ظاہر ہے کہ بچہ یا بچی کا سرپرست کرے گا۔

(۴) ثانوی تعلیم کے جو مدارس اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانا چاہیں ان کی راہ میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ ڈالی جائے اور انھیں بھی انہی قواعد اور اصول کے مطابق سرکاری امداد ملے جو عام طور پر دوسرے ثانوی مدرسوں کے لیے نافذ ہیں۔

(۵) اعلیٰ تعلیم اور علم و ادب کے جو ادارے اردو کی تعلیم اور ادبی ترقی کے لیے اس وقت موجود ہیں یا آئندہ قائم ہوں ان کو سرکار کی طرف سے معقول مدد ملے۔

(۶) اس علاقہ کی کم سے کم ایک یونیورسٹی میں اردو کو رفتہ رفتہ ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔

(۷) ہندستانی اکاڈمی سے اردو کو خارج کرنے کی کوشش جاری ہے اس کا سدِّباب کیا جائے اور اردو ادیبوں کو جو نمائندگی اس میں حاصل تھی اس کو برقرار رکھا جائے۔

(۸) سرکار کی طرف سے ہندی کے ادیبوں کو ہر سال انعام دیئے جاتے ہیں، یہ بہت اچھی بات ہے۔ اسی طرح اردو ادیبوں کو بھی انعامات دیئے جائیں تاکہ ان کی بھی ہمت افزائی ہو۔

اور سب سے اہم بات، سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ اردو کی طرف سے عام رویہ بدلا جائے، اور زبان و ادب اور اردو داں شہریوں کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے، انھیں اجنبی نہ سمجھا جائے، اور ہر طرح کے تعصب سے قطع نظر کرکے اردو کو ملک کی ایک اہم زبان جان کر، اترپردیش سے اس کے خاص تعلق کو سامنے رکھ کر، اس کی ترقی میں ہر ممکن مدد دی جائے، تعلیم میں آسانیاں فراہم کی جائیں، اور سرکاری کاروبار میں اسے جگہ دی جائے۔

اب میں ہندی کے حامیوں اور ہندی کے ادیبوں سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔
ہندی کے حامی دوستو! اترپردیش کے ساتھی شہریو! میرا اندازہ ہے کہ ہماری اس کوشش کو جو ہم اردو کے لیے کچھ حق مانگنے کے سلسلے میں کر رہے ہیں، آپ میں سے بہتوں نے غلط سمجھا ہے۔ اس غلطی کی وجہ میں سمجھتا ہوں، لیکن باوجود اس کے صحیح طور پر بات کو سمجھنے کی ذمہ داری ہٹ نہیں جاتی۔ اردو ہندی کا جھگڑا ایک مدت تک ہمارے

دیس میں ہندو مسلمان کا جھگڑا بنا رہا۔ اس تاریخ کو بھلانا مشکل ہے۔ مگر ہم اب آزاد ہیں اور ہمارے مسائل اب وہ نہیں جو پہلے تھے۔ ہمیں ان جھگڑوں کو بھولنے کی کوشش کرنا چاہیے ورنہ ہم اپنی نئی زندگی کی تعمیر میں بڑی غلطی کریں گے۔ ہم نے جو آزادی حاصل کی ہے وہ کچھ کرنے کے لیے کی ہے۔ ہم ایک خاص انداز کی زندگی اپنے دیس میں چاہتے ہیں۔ جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمارے دستور میں ہے۔

اس زندگی کی بنیاد ہے بے تعصبی پر مل جل کر کام کرنے پر اس پر کہ کسی طبقہ کا غلبہ کسی طبقہ پر نہ ہو، کسی کی طاقت کے لیے کسی کی کمزوری ضروری نہ مانی جائے۔ میں نے اوپر جو باتیں کہی ہیں اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میرے سامنے اپنے دیس والوں کی زندگی کا کیا نقشہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نقشہ آپ میں سے اکثر کو ناپسند نہ ہوگا اگر ایسا ہے تو آپ کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اردو ہندی کی رقیب ہے۔ آپ کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اردو کی ترقی سے ہندی کا کوئی بھی نقصان ہے۔ ہندی تو سارے دیس کی سرکاری زبان ہے۔ اتر پردیش کی بھی سرکاری زبان ہے۔ دیس کی دوسری زبانوں کی ترقی سے اس کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے اس کا تو اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ ملک کی ساری زبانوں کے خزانے اس، قومی زبان میں آئیں گے، ان کے خزانے کے ساتھ ساتھ ہندی کا خزانہ بڑھے گا۔ آپ کو پچھلی ناگوار باتوں کو چھوڑ کر آگے دیکھنا چاہیے دیس کے کچھ بسنے والوں کے ساتھ ایسا سلوک تو نہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے کو پردیسی محسوس کریں۔ میں آپ سے ایک ساتھی کی طرح، بھائی کی طرح یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ اردو کو اس کا حق آپ دلائیے۔ اس کے لیے آپ کوشش کیجیے۔ ہندی کے لیے اس سے سارے دیس میں وہ راہیں کھلیں گی جن کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہندی دلوں میں گھر کرے گی۔ سرکاری مدرسوں کی گشتی چٹھیوں کے ذریعہ نہیں پھیلے گی۔ قومی زندگی کی نیو مضبوط ہوگی۔ اچھی زبان اسی طرح چھوٹی چھوٹی ضدوں، اور ادنیٰ خود غرضیوں کو چھوڑ کر اخلاقی مطالبوں کی حمایت سے آگے بڑھتی ہے، مضبوط ہوتی ہے۔ جمہوری ریاست میں یہ فرض شہریوں پر آتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے اس فرض کو پورا کریں گے۔ سارے دیس کی زندگی پر یہ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

ہندی زبان کے ادیبو! اس ڈیڑھ برس میں جب سے اردو کو اتر پردیش میں علاقائی زبان بنوانے کی کوشش شروع ہوئی ہے بہت سے لوگوں نے اس کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ اس کام کے متعلق بھی، خود میرے متعلق بھی۔ بزرگوں نے، دوستوں نے اچھی طرح جاننے والوں نے، بالکل انجان لوگوں نے۔ میں نے بھی ان کی برابر رکھی۔ کسی کو کوئی جواب نہیں دیا۔ نیت پر بھی حملے ہوئے۔ ساری زندگی جو اپنے ایک طرز پر گزاری ہے اس کو دو جملوں میں ختم ہوتے سنا، مگر آپ جانتے ہیں میں نے ایک لفظ اس کے جواب میں نہیں کہا۔ آج بھی کسی سے جھگڑا مول نہیں لوں گا۔ مگر آپ سے کچھ گلا کرنے کو جی ہوتا ہے۔ آپ لوگ قوم کی قدروں کے رکھوالے ہیں، زندگی کے اندھیاروں کو روشن کرنے والے ہیں۔ اس کی پستیوں کو دکھا کر ان سے بیزاری پیدا کرنے والے اور بلندیوں کی طرف ابھارنے والے ہیں۔ آپ کی نظر آج ہی پر نہیں کل پر بھی ہے۔ اس نئے آزاد دیس اور اس نئی قوم کے مستقبل کی جو شکل آج آپ کے خیالوں میں ہے، آپ کی کتابوں میں، آپ کی کویتاؤں میں۔ آپ کے گیتوں میں ہے وہ بہت کچھ کل زندہ جاگتی حقیقت بن جائے گی۔ جب آپ میں سے بعض نے اس تحریک کو پھوٹ ڈالنے کی تحریک، قومی وحدت میں رخنہ ڈالنے کا منصوبہ سمجھا تو بڑا دکھ ہوا۔ کبھی ہوتا ہے کہ لوگ پتھروں کی بوچھار کرتے ہیں اور ذرا دکھ نہیں پہنچتا اور کوئی ایک پھول پھینک کر مارتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ زخم پڑ گیا۔ یہ شاید اس لیے ہے کہ پتھر کون پھینک رہا ہے اور پھول سے کس نے مارا ہے۔ آپ سے بس اتنا ہی کہنا تھا کہ آپ کے پھول سے دکھ ہوا بس اتنا ہی گلا ہے۔ اب یہ التجا ہے کہ اس تحریک کو اس کی حقیقت میں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اور اگر اس کو انصاف پر پائیے تو اس کو سہارا دیجیے اور اس کی مانگ کو منوائیے ہندی کے ادیب ہندی والے ہی نہیں ہیں۔ وہ اردو والے بھی ہیں، پنجابی والے بھی، وہ دیس والے ہیں، سچائی والے ہیں، انصاف والے ہیں۔ آپ کے ایسا کرنے سے ہندی کو کیا فائدہ ہوگا اور اردو کو کیا اس کو اس وقت سوچنا بھی نہیں۔ یہ جانتا ہوں کہ اس نئی قوم کے مستقبل کے لیے جس کی روح اور جس کے ذہن پر آپ کا ایک ایک لفظ اثر ڈالتا ہے۔ آپ ایک بڑی خدمت انجام دیں گے۔ آپ کو لوگوں کی تالیوں کی اور

بے کاروں کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو ووٹ بھی شاید ہی کبھی درکار ہوں۔ یہ بات پھر آپ اڑ سکتے ہیں۔ آپ اڑیں گے تو آپ کو کوئی مسلم لیگی بھی نہ کہہ سکے گا۔ اردو کو اس کا حق دلا دیجئے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ بھروسہ اور محبت کے ایسے سوتے ہمارے دیس میں پھوٹتے ہیں جن سے ساری قومی زندگی سیراب ہو گی۔ ایک طرح سے زندگی کی رت ہی بدل جائے گی۔ اردو والے ہی نہیں سمجھیں گے کہ آپ نے کیا کیا، سارے دیس میں جو جگہ جگہ یہ ڈر ہے، غلط ڈر کہ ہندی اپنے سیاسی اثر سے دوسری زبانوں کو نقصان پہنچا سکتی ہے یا پہنچانا چاہتی ہے دیکھتے دیکھتے مٹ جائے گا۔ اور ذہنی تعاون کی ہزار راہیں کھل جائیں گی۔ اور جب آپ ہمدردی سے اس مسئلہ کو دیکھیں گے کہ اردو ادب کا مطالبہ خود ہندی والوں کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے اور اردو کی ترقی کسی طرح ہندی کی ترقی میں رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی۔ آپ پر روشن ہوگا کہ اردو ہندی کے جھگڑے نے ان کے باہمی فرق کو جان بوجھ کر بڑھانے کی جو کوشش کرائی ہے اس سے دونوں زبانوں کو نقصان پہنچا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اردو کو کم ہندی کو زیادہ پیچھے دیکھنے کی عادت پیدا کی ہے، آگے سے غافل کیا ہے۔ زبان کو دونوں اور عالموں کے چھوٹے چھوٹے طبقوں کی چیز سمجھ کر بہت سا کام ہوا ہے اور ان کروڑوں آدمیوں کو بھلا دیا گیا ہے۔ جن کے ذہنوں کو روشن کرنا ادیبوں کا فرض ہے۔ اس میں بہت کچھ آپس کی ضد میں ہوا ہے۔ یہ ضد ہٹ جائے تو کیا عجب ہے کہ اتر پردیش کے سارے علاقہ میں ایک سادہ مدھر اور کومل بھاشا کا رواج ہو۔ اس لیے کہ بناوٹی کٹھن اور بوجھل زبان کو کچھ عرصہ تک تو زبردستی لادا جا سکتا ہے لیکن زبانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی زبان بہت دنوں تک ترقی نہیں کر سکتی۔ اردو کے مسئلہ پر تاریخی اتفاقات نے جو پردے ڈال دیئے ہیں ان کو ہٹا کر اس مسئلہ کی حقیقت کو دیکھیں اور اس کے حل کرنے میں مدد دیجئے۔ آپ پر بڑی ذمہ داری ہے۔

آخر میں ایک بار پھر ان مخلص کارکنوں کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے دستخط حاصل کرنے کی اس مہم میں انجمن کا ہاتھ بٹایا۔ خصوصیت کے ساتھ پنڈت کشن پرشاد کول، جناب حیات اللہ انصاری صاحب، اور بیگم حیات اللہ کا جن کی پرخلوص محنت

جن کی تدبیر سے یہ کام انجام کو پہنچا بڑی ہمت کا کام کیا آپ نے، بڑی خوبی سے، بڑی خاموشی اور ضبط سے اب ہم اس محضر کو صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کریں گے، اس یقین کے ساتھ کہ ہماری جائز مانگ مان لی جائے گی لیکن میرے دل میں آپ کے کام پر شکر گزاری کا جو سچا احساس ہے اس کا حق ادا نہ ہوگا۔ اگر میں آپ سے اپنے دل کی ایک بات نہ کہہ دوں وہ یہ کہ اگر ہمارا مطالبہ پوری طرح مان لیا جائے تب بھی ہمارا کام ختم نہیں ہوگا۔ زبان کی ترقی کے راستے بس وہی نہیں ہیں جن پر حکومت کی مدد سے چلا جا سکے۔ میں اس خیال کا آدمی ہوں کہ اگر یہ سب راستے بند کر دیئے جائیں تو بھی ہماری کوشش سے اردو اتر پردیش میں زندہ ہی نہیں رہ سکتی ترقی بھی کر سکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ سب راستے کھل جائیں اور ہماری پست ہمتی سے اردو کی ترقی ہی ختم نہ ہو جائے بلکہ خود اردو ختم ہو جائے۔ زبان کا مستقبل اس کے بولنے والوں، اس کے لکھنے والوں، اس کے شاعروں، اس کے ادیبوں، اس کے معلموں کے ہاتھ میں ہے اور ان کی سعی کے راستوں کی درستی پر۔ اگر یہ لوگ زبان اور اس کے ادب کو چند خواص کا اجارہ سمجھیں گے تو اس جمہوری دور میں زبان آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ زبان کی ترقی کے اہم کاموں میں زبان کی ترویج ہے اس ملک میں جہاں پڑھے لکھوں کی تعداد بہت کم ہے ترویج کے کام میں بڑی گنجائش ہے۔ آپ کو جب اپنی زبان کے مستقبل سے اتنی دلچسپی ہے تو میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس کی ترقی کی راہوں پر غور کریں اور ان پر چلنے کی تدبیریں نکالیں۔ یہ اردو کا کام ہی نہیں ہندستان کا کام ہے!

اُردو کا
تاریخی محضر

جسے انجمن ترقی اُردو (ہند) کے ایک وفد نے ۱۵ فروری ۱۹۵۴ء کو صدرِ جمہوریۂ ہند
کی خدمت میں پیش کیا
(وفد کی قیادت ڈاکٹر ذاکر حسین نے کی تھی)

عالیجناب صدر جمہوریہ ہند، نئی دلّی!

جناب والا!

آل انڈیا انجمن ترقی اردو اور اترپردیش کی اردو بولنے والی آبادی کی جانب سے ہم ممبران وفد نہایت ادب سے جناب والا کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے ہم جناب والا سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں بعض امور کی تصریح کرنے کی اجازت عطا فرمائیں جو حال ہی میں ہمارے وفد کے مقصد کے متعلق زیر بحث آئے ہیں۔ جن میں سے بعض امور میں کسی قدر غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارے ملک کے دستور کے فقرے ۳۴۳ کی رو سے قرار پایا ہے کہ، "یونین کی سرکاری زبان دیوناگری رسم الخط میں ہندی ہو گی"

آل انڈیا انجمن ترقی اردو اور سب لوگ جن کی ہم نمائندگی کرتے ہیں اور دیوناگری رسم الخط میں ہندی پڑھنا اور فقرہ ۳۵۱ میں جو طریقہ بتایا گیا ہے اس طرح ہندی زبان کی ترقی اور ترویج میں مدد کرنا اپنا اور ہندوستان کے ہر شہری کا فرض سمجھتے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں اتر پردیش کی قانون ساز جماعتوں نے دستور کے فقرے ۳۴۵ کے تحت قانون بنا کر دیوناگری رسم الخط میں ہندی زبان کو ریاست کی تمام سرکاری اغراض میں استعمال کرنے کے لیے اختیار کر لیا لیکن اس فیصلہ میں جو نقص بے ضرر تھا، اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا کہ اس علاقہ میں اردو زبان اور رسم الخط بھی رائج ہے۔ ہم قانون ساز جماعتوں کے فیصلے کو فرض شناسی کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ہم محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ حالات میں اردو کے متعلق اس فیصلہ میں فقرہ ۳۴۵ کے تحت صدر کے ہدایات نامہ کے ذریعہ سے اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی غرض سے ہم نے جناب والا سے رجوع کرنے کی جرأت کی ہے۔

ایک ایسے بلند مقام صاحب علم و فضل کے روبرو جیسے کہ جناب ہیں، ہم اس بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتے کہ آیا ہندی اور اردو دو مختلف زبانیں ہیں یا ایک ہی بنیادی زبان کے دو ادبی اسلوب ہیں، ہمارے مقصد کے لیے یہی کافی ہے کہ موجودہ حالات کے متعلق واقعیت پسند اور حقیقی نقطۂ نظر اختیار کر کے دستور کی آٹھویں فہرست میں ہندی اور اردو دونوں کو ہندستانی زبانوں میں شمار کیا گیا ہے۔ ہماری گزارش یہ ہے کہ اردو زبان جس نے صدیوں کے دوران میں ایک ایسا اسلوب اور ادب پیدا کر لیا ہے جس پر کوئی قوم بھی فخر کر سکتی ہے، آج اتر پردیش میں تمام مذہبوں اور فرقوں کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی بولی ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ان کی مادری اور ادبی زبان ہے۔ یہ سب لوگ باوجودیکہ ——— دیوناگری رسم الخط میں ہندی زبان کو سیکھنا پڑھنا اور لکھنا ضروری سمجھتے ہیں، پھر بھی اردو کو اسی کے رسم الخط میں لکھتے پڑھتے ہیں اور نہایت معقول وجوہ کی بنا پر چاہتے ہیں کہ یہ قومی وراثت محفوظ رہے۔ اس سلسلہ میں ہم حکومت ہند کے رزولیوشن مورخہ ۱۰ر اگست ۱۹۴۹ء کی طرف جناب والا کی توجہ مبذول کرانے کی اجازت چاہتے ہیں جس میں بنیادی مدارس میں تعلیم کے متعلق حکومت کی پالیسی کا تعین کیا گیا ہے۔ اس رزولیوشن کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

• جونیر بنیادی منزل پر تعلیم اور امتحان کا ذریعہ بچے کی
مادری زبان ہونا چاہیے، جہاں علاقائی اور سرکاری زبان سے
مادری زبان مختلف ہو وہاں مادری زبان میں تعلیم دینے کا
یہ انتظام کرنا چاہیے کہ جب تمام مدرسہ میں اس زبان کے بولنے
والے ۴۰ طلبا سے کم یا ایک درجہ میں ۱۰ سے کم نہ ہوں تو ایک استاد
ان کی تعلیم کے لیے مقرر کیا جائے۔ مادری زبان وہی مانی جائے
گی جس زبان کو طالب علم کے والدین یا سرپرست کہیں یا یہ اس
کی مادری زبان ہے۔"

اس پالیسی کی اتر پردیش کے چیف منسٹر نے بھی (ایک مراسلہ میں جو انھوں نے مسٹر زیڈ۔ ایچ لاری کو، جو اس وقت لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن تھے بھیجا تھا) تصدیق کی اور پھر اتر پردیش کے سکریٹری تعلیمات شری اے۔ این سپرو نے بھی اس پالیسی پر اپنے مراسلہ موسومہ میں ڈائرکٹر تعلیمات پر زور دیا تھا لیکن باوجود اس کے شری آر۔ ایس سنہا نے جو جبری تعلیم کے خاص آفیسر تھے میونسپل بورڈوں کے چیرمینوں کو حسب ذیل تحریر بھیجی۔

"مجھے یہ کہنے کی ہدایت ہوئی ہے کہ حکومت کا حکم یہ ہے کہ
تمام ابتدائی مدرسوں میں ہندی کو لازمی مضمون ہونا چاہیے
اردو کی تعلیم پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اگر اردو کو پڑھانا چاہیں
تو وہ ایک اختیاری مضمون ہو لہٰذا تمام طلبا پر بلا لحاظ ذات
اور قوم لازم ہوگا کہ وہ ہندی پڑھیں اور وہی نصاب کے دوسرے
مضمونوں کے پڑھانے کا ذریعہ ہو۔"

یہ حکومت ہند کی ہدایت اور ریاستی حکومت کے مقصد کی ایک خلاف ورزی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو تمام میونسپل اسکولوں سے خارج ہو گئی۔ اسی زمانہ میں ان اسکولوں میں بھی جو ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ماتحت تھے اردو کی تعلیم روک دی گئی اور باوجود بار بار معروضے اور یاد دہانیاں کرانے کے ریاستی حکومت اس بے انصافی کو رفع نہ کر سکی اس سب کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان بچوں کو جن کی مادری زبان اردو ہے، بنیادی تعلیم بھی

مادری زبان میں حاصل کرنے کی اجازت نہ رہی اور اس طرح اردو ریاست کے تمام بنیادی مدرسوں کے ابتدائی درجوں سے بھی خارج ہو گئی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز یہ واقعہ ہے کہ بہت سے بچوں کی مادری زبان، جو کل تک ان بنیادی اسکولوں میں اردو لکھی ہوئی تھی، بچوں کے سرپرستوں سے مشورہ کئے بغیر ہی ایک ہندی ہو گئی۔ جب یہ صورت حال انجمن ترقی اردو کے علم میں آئی تو اس نے ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ وہ اس معاملہ کی تحقیقات کرے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ جب انجمن کو وصول ہو گئی اور اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ لوگوں کی شکایتیں جائز ہیں، تب انجمن نے فیصلہ کیا کہ اس کے اراکین کا ایک وفد بہ سرکردگی ڈاکٹر ذاکر حسین صدر انجمن ۲۲ مئی سنہ ۱۹۵۱ء کو ڈاکٹر سمپورنانند کی خدمت میں حاضر ہوا جو اس وقت اتر پردیش کے وزیر تعلیم تھے۔ یہ وفد اپنے ساتھ صرف شہر لکھنؤ کے دس ہزار سے زیادہ سرپرستوں کی درخواستیں لے گیا، جو چاہتے تھے کہ اردو زبان کے ذریعے سے ان کے بچوں کی تعلیم ہو۔ اس وفد سے وزیر صاحب نے ہمدردانہ طریقہ پر ملاقات کی۔ اس کی شکایت کے جواز کو تسلیم کیا اور از راہ مہربانی تسلیم کیا کہ جبریہ تعلیم کے خاص افسر شری سنہا نے جو گشتی جاری کی تھی وہ حکومت کی پالیسی کے مطابق نہ تھی۔ وفد کو اس کا یقین دلایا گیا کہ آئندہ سیشن کے آغاز کے ساتھ ہی یعنی جولائی سنہ ۱۹۵۱ء سے یہ خرابیاں رفع کر دی جائیں گی۔ لیکن یہ وعدہ کبھی وفا نہ ہوا۔ موجودہ وزیر تعلیم نے بھی ۱۴ جولائی سنہ ۱۹۵۲ء کو لیجسلیٹو کونسل میں اس وعدہ کو دہرایا اور صاف فرمایا کہ ڈائرکٹر تعلیمات کو یہ ہدایات دے دی گئی ہیں کہ اگر کسی مدرسہ میں ۴۰ بچے ایسے ہیں جو اردو میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہاں اس کا انتظام کیا جائے۔ لیکن ان ہدایات پر بھی عمل نہیں ہوا۔ اور حالات اب بھی وہی ہیں جو تھے۔ ۱۷ اگست سنہ ۱۹۵۲ء کو امتحاناً ایک درخواست جس پر مصاحب گنج اسکول کے، جو لکھنؤ کے حلقۂ دولت گنج میں ہے، طلبا کے ۴۹ سرپرستوں کے دستخط تھے، وزیر تعلیمات اور میونسپل بورڈ لکھنؤ کے سپرنٹنڈنٹ تعلیم کی خدمت میں پیش کی گئی۔ اس درخواست میں استدعا کی گئی کہ چونکہ ان کے بچوں کی مادری زبان اردو ہے۔ اس لیے ان کو اسی زبان میں تعلیم دی جائے۔ اس درخواست کا کوئی جواب نہیں ملا اور نہ مطلوبہ انتظام کیا گیا۔

اس سلسلہ میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ نارمل اسکولوں میں بھی طریقۂ تعلیم اس طرح بدل دیا گیا ہے کہ وہاں بھی اردو کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ پہلے تو ابتدائی مدارس کے استادوں کے لیے لازمی تھا کہ ہندی اور اردو دونوں زبانیں جانتے ہوں مگر اب اردو کے استادوں کی تربیت بھی بدل گئی ہے۔ علاوہ بریں ہندی اور اردو کی نصابی کتابوں کی اشاعت میں ایک غیر منصفانہ امتیاز قائم کر دیا گیا ہے۔ محکمۂ تعلیم نے ہندی کی نصابی کتابوں کے لیے ٹنڈر طلب کئے اور ناشروں کو ہر کتاب کی ایک معینہ تعداد کے چھاپنے کی ہدایت کر دی اس طرح ان کتابوں کی فروخت کا بھی گویا ذمہ لے لیا۔ برخلاف اس کے اتر پردیش کے ڈائرکٹر تعلیم نے ایک گشتی اس مضمون کی نکال دی ہے کہ ناشر اگر اردو کی نصابی کتابیں چھاپیں تو وہ نقصان اور فائدے کے خود ذمہ دار ہوں گے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب اردو کی نصابی کتابیں شاید ہی بازار میں مل سکیں۔

ان حالات میں ہمارے لیے کوئی دوسرا دستوری راستہ کھلا ہوا نہ تھا سوائے اس کے کہ ہم دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت جناب والا کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اس دفعہ کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

> "اگر ایسا مطالبہ کیا جائے اور پریذیڈنٹ کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ ریاست کی آبادی کا ایک معقول حصہ چاہتا ہے کہ اس زبان کو استعمال کرے جو وہ بولتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ ریاست بھی اس کو تسلیم کرے تو انھیں یہ اختیار ہے کہ وہ یہ ہدایت کریں کہ ایسی زبان تمام ریاست میں یا اس کے کسی حصہ میں ایسے کاموں کے لیے جن کی وہ تصریح کر دیں سرکاری طور پر تسلیم کی جائے"

مندرجہ بالا دفعہ کی شرائط کو پورا کرنے کے لیے انجمن نے فیصلہ کیا کہ ایسے بالغوں کے دستخط جمع کرے جو یہ چاہتے ہیں کہ اردو زبان اتر پردیش میں تسلیم کی جائے۔ بلاکھ

پچاس ہزار سے زیادہ دستخط جمع کر لیے گئے ہیں، دستخط کرنے والوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے خاندانوں میں نابالغوں کی تعداد کیا ہے۔ ایسے نابالغوں کی تعداد ۲۲ لاکھ سے زیادہ ہے۔

عام جلسوں، مظاہروں اور نعروں سے بہت احتیاط کے ساتھ پرہیز کیا گیا۔ اس طرح جو دستخط حاصل ہوئے ہیں ان کو ضلع وار اور قوم وار چھانٹ لیا گیا ہے اور جو دستخط مشتبہ سمجھے گئے ان کو بہت محتاط ــــــ جانچ کے بعد خارج کر دیا گیا ہے۔ یہ کام ایک منظم طریقہ سے کم و بیش مردم شماری کی طرح کیا گیا ہے۔

ہمیں یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ اردو زبان اور اس کے ادب نے "ہندستان کے مشترکہ کلچر" کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے اور وہ اب بھی اس کلچر کا ایک اہم عنصر ہے۔ اس نے اتر پردیش کی مشترکہ تہذیب، مشترکہ زندگی اور مشترکہ سماجی روایات کی ترقی میں بھی خاص طور پر بہت قابل قدر حصہ لیا ہے۔

ہم یقین کرتے ہیں اور نہایت خلوص کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ اردو زبان اپنے سیر حاصل ذخیرۂ الفاظ اپنی حسین روزمرہ اور شاندار طرز بیان اور ہمہ گیر اور ترقی پسند ادب کے ذریعہ سے اب بھی دستور کی دفعہ ۳۵۱ کے مطابق یونین کی سرکاری زبان ہندی کے ضمن میں اضافہ کرنے اور اسے مالا مال کرنے اور اس کی ترقی کی تکمیل میں جس کے متعلق دفعہ مذکورہ میں لکھا ہے کہ وہ اس طرح ترقی کرے کہ "ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے تمام عناصر کے لیے اظہار خیال کے ذریعہ کا کام دے" بہت اہم حصہ لے سکتی ہے۔

لہٰذا ہم اتر پردیش کے اردو بولنے والوں کی طرف سے "جو ریاست کی آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ ہے"۔ جیسا کہ اس یادداشت کی تائید میں ۲۰ لاکھ سے زیادہ دستخطوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ استدعا کرتے ہیں کہ جناب والا مہربانی فرما کر دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت ہدایت جاری فرمائیں کہ اردو زبان بھی اتر پردیش میں ایک علاقائی زبان تسلیم کی جائے اور اس طریقہ سے سرکاری کاموں میں استعمال کی جائے کہ وہ حسب ذیل مقاصد کو پورا

کر سکے۔

(۱) ایسے بچوں کے لیے جن کی مادری زبان اردو ہے ابتدائی درجہ میں وہ ذریعہ تعلیم ہو اور جہاں کہیں اردو بولنے والے بچوں کی تعداد کافی ہو یعنی ہر کسی مدرسہ میں ہو یا کسی کلاس میں وہاں اردو کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے۔ ایسے مقامات پر جہاں اردو بولنے والی آبادی زیادہ ہے ایسے اسکول قائم کئے جائیں جن میں ذریعہ تعلیم اردو ہو۔ اس کا فیصلہ کہ بچہ کی مادری زبان کیا ہے اس کے والدین یا سرپرستوں کے کہنے کے مطابق ہونا چاہیئے۔

(۲) ابتدائی درجوں میں اردو کے ذریعہ تعلیم دینے کی قابلیت رکھنے والے استاذوں کو کافی تعداد میں تربیت دینے کے انتظامات کیے جائیں۔

(۳) ایسے انتظامات کیے جائیں کہ اردو زبان میں کافی نصابی کتابیں مہیا ہوسکیں۔

(۴) ایسے ثانوی مدارس کو جو اردو کے ذریعہ تعلیم دیتے ہوں ریاست تسلیم کرے اور دوسرے ثانوی مدارس کی امداد دینے کے جو قواعد ہوں ان ہی کے مطابق ان مدارس کو بھی سرکاری امداد دی جائے۔

(۵) ہر پردیش میں کم از کم ایک یونیورسٹی ایسی ہو جہاں اردو زبان کو بتدریج ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

(۶) اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرنے والے اور اردو کے ذریعہ سے ادب اور سائنس کی اشاعت کرنے والے مشہور اداروں کو کافی مالی امداد ملنی چاہیئے۔

(۷) اردو کے ایسے اہل قلم اور اہل علم کی، جو اپنی قابلیت کی وجہ سے ممتاز ہوں، ریاستی حکومت کی طرف سے انعامات اور عطیات کے ذریعے سے ہمت افزائی کی جائے۔

(۸) ہندستانی اکیڈمی میں اردو کے اہل قلم کو کافی نمائندگی دی جائے۔

(۹) سرکاری اور سرکاری امداد پانے والے کتب خانوں کے لیے اردو کی کتابیں بھی

مہیا کی جائیں۔

(۱۰) اردو میں لکھی ہوئی عرضیاں ریاست کی عدالتوں اور دفتروں میں قبول کی جائیں اور ان پر توجہ کرنے اور ان کا فیصلہ کرانے کی آسانیاں مہیا کی جائیں۔

(۱۱) گورنمنٹ کی شائع کردہ ضروری اطلاعات، قوانین اور مطبوعات اردو میں بھی شائع کی جائیں۔

آخر میں ہم جناب والا کی خدمت میں اس امر پر گہرے تشکر کے اظہار کی اجازت چاہتے ہیں کہ جناب نے ہم کو اپنے حضور میں ایک ایسے مسئلہ کو پیش کرنے کا موقعہ دیا جو ہندستان کی آبادی کے ایک بڑے حصہ کے دلوں کو بہت عزیز ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ جناب والا کی طرف سے ایک لطف آمیز اشارہ بھی اس عظیم الشان سرزمین کے مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد کو مضبوط کرنے میں بڑا کام کرے گا اور ایک دل شاد اور متحد ملک کے نصب العین کے حصول میں معاون ہوگا۔

(معروضہ اراکین وفد انجمن ترقی اردو ہند)

پنڈت کشن پرشاد کول کے ارشادات

سب سے زیادہ مخالفت یا اردو دشمنی کا بازار تو اتر پردیش میں ہی گرم ہو رہا ہے کہ جہاں نہ صرف ایک کثیر جماعت ہندی والوں کی برسرپیکار ہے بلکہ جہاں کی حکومت بھی ہندی والوں کے زیر اثر اردو کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ کم و بیش اسی صورت کا ریاست بہار میں آپ کو سابقہ ہو رہا ہے۔ یہ کام تنظیم کا ہے۔ ہم نے اتر پردیش میں دستخطی مہم کی تحریک چلائی اور کامیابی سے چلائی۔ بیس لاکھ دستخط حاصل کر کے ہم صدر جمہوریہ کی خدمت میں اپنی عرضداشت لے کر گئے۔ مرکزی حکومت بھی اتر پردیش کی حکومت سے بات چیت کر رہی ہے مجھے یقین ہے کہ صدر جمہوریہ کا جواب، بڑی حد تک ہماری موافقت میں ہوگا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ جو کچھ فیصلہ ہو اور ہمارے موافق بھی ہو تو اس کا عمل درآمد تو ریاست کی حکومت کے ہاتھ میں ہوگا۔ وہ پہلے سے بدظنی اور دوسروں کے دباؤ میں ہے۔ جو کچھ کرے گی با دل ناخواستہ کرے گی۔ اس لیے ہمارے پاس سوائے اس کے چارہ کار نہیں کہ ہم ان طریقوں اور اس کے دباؤ سے، جو ہم حکومت پر جائز طور سے ڈال سکتے ہیں، کام لیں کہ وہ ہمارے مطالبے کو پورا کرے۔ اور وہ یہ ہے کہ ابتدائی مدرسوں کے سشن شروع ہوتے ہی ایک دن اور ایک وقت میں ہم بہ۔ ہم لڑکوں کی ٹولیاں بنا کر عرضیوں کے ساتھ محلے کے مدرسوں کے دروازے کھٹکھٹائیں۔ حکومت کو ان کی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔ جہاں دو چار بڑے شہروں میں اردو کے ذریعہ تعلیم ابتدائی درجوں کی از سر نو شروع ہو گئی، ہوا کا رخ بدل جائے گا۔ اور ہماری مہموں کا جو خاص مقصد ہے، حاصل ہو جائے گا۔ یہی منصوبہ ہم اتر پردیش کے لیے سوچ رہے ہیں اور آپ کو بہار میں بھی اگر کامیابی کا منہ دیکھنا ہے تو میں سمجھتا ہوں آپ کو بھی یہی کرنا ہوگا۔ اور کوئی چارہ نہیں۔ کام مشکل ہے لیکن کہیں جب ہم بیس لاکھ دستخطوں کی مہم میں کامیاب ہو گئے اور آپ نے دس لاکھ دستخطوں کی منزل طے کر لی تو ہمارے بڑھتے ہوئے حوصلوں کے آگے میں عرض کروں گا کہ یہ کام بھی مشکل نہیں ہے۔ بچوں کی مادری زبان میں ان کی ابتدائی تعلیم کا انتظام کرنا ہر مہذب ملک میں اس [illegible] حکومت کا کام ہے۔ ہماری حکومت بھی یہ فرض انجام دے رہی ہے۔ بدظنی اور بدگمانی کے اثرات کے تحت اردو میں بچوں کی تعلیم کا سلسلہ فی الحال اتر پردیش اور بہار میں ٹوٹ گیا ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر ہم نے خود کندھا نہ ڈال دیا تو یہ سلسلہ پھر سے جڑ کر رہے گا اور جو ہمارا مطالبہ اور حکومت کا فرض ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔

پنڈت سُندر لال

کے

اِرشاداتُ

کیا غضب ہے یارو، کہا جاتا ہے کہ اردو کوئی زبان ہی نہیں ہے۔ میری ماں اردو بولتی تھی اور میری مادری زبان اردو ہے۔ اب مجھ سے کہا جا رہا ہے کہ تیری زبان ہندی ہے۔ کیا اندھیر ہے، ہم پاگل ہو گئے ہیں۔

مذہبی تعصبات نے سب کو اندھا کر دیا ہے۔ لوگوں کو نہ زبان دکھائی دیتی ہے نہ انسان دکھائی دیتا ہے۔ جو زبان میں بول رہا ہوں، یہ لکھنؤ کی گلی کوچے میں ایک اَن پڑھ اور جاہل مزدور تک سمجھ لے گا۔ اسی کو اردو کہتے ہیں اور یہی زبان میری مادری زبان ہے۔

میں بات صاف صاف کہنا پسند کرتا ہوں، جو دل میں ہو وہ کہنا پسند کرتا ہوں۔ للو پتو اور خوشامد سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں تو ان لوگوں میں ہوں جو وفاداری کا ایک اہم جزو بغاوت مانتے ہیں۔ اس لیے صاف بات کہنا ہی وفاداری ہے۔ میں حکومت کا باغی ہوں، میں مذہب کا باغی ہوں، میرا مذہب عشق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندستانی ہوگی جس کا خواب گاندھی جی نے دیکھا تھا۔ ۔۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا آخری خطبہ

۱۵ر فروری ۱۹۵۸ء کو بہ مقام دہلی

جہاں تک مجھے اندازہ ہوا ہے آج آپ نے یہ مجلس اس لیے منعقد کی ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہندستان کی زندگی میں اردو کی جو جگہ ہے اس کا اعتراف کیا جائے آپ یہ نہیں چاہتے کہ کسی زبان کی جگہ خالی ہو تو اردو کو دی جائے۔

آپ اردو کے موافق ہیں لیکن کسی زبان کے مخالف نہیں ہیں جیسا کہ ابھی میرے دوست پنڈت جی (پنڈت سندر لال) نے کہا ہے کہ یہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو ہندی کا مخالف ہو۔ یہی صحیح اسپرٹ ہے اور اس اسپرٹ سے حل کا راستہ صاف ہوتا ہے۔ آپ کو ایک بنیادی بات کی طرف توجہ دلاتا ہوں آج سے ۳۰۔ ۴۰ برس پہلے زبان کے بارے میں، آپ کو یاد ہوگا، ایک بہت بڑا جھگڑا اٹھا تھا کہ ملک کی زبان کیا ہو۔ جو لوگ اردو کے حامی تھے چاہتے تھے کہ اردو ملک کی زبان ہو، اور جو ہندی کے حامی تھے ان کی خواہش تھی کہ ہندی ہو۔ یہ معاملہ اس وقت گہرائی تک پہونچ گیا تھا کیونکہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کی رقیب بن کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اردو والے کہتے تھے کہ اگر ہندی زبان کو تسلیم کیا گیا تو اردو ختم ہو جائے گی اور ہندی والے کہتے تھے کہ اگر اردو کو ملک کی زبان مان لیا گیا تو ہندی ختم ہو جائے گی۔ ہم ہر وقت اسی نگاہ سے اس سوال کو دیکھتے تھے اور اسی کے عادی ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب یہ سوال آنے لگتا تو اسی ترازو میں تولا جاتا۔ اسی حالت میں ملک آزاد ہوا۔ وقت آیا۔ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی بنی دستور بنا۔ اسمبلی میں کافی بحث ہوئی اور اکثریت کے ساتھ ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کر لیا گیا جس کے نتیجہ میں اردو کی حیثیت میں ایک بنیادی انقلاب ہو گیا۔ اور اردو کی ایک رقیب کی حیثیت ختم ہو گئی۔ اب ہر ہندستانی کا جو آئین کا وفادار ہے فرض ہے کہ اسے

جانے۔ وہ اس کے خلاف نہیں جا سکتا۔

تب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو کی کیا جگہ ہے؟ اب اس کی وہی حیثیت ہے جو دوسری زبان کی ہے۔ بہت سے لوگ اسے اب بھی رقیب کی حیثیت سے دیکھنے لگے ہیں حالانکہ اب یہ بات نہیں ہے۔ اب یہ سوال تو اٹھتا ہی نہیں کہ پورے ملک کی زبان کون سی ہوگی۔ کیونکہ ہندی کو جو جگہ ملنا تھی وہ اسے مل گئی۔ اب ہر ہندستانی کا فرض ہے کہ اس کے آگے سر جھکائے۔

لیکن اسی کے ساتھ اردو کی جو جگہ ہے وہ اسے ملنی چاہیے۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جو کثرت کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ نہ صرف شمالی ہند میں بلکہ جنوب میں بھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حیدرآباد اور تلنگانہ کے علاقہ میں اردو بولی جاتی ہے۔ میسور میں لاکھوں آدمی اردو بولتے ہیں۔ اسی طرح آندھرا اور مدراس میں متعدد جگہ اردو بولی جاتی ہے اور سمجھی جاتی ہے۔ یوپی۔ بہار۔ دہلی۔ پنجاب میں تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔

مجھے یقین ہے کہ کانفرنس جس مقصد کے لیے بلائی گئی ہے اس میں اسے کامیابی ہوگی اور جب وزیر اعظم ہندستان نے اس کانفرنس کا خود افتتاح کیا ہے تو یقیناً وہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گی۔

اتر پردیش کے وزیر اعلا

شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے ارشادات

(اردو اکادمی کے اجلاس منعقدہ ۹؍اپریل ۱۹۸۰ء میں)

"بہار نے اردو کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا ہے اس لحاظ سے ہم لوگ کچھ پیچھے ہو گئے ہیں، سوال یہ ہے کہ اتر پردیش پیچھے کیوں ہے؟ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کا سوال بار بار اُٹھتا رہا ہے اور کانگریس پارٹی نے بھی اپنے چناؤ مینی فیسٹو میں یہ بات صاف طور پر کہہ دی ہے جیسا کہ صدر اردو اکادمی نے بھی کہا ہے کہ انتظار کا پھل میٹھا ہوتا ہے لیکن انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب اس کا وقت آچکا ہے دراصل اس کے لیے ہم لوگوں نے کچھ دوسرے ڈھنگ کا طریقہ کار اپنایا ہے لیکن منزل ہماری وہی ہے۔ اس منزل تک پہنچنے میں مجھے امید ہے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۲ء نہیں ہونے پائے گا۔

"یہ شکایت بھی ملی ہے کہ سرکاری دفتروں میں اردو میں لکھی ہوئی درخواستیں نہیں لی جاتیں، آئندہ کوئی افسر اردو میں لکھی ہوئی درخواست لینے سے انکار نہیں کر سکتا اور اگر کرتا ہے تو اس کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ اردو میں لکھی ہوئی درخواستوں کے لیے جانے، اردو اساتذہ کو مستقل کرنے اور اردو میں حلف لیے جانے کے اقدامات کیے جاچکے ہیں۔ اس طرح ہم بتدریج آگے قدم بڑھا رہے ہیں۔ ہم نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ بسوں پر نشان منزل اردو میں بھی لکھا جائے۔ اس طرح دھیرے دھیرے ہم سرکاری محکموں میں اردو کو بڑھا رہے ہیں۔ سوال صرف نام پہ کا رہ گیا ہے تو بچہ پیدا ہونے کے بعد زیادہ دنوں تک بے نام کا نہیں رہ سکتا اور اس کی بھی حد ہم نے مقرر کر دی ہے۔"

حکومت بہار
محکمہ سرکاری زبان
نوٹی فی کیشن

پٹنہ، مورخہ ۱۶ر اپریل سنہ ۱۹۸۱ء

نمبر ۳/ بی ۳۔ ۱۸۰۱ء/۷۷/ ۶۵۲۔ را۔ بہار راج بھاشا (ترمیم) ایکٹ سنہ ۱۹۸۱ء (بہار ایکٹ ۲، ۱۹۸۱ء) کی دفعہ ۳ کے ذریعہ خصوصی اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے گورنر بہار حکم صادر کرتے ہیں کہ اس نوٹی فی کیشن کے جاری ہونے کی تاریخ سے ریاست کے پندرہ ضلعوں (۱۔ پورنیہ۔ ۲۔ کٹیہار ۳۔ دربھنگہ ۴۔ سیتا مڑھی ۵۔ بھاگل پور ۶۔ مدھوبنی ۷۔ بیگو سرائے ۸۔ مظفر پور ۹۔ سہرسہ۔ ۱۰۔ پوربی چمپارن ۱۱۔ نوادا ۱۲۔ دھنباد ۱۳۔ پچھمی چمپارن ۱۴۔ گیا اور ۱۵۔ سمستی پور) میں اردو بولنے والوں کے مفاد میں سرکاری زبان ہندی کے ماسوا اردو کا استعمال دوسری سرکاری زبان کی شکل میں مندرجہ ذیل مقاصد کیلئے کیا جائیگا:

۱۔ اردو میں عرضیوں اور درخواستوں کی وصولی اور اردو میں ان کا جواب۔

۲۔ اردو میں لکھی ہوئی دستاویزوں کو رجسٹریشن آفس میں قبول کیا جانا۔

۳۔ اہم سرکاری قوانین، قواعد و ضوابط اور نوٹی فی کیشن کی اردو میں اشاعت

۴۔ عوامی قسم کے سرکاری احکامات اور پرو فارماؤں کا اردو میں بھی جاری کیا جانا۔

۵۔ اہم سرکاری اشتہارات کی اردو میں بھی اشاعت ۶۔ ضلع گزٹ کے اردو ترجمے کی بھی اشاعت

۷۔ اہم سائن بورڈوں کا اردو میں بھی لگایا جانا۔

گورنر بہار کے حکم سے

دستخط: راجیشور پرشاد سنہا
کمشنر جوائنٹ سکریٹری

(ہندی سے ترجمہ)

تاثرات

آج کا دن اردو کی تاریخ میں ایک زرّیں دور کے آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ مدتوں کے بعد، اس نئے اعلان سے اس زبان کی بقا و ترقی کی بہت سی نئی راہیں کھلی ہیں اور اس کے لیے ہمارے حوصلہ مند اور جواں دل وزیر اعلا جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ ہمارے دلی شکریے کے مستحق ہیں۔ یہ اعلان ایک نقطۂ آغاز ہے، منزل نہیں۔ عمل کے پیمانے اور وسعت سے مستقبل کا تعیّن ہوگا۔

مجھے یقین ہے کہ ہماری وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی قیادت میں جس ترقی پسند لسانی پالیسی کی ابتدا ہوئی ہے وہ کاروانِ حدود کو اس کی منزل تک پہنچانے میں ممد و معاون ہو گی۔

جناب علی جواد زیدی
(صدر اردو اکادمی)

(۲)

اردو کے متعلق حکومت اترپردیش کا تازہ اعلان خوش آئند اور قابل مبارک باد ہے۔ ایک ایسے موسم کی آمد کی بشارت ہے جو نہ صرف اردو زبان بلکہ ملک کی جمہوری روایات کی بالیدگی کے لیے زیادہ سازگار ثابت ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اعلان ایک ایسے سنگ میل کی حیثیت بھی رکھتا ہے جو اختتام سفر کی نہیں بلکہ نئی جدوجہد کے آغاز کی علامت ہے۔ اردو دوستوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ماضی کی تلخیوں کو پس پشت ڈال کر اردو کی ترقی اور باز آفرینی کے لیے اخوت اور یک جہتی کی فضا کو مزید خوشگوار بنانے میں سرگرم ہوں۔

پروفیسر شبیہ الحسن
(صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی)

مجلسِ انتظامیہ

(منعقدہ یکم جنوری ۱۹۸۲ء)

کی قرارداد

اترپردیش اردو اکادمی کی مجلسِ انتظامیہ کا یہ جلسہ، اردو کے متعلق حکومت اترپردیش کے اعلان مجریہ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۱ء کا تہِ دل سے خیر مقدم کرتا ہے اور اس سلسلہ میں وزیر اعلیٰ کی جراُت مندانہ جدوجہد کو ایک تاریخ ساز اقدام قرار دیتا ہے اور اس بات پر وثوق رکھتا ہے کہ عن قریب حسب وعدہ یہ اعلان بہتر تفصیل کے ساتھ اور ریاست کے اردو بولنے والوں کی امنگوں کے مطابق قانونی شکل اختیار کرے گا۔

اترپردیش اردو اکادمی کی مجلسِ انتظامیہ کا یہ جلسہ اس طویل جدوجہد کے ایک حد تک بارآور ہونے پر بھی اپنے اطمینان کا اظہار کرتا ہے جو اردو کے حقوق و منصب کی بازیافت کے لیے گزشتہ ۳۰۔۲۵ سال مختلف نشیب و فراز دیکھتی رہی اور جو بلا تفریق مذہب و ملت اردو دوستوں کے درمیان یک جہتی کے عدیم النظیر مظاہرہ کی علامت بن گئی تھی۔ یہ جلسہ ان تمام افراد، طبقات، سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں اور لسانی مجاہدوں کی سعی پیہم کو بھی خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے جن کی اجتماعی کوششوں سے نہ صرف اردو کے لیے اس روزِ روشن کا طلوع ممکن ہوا بلکہ ملک میں قومی یک جہتی کے استحکام کے لیے زیادہ بہتر فضا وجود میں آگئی۔

ممبرانِ مجلسِ انتظامیہ نہ صرف خود اس بات کا احساس رکھتے ہیں بلکہ تمام اردو دوستوں کو بھی اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ اتنا کچھ ہوجانے کے بعد بھی اردو کا نہ صرف ابھی مسئلہ باقی ہے بلکہ اس کے لیے جدوجہد اور حاصل شدہ مراعات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کسی طرح کی سستی یا بے راہ روی ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث ہوسکتا ہے۔ ابھی اردو کا گھر مکمل طور پر نہیں بسا ہے اسے بسانے کے لیے حب الوطنی یک جہتی اور باہمی اخوت کی اس فضا کا برقرار رہنا ضروری ہے جس کا نتیجہ اردو زبان بھی ہے اور اس کے سلسلے میں حاصل شدہ ساری کامیابیاں بھی۔

تاثرات

اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دینے کا وعدہ وزیر اعلیٰ وشو ناتھ پرتاپ سنگھ ہی نے نہیں بلکہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بھی اپنے الکشن مینی فیسٹو میں کیا تھا۔ یہ وعدہ پورا کر کے انھوں نے اپنی پارٹی کے اصولوں کے ساتھ وفاداری کا مظاہرہ کیا ہے ان کی پارٹی کے سب لوگ اس وعدے کے پابند ہیں اور امید ہے کہ سب مل کر اردو کے حقوق کی بحالی کے لیے ٹھوس اقدام کریں گے۔ عشرت علی صدیقی (چیف اڈیٹر قومی آواز لکھنؤ)

(۲)

اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دینے کا وعدہ کرکے وزیر اعلیٰ جناب وشو ناتھ پرتاپ سنگھ نے ایک جرأت مندانہ اقدام کیا ہے! یہ ہماری جدوجہد کا آغاز ہے، اور ہمیں امید ہے کہ اردو کو اس کے تمام حقوق جلد از جلد مل جائیں گے۔

پروفیسر حکم چند نیر
(صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونی ورسٹی)

اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیے جانے پر

وزیر اعلا کو مبارکباد

لکھنؤ۔ یکم جنوری ۱۹۸۲ء۔ اتر پردیش اردو اکادمی کی ملازمین یونین کا ایک جلسہ سکریٹری جناب ادیس حسن قدروائی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں اردو کو دوسری زبان قرار دینے پر درج ذیل تجویز منظور کی گئی:

"اتر پردیش اردو اکادمی ملازمین کا یہ جلسہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے کے لیے وزیر اعلا جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہے۔ وزیر اعلا نے درپیش مشکلات کے باوجود اپنے وعدے کو پورا کر کے اردو والوں کو نئے سال کے موقع پر ایک بے مثال تحفہ دیا ہے۔ یہ جلسہ اس توقع کا اظہار بھی کرتا ہے کہ جس طرح اردو کے مستقبل کو محفوظ کیا جا رہا ہے، اسی طرح اردو اکادمی کو مستقل کر کے اکادمی کے ملازمین کو بھی ملازمت کا تحفظ دیا جائے گا۔ اکادمی کی جنرل کاونسل اپنے ۹ اپریل ۱۹۸۱ء کے جلسہ میں یہ تجویز منظور کر چکی ہے۔ حکومت بھی اسے اپنی منظوری دے کر فراخدلی کا ثبوت دے گی۔

Uttar Pradesh Urdu Akademi REG. NO.
KHABARNAMA (ZAMIMA) JAN. 82 LW/NP-126

جبرنامہ



اتر پردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

جلد ۱۰ شمارہ ۱۱

مئی ۱۹۸۲ء

سالانہ چندہ

پانچ روپے

فی شمارہ:

پچاس پیسے

تصاویر: سرورق، عتیق صدیقی مرحوم

پشت پر: مجروح سلطانپوری

اکادمی انعام دونوں حضرات کی مجموعی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ ان حضرات سے متعلق اہم مضامین اگلے صفحات میں ملاحظہ کیجئے۔

عزیز ... پرنٹر پبلشر دفتر اتر پردیش اردو اکادمی قیصر باغ لکھنؤ سے شائع کیا ... پریس لکھنؤ میں چھپوایا۔

ترتیب

اداریہ

اردو تعلیم کا مسئلہ

ایک اور تعلیمی سال ختم ہوا اور پھر ایک نئے تعلیمی سال کی آمد آمد ہے۔ جو تعلیمی سال گذر گیا وہ اردو کے سیاق و سباق میں اس اس لحاظ سے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کہ اردو نے سرکاری سطح پر پہنچنے کا جو خواب دیکھا تھا اسی تعلیمی سال میں اس کی تعبیر کی گرہیں کھلنے لگیں اور ہمیں یقین ہے کہ وہ دن جلد آجائے گا جب اس کی تعبیر عملی صورت میں سامنے آجائے گی لیکن گذرنے والے تعلیمی سال کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس کے علاوہ اور کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا کہ اردو کی تعلیم کا مسئلہ نہ صرف یہ کہ حل نہیں ہوا بلکہ اسے حل کرنے کی مخلصانہ کوشش بھی نہیں کی گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب اس مقصد کے لئے تو تلاش کیا جا سکتا ہے کہ اس کی روشنی میں ہم مستقبل کے لئے بہتر لائحہ عمل تیار کر سکتے ہیں مگر ہمیں یہ بھی اندیشہ ہے کہ اس جواب کے دوران کچھ زہریلے چہروں کے نام بھی آئیں گے جو یا تو ہمیں گریہ و ماتم پر آمادہ کریں گے یا الزام تراشی پر اس لئے ہم بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ نئے تعلیمی سال میں اردو تعلیم کا مسئلہ حل ہو جائے اور اسے تنہا نہ تو اردو والے حل کر سکتے ہیں نہ حکومت ہمارے نظام تعلیم کا ڈھانچہ کچھ ایسا ہے کہ حکومت اور عوام دونوں کے باہمی تعاون کے بغیر تعلیم کے مقتضیات کو پورا نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اردو تعلیم کے سلسلے میں حکومت نے جو آسانیاں فراہم کر رکھی

ہیں ہمیں چاہیے کہ ہم ان سے بھرپور فائدہ اُٹھائیں۔ اس کی مناسب صورت یہ ہے کہ جن اداروں میں اُردو کی تعلیم کا بندوبست ہے ان میں زیادہ سے زیادہ داخلے دلائے جائیں۔ ان اداروں میں جو اساتذہ مامور ہیں وہ اپنی بہترین صلاحیتیں اپنے طلبہ کے لیے وقف کردیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ بعض ایسے اداروں میں جہاں اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے، طلبا کی تعداد مایوس کن ہے اور اس بات کا بھی تجربہ ہوا ہے کہ طلبا اپنے اساتذہ سے وہ نہیں لے پاتے جو ان کا حق ہے۔ یہ دونوں امور ہماری فوری توجہ کے مستحق ہیں اور جولائی میں جب نیا تعلیمی سال شروع ہو تو انھیں اُردو والے ہی حل کرسکتے ہیں۔

اُردو کی تعلیم کے بارے میں حکومت کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ ایک سال سے زیادہ مدت گزری جب حکومت نے اُردو کی تعلیم کے مسئلے پر اُردو اکادمی سے گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی گفتگو سے پہلے حکومت جن کاغذات کو دیکھنا چاہتی تھی، انھیں اکادمی نے بلاتاخیر پیش کردیا تھا لیکن آج تک حکومت اور اکادمی کے مابین اس اہم قومی مسئلے پر گفتگو کی نوبت نہیں آئی حکومت کے راستے میں کیا رُکاوٹیں ہیں، ان کا علم ہمیں نہیں۔

ہمارے وزیر اعلا کی بے لوثی، اُردو سے اُن کا خلوص اور قومی مسائل میں ان کا انہماک ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ مگر اُردو کی تعلیم کے مسئلے کو وہ اپنے دائرۂ کار میں لے آئیں تو یہ بڑی آسانی سے حل ہو جائے گا۔ ہمیں اُن سے درخواست کرنا ہے کہ وہ اکادمی کے پیش کردہ کاغذات کو بذاتِ خود ملاحظہ فرمائیں اور نئے تعلیمی سال کے آغاز سے پہلے اُردو کی تعلیم کے بارے میں جائز اُردو کی شکایتوں کو دور کردیں۔

ہمیں اس کا احساس ہے کہ وزیر اعلا بے حد مصروف رہتے

ہیں اور ان کے سامنے اور بھی بہت سے اہم مسائل ہیں لیکن وسعت کے باوصف یہ تقاضائے وقت ہے کہ وہ خود اُردو کے مسائل کی طرف متوجہ ہوں۔ بات یہ ہے کہ جب ہماری نظر سے ان کی کابینہ کے ایک ذمہ دار رکن کا اُردو مخالف بیان گزرتا ہے تو ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ عالم بیداری ہے یا عالم خواب۔ ایک طرف حکومت اُردو کے بارے میں آرڈیننس اور نوٹیفکیشن جاری کرتی ہے تو دوسری طرف کابینہ کا ایک رکن اپنے بیانات سے حکومت کے موقف کی نفی کرتا ہے۔ جب وزیر اعلا خود اُردو کے مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے لیں گے، اس وقت یہ واضح ہو جائے گا کہ حکومت اُردو کو کیا دینا چاہتی ہے اور کیا نہیں۔

محمود ہاشمی

اپنے قارئین سے!

اب تک "خبرنامہ" کی خریداری کے سلسلے میں ہم نے آپ سے کچھ نہیں کہا۔ ہم چاہتے تھے کہ آپ اس کے معیار اور پابندی کے ساتھ اس کی اشاعت سے مطمئن ہو جائیں تو آپ کی خدمت میں اپنی درخواست پیش کریں۔

ہمارے پاس برابر تعریفی خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے تعریفی خطوط لکھے اور جنھیں "خبرنامہ" پسند آیا لیکن صرف تعریف سے کچھ نہیں ہوتا۔

ہم چاہتے ہیں کہ جون کے اواخر تک اس کے ایک ہزار نئے خریدار بن جائیں اور ایسا آپ کے سرگرم تعاون کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اپنے حلقے میں تعداد کو بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ سالانہ چندہ صرف پانچ روپے ہے۔ ہم آپ کی نوازش کے منتظر ہیں۔

عزیز اللہ خاں
سکریٹری [illegible]

مقطع میں آپڑی ہے.....

حکمت عملی

خرید و فروخت کے لئے ایسے ایسے قوانین وضع کئے گئے ہیں کہ اگر ان کا احترام کیا جائے تو چشم زدن میں دنیا سے بے ایمانی نیست و نابود ہو جائے مگر جس انسانی دماغ نے یہ قوانین بنائے، اسی نے بے ایمانی کی نئی نئی راہیں بھی نکالیں۔ کوٹیشن، ٹنڈر، ری بیٹ، کنٹریکٹ ریٹ وہ اصطلاحیں ہیں جو اس مہذب معاشرے میں سکۂ رائج الوقت کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہیں لیکن اس کے ساتھ کمیشن اور دست غیب کی وسعت کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اس کی زلف تو:

طولِ شب فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے

ہمارے ایک بزرگ کو ان اصطلاحات سے الرجی تھی، وہ داد و ستد کے بڑے کھرے تھے اسی لئے چاہتے تھے کہ خرید و فروخت اور لین دین کے قدیم طریقوں میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ انھوں نے طریقۂ ِ اسخۂ قدما کی پابندی کرنے والے ملازم کے لئے اشتہار جاری کیا مگر شومیٔ قسمت دیکھئے کہ ان کی خدمت میں نوکری کے لئے ایک متنفس بھی حاضر نہیں ہوا۔ وہ ہار ماننے والے نہیں تھے، انھوں نے اشتہار کا اجرا نہیں روکا کہ شاید کبھی کوئی اللہ کا بندہ میرا ہم خیال ہو جائے اور آخرش ایک دن وہ ساعت سعید آئی اور ایک نوجوان اشتہار کے حوالے سے حاضر ہوا۔

نوجوان نے کہا کہ آپ کا اشتہار مہینوں سے میری نظر سے گذر رہا ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ کو میری اور صرف میری ضرورت ہے۔

میں نے بہت کچھ کمایا کمایا، اب چاہتا ہوں کہ عافیت کی زندگی گزاردوں۔ میں اتنا ضرور واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میری یہ شہرت رہی ہے کہ میرے توسط سے جو سامان خریدا جاتا ہے اس کی اصل قیمت کا ۲۵ فی صد میں اپنی حکمت عملی سے ذاتی کمیشن کے طور پر رکھ لیتا ہوں اب اس کا انحصار آپ کی حکمت عملی پر ہے کہ میں یہ کمیشن جاری رکھ سکتا ہوں کہ نہیں!

بزرگوار اچھل پڑے اور اپنی حکمت عملی پر اعتماد کرتے ہوئے اُسے اپنے حلقۂ ملازمین میں داخل کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ گویا یہ مالک اور نوکر کا رشتہ نہیں تھا، حکمت عملی پر فخر کرنے والی دو عہد ساز شخصیتوں کا تصادم تھا۔

شہر میں نام کی تختی (نیم پلیٹ) بنانے والی ایک فرم کی بڑی شہرت تھی جو فی حرف ایک روپیہ چارج کرتی تھی۔ اس امر خاص میں فرم نے کسی کے ساتھ کمیشن یا کنسشن روا نہیں رکھا تھا۔ بزرگوار نے نوجوان سے کہا کہ تم فلاں فرم سے میرے نام کی تختی بنوا لاؤ۔ دیکھو میرا نام "محسن" ہے یعنی میرے نام میں کل چار حروف ہیں۔ ایک روپیہ فی حرف کے حساب سے وہ چار روپے وصول کرے گی، دیکھنا ہے کہ تم ۲۵ فی صد اپنا ذاتی کمیشن کیوں کر وصول کرتے ہو، صاحبزادے!

نوجوان بڑی تیزی کے ساتھ دُکان پر پہنچا اور کہا کہ ازراہِ کرم میرے نام کی تختی جلد از جلد بنا دیجئے۔ لیجئے، یہ ہے میرا نام جو تختی پر لکھا جائے گا ——— "مُحسن" (م۔ح۔س) یعنی سہ حرفی میرا نام ہے۔ فرم والے نے کہا کہ یہ عجیب نام ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میرے ذاتی معاملات میں آپ کو مداخلت کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ صاحب فرم نے معذرت کی، تین روپے کی رسید کاٹی اور کہا کہ ایک گھنٹے کے بعد تختی آپ کو تیار ملے گی۔ نوجوان نے کہا کہ میں آپ سے ایک اور کرم کی درخواست کرتا ہوں اور وہ یہ کہ میرے نام میں جو نقطے ہیں انھیں

میرے سامنے ثبت کیجیے گا۔

ایک گھنٹے کے بعد نوجوان حاضر ہوا، تختی تیار تھی، صرف نقطوں کو ثبت کرنا تھا۔ اس نے کہا کہ بھئی، تین میں سے دو نقطے تم اپنے پاس رکھو بس ایک نقطہ سین کے پیٹ میں لگا دو۔ اس عمل سے "مجس" کو "محسن" بننے میں دیر نہیں لگی۔

نوجوان بامراد بزرگوار کے پاس حاضر ہوا، نام کی تختی پیش کی اور تین روپے کی رسید —— اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر کہا کہ حضور یہ تو میرا ہے نا؟

بزرگوار پر کیا گزری یہ چھوڑیے۔ آج کل بعض حضرات جو خود کو اردو کا محسن سمجھتے ہیں، محسن کو مجس بنانے میں مصروف نظر آتے ہیں مگر ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں ہے کیوں کہ بہت پہلے اس حقیقت کا انکشاف کر چکے ہیں کہ افراط و تفریط کے اس عمل کی ابتدا مرزا غالب جیسے عظیم المرتبت شاعر سے ہوئی۔ غالب نے "نگاہ" سے ۲۵ فی صد کمیشن وصول کر کے اسے "نگہ" بنا دیا تھا اور داد طلب انداز سے اس کا اعتراف بھی کر لیا تھا:

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ "جو بظاہر نگاہ" سے کم ہے

(نباض)

بقیہ صفحہ ۹

میں بھی وہ ال گھوڑے دوڑا گیا۔ اب نہ آئے گا اور اگر آئے گا تو [illegible] قدم اُسے اپنے اوپر بھروسہ، محنت کے بارآور ہونے کا یقین اور اگر صاحب ذوق ہو تو کامیاب ہونے کی بشارت سناتا رہے گا۔

مرحوم نے مستقل تحقیق کا جو کام کیا اس کے علاوہ بے شمار تبصرے اور مقالات لکھے وہ ان کی کتابوں [illegible] کا نام زندہ رکھیں گے۔

نسیم احمد (دانش محل)

عتیق صدیقی مرحوم

دنیا میں بعض لوگ جسم و جان کی پرورش میں اپنی زندگی کھپا دیتے ہیں اور سچ یہ ہے کہ یہ کام بھی کچھ کم اہم نہیں ہے لیکن انھیں انسانوں کی آبادی میں کچھ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جن کی تعداد اگرچہ بہت کم ہوتی ہے، جو بلند تر اقدارِ حیات کے لیے زندگی بھر رواں دواں رہتے ہیں۔ اقدارِ حیات کوئی مالِ تجارت نہیں جس کے لیے خریداروں کی ریل پیل ہو۔ اقدارِ حیات کی پرکھ اور ان کو اپنانے اور اپنے کردار میں سمونے کے طلب گار تو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ تعداد میں یہ لوگ کتنے ہی کم ہوں لیکن یہی زندگی کا نمک ہیں۔ زندگی کی صباحت و ملاحت اور اس کی حلاوت سب ان ہی کی کاوشوں، فکر پیمائیوں اور فن کاریوں کی بدولت قائم ہیں۔

عتیق صدیقی مرحوم کچھ ایسے ہی انسان تھے، جو ابتدائے شباب ہی سے، سود و زیاں سے بلند رہ کر، ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کئے بغیر تحقیق و جستجو کے کام میں لگے رہے۔ میں اُن سے اس وقت سے واقف ہوں جب وہ نیاز فتحپوری مرحوم کے یہاں اُن کے مددگار کی حیثیت سے آتے جاتے نظر آتے تھے۔ گزر اوقات کے لیے تھوڑے بہت معاوضہ پر قناعت کرتے لیکن ان حقایق کی جستجو میں سرگرداں رہتے، جو اگرچہ نظروں سے پوشیدہ ہو چکے تھے۔ لیکن ان سے انسانیت کے سفر کی راہ کا سراغ ملتا تھا۔

وہ خاموش کارکن تھے۔ اپنی فکر و خیال میں ڈوبے ہوئے تیز قدم بڑھاتے ہوئے، کسی لائبریری اور مکتبہ میں در آتے اور اپنے کام میں لگ جاتے۔ ان کی زندگی مقصد کا تھا "کھوئے ہوؤں کی جستجو"۔ ان کو مہمیز کرتی رہتی تھی۔ اسی جستجو نے اردو صحافت کے سفر کی راہ متعین کی اور ان کی کتاب، ہندستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) منصۂ شہود پر آ گئی۔ یہ کتاب جب سامنے

آئی، کم ہی نقادوں کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ یہ گراں قدر خزانہ اسی فاضل و خاموش محقق کے طالب علم کے ذوق جستجو کا نتیجہ ہے۔ بہتوں کو تو اس کتاب کی قدر و قیمت آنکنے میں محض صاحب کتاب کی ظاہر سادگی کی وجہ سے دشواری ہوئی اور کافی چھان پھٹک کے بعد ان کو اس سادہ اہل قلم کی پرکاری کا یقین آیا اور انجمن ترقی اردو جانچ و پڑتال کے سارے مراحل سے گزر کر کتاب کے چھاپنے اور منظر عام پر لانے کا باعث ہوئی۔

گل کرائسٹ کے اردو ادب پر جو احسانات ہیں اردو والے انھیں بھول چکے تھے لیکن عتیق صدیقی نے، خدا انھیں اپنی رحمت سے نوازے، اُن کے نام پر سے زمانے کی گرد جھاڑی اور ان کے احسان کا اعتراف کر کے تاریخ ادب کے ایک باب کے حروف پھر اُبھار دیے۔

بنگلہ دیش بنا۔ اس جشن چراغاں میں نالہ و ماتم کا دھواں اپنی آنکھوں میں بسائے ہوئے عتیق صاحب اس نئی مملکت میں پہنچے۔ ہندستانی صحافی، ایسے فضا اور ماحول میں جو سراسر ہندستان کش تھا، اتنی خبر پر قناعت نہ کر سکا کہ ایک سلطنت گئی۔ دوسرا راج آیا، اُن کو تو اُن انسانوں کی فکر بھی جو اس دار و گیر میں، زمین کو تنگ اور آسمان کو دور سمجھ کر دل پکڑے بیٹھے تھے اور کسی ایسے دردمند کے متلاشی تھے جو کم سے کم اُن کی آہوں کو اپنے دل میں اُتار کر اُسے انسانیت کا غم بنا دے۔ عتیق صدیقی صاحب کے "بنگلہ دیش میں بارہ دن" اسی آہ و کراہ کی کاغذی تصویر کشی میں کیے۔ ان کے ذوق جستجو نے جو جو کم جھیلا اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اہل دل ہی لگا سکیں گے۔

عتیق صدیقی صاحب ایک بڑے محقق اور ادیب تھے لیکن اگر بات اتنی ہی ہوتی تب بھی ان کی موت، علم و ادب کا ناقابل تلافی نقصان سمجھی جاتی۔ لیکن وہ ایک دردمند انسان بھی تھے۔ غریب انسان زندگی کے نشیب و فراز سے جس طرح ہچکولے کھاتا ہوا گزرتا ہے اور اکثر اس کے دل پر ابنائے زمانہ کی بے رخی سے جو چرکے لگتے ہیں وہ ان سب کی تصویر اور تاریخ تھی۔ اس لئے ان کے ساتھ وہ سب نازک احساسات اور ان کی قدر دانی بھی رخصت ہو گئی، جن کے وہ امین تھے۔ نچلے اوسط طبقہ کا ایک نوجوان جو اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں کے بھروسے پر، ناقدین کی پتھریلی آنکھوں

(بقیہ صفحہ پر)

عتیق صدیقی

یادوں کے سایے

نیاز فتح پوری

میں نے بھی عجیب عجیب باتیں (نیاز فتحپوری صاحب کے) متعلق سنی تھیں۔ پہلی مرتبہ ڈرتے ڈرتے ان کے پاس گیا تھا۔ یہ قصہ اوائل ۱۹۴۰ء کا ہے۔ ان کے مکان پر پہنچا تو صدر دروازہ اٹکا یا ہوا تھا۔ کنڈی کھٹکھٹائی تو جواب میں کسی نے کہا " اندر آجائیے" دروازہ کھولا تو سامنے چھوٹا سا صحن اور اس کی بغل میں ایک برآمدہ نظر آیا، جہاں کونے میں ایک کاتب بیٹھا تھا۔ نیاز صاحب کے متعلق دریافت کیا تو سامنے کے کمرے کی طرف اس نے اشارہ کردیا جس کے دروازے پر چق پڑی تھی۔

"تشریف لائیے" ایک بزرگ نے دیکھتے ہی اندر سے آواز دی۔

کمرے میں داخل ہوا تو ایک صاحب بڑی سی میز کے سامنے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ سامنے کتابوں کا انبار لگا تھا۔ میز کے کونے پر بجلی کا ایک لیمپ تھا، جس کی ہلکی ہلکی روشنی کمرے کی تاریکی کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میز کے قریب پہنچ کر میں نے سلام کیا۔

"یادوں کے سایے" عتیق صدیقی مرحوم کی تصنیف ہے۔ یہ خود نوشت ہے یا سفرنامہ، رپورتاژ ہے یا تجزیہ، اس کا فیصلہ خود مصنف نے نہیں کیا۔ بہرحال، اپنی اس کتاب میں عتیق صاحب نے جناب نیاز فتح پوری کے متعلق اپنے جو تاثرات قلم بند کیے تھے انھیں "خبرنامہ" میں شائع کیا جارہا ہے۔

"تشریف رکھیے" ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا "میں ابھی دو منٹ میں فارغ ہوتا ہوں۔" نیاز فتحپوری صاحب نے دو کی جگہ پر چار پانچ منٹ لے لیے۔ لیکن میں نے اس وقفے کو غنیمت جانا۔ اتنی دیر میں اپنے حواس مجتمع کر لیے اور جب وہ مجھ سے مخاطب ہوئے تو پورا قصہ میں نے تفصیل کے ساتھ سنا دیا۔

"اچھی بات ہے"۔ مسودہ میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے نیاز صاحب نے کہا "آج ہی شام کو آپ کو جواب مل جائے گا۔"

"تو میں شام کو حاضر ہو جاؤں گا۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" انھوں نے قطعیت سے جواب دیا۔ "میرا آدمی صدیق بک ڈپو خط دے آئے گا، وہیں کا پتا آپ نے لکھا ہے نا؟"

"شام کو صدیق بک ڈپو گیا، تو میرے نام کا ایک بڑا سا لفافہ وہاں رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرا پہلا تاثر مایوس کن تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ نیاز صاحب نے مسودہ واپس کر دیا ہے۔ لفافہ کھولا تو مسودے کے ساتھ ایک لمبی سی سلپ پر کاروباری انداز کی مختصر سی تحریر۔ مضمون کے متعلق کوئی رائے نہیں تھی۔ بس اتنا لکھا تھا کہ مضمون بالاقساط شائع ہو جائے گا۔ معاوضہ فی الحال آٹھ آنے فی صفحہ دیا جا سکے گا۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی تھی کہ منظور ہو تو دوسرے دن گیارہ بجے تک مسودہ دفتر پہنچا دیا جائے، تاکہ اگلے شمارے میں اس کی پہلی قسط شائع کی جا سکے۔

معاوضہ میری توقع سے کم تھا، لیکن فیصلہ کرنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ دوسرے دن وقت مقررہ پر میں گیا اور بے چوں و چرا مسودہ نیاز صاحب کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے کاتب کو بلایا اور مسودہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا "دیکھیے یہ کتنے صفحے کا ہوگا؟" کاتب نے سطروں کا حساب لگانے کے بعد ساٹھ صفحات کا تخمینہ بتایا۔ نیاز صاحب نے میز کی دراز سے چک بک نکالی اور تیس روپے کا چک لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔

یہ تھا نیاز صاحب کا اور میرا پہلا سابقہ یا پہلا معاملہ۔ اس کے بعد بھی ان کا یہی دستور

مبادا کہ جب بھی کوئی مضمون میں نے خود یا ان کی فرمائش پر لکھا، معاوضے کا چیک انھوں نے اسی وقت لکھ دیا۔ نقد پیسے کبھی نہیں دیے اور اُدھار کا معاملہ بھی کبھی نہیں رکھا۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد جب انھیں میرے ذہنی رجحانات کا اندازہ ہو گیا تو کھل کر باتیں کرنے لگے، اکثر خود ہی موضوع کا تعین کر کے مضمون لکھنے کی فرمائش بھی کرتے۔

"اسے اپنا لیجیے۔" ایک انگریزی رسالے کا تراشا میرے حوالے کرتے ہوئے ایک بار نیاز صاحب نے کہا۔

"یہ فن مجھے نہیں آتا۔" میں نے جواب دیا، "کہیے تو ترجمہ اس کا کر دوں۔"

"اچھی بات ہے، ترجمہ کر دیجیے۔"

دو مہینے بعد وہی مضمون جب "نگار" میں "ادارے" کے نام سے شائع ہوا، تو اس کا انداز بیان اس درجہ بدلا ہوا تھا کہ پڑھتے وقت کچھ دیر تک میں محسوس نہ کر سکا کہ یہ وہی مضمون ہے، جس کا میں نے ترجمہ کیا تھا۔[1]

نیاز صاحب کی ہدایت کے مطابق یا ان کے مشورے سے میں نے بعض طویل مضامین ایسے لکھے جو کسی مصلحت کی بنا پر وہ شائع نہ کر سکے یا اس کے کچھ حصے ہی شائع کیے لیکن ایسے مضامین کا بھی معاوضہ انھوں نے مسودے کے صفحات کے مطابق ہی پیشگی ادا کیا، اور غیر شائع شدہ حصوں کا معاوضہ کسی دوسرے مضمون کے حساب میں وضع نہیں کیا۔

دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد برطانوی پارلیمنٹ کے ایک لیبر ممبر "زلیاکس" کی ایک کتاب "لائٹ آن ماسکو" لندن سے شائع ہوئی، جس پر برطانیہ کی خارجہ پالیسی پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی، نیاز صاحب کی اجازت سے میں نے اس کی تلخیص کر ڈالی جو نگار کے اسّی پچاسی صفحات کی تھی۔ مسودہ میں نے ان کے حوالے کیا اور انھوں نے حسب دستور معاوضہ ادا کر دیا۔ اس کے بعد میں اتفاقاً لکھنؤ سے باہر چلا گیا اور ڈھائی تین مہینے بعد واپسی ہوئی۔ نگار کا تازہ شمارہ دیکھا تو پہلی قسط "اہم انکشافات" کے عنوان سے، میرے نہیں ادارے کے نام سے چھپی تھی لیکن دوسری قسط میرے نام سے شائع ہوئی۔[2]

---

[1] نگار جولائی سن ۱۹۴۰ء

[2] نگار ستمبر سن ۱۹۴۰ء

مگر اس میں نیاز صاحب نے کمال یہ کیا کہ مسودے کے ساتھ بیشتر صفحات کو کاٹ چھانٹ کر نگار کے نو صفحات میں سمو دیا اس سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ مضمون کے آخر میں ایک طویل فوٹ نوٹ کا بھی اضافہ کیا جس میں اصل کتاب پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی۔

آپ نے تو غضب کر دیا نیاز صاحب" لکھنؤ لوٹنے کے بعد پہلی ملاقات میں احتجاجاً میں نے کہا "میرے مضمون کا تو بھرکس ہی نکال دیا آپ نے۔ رہی سہی کسر آپ کے نوٹ نے پوری کر دی۔"

"کیا کرتا۔" نیاز صاحب نے بے بسی سے جواب دیا۔ "پہلی قسط کی اشاعت کے ساتھ ہی گورنمنٹ آف انڈیا کا عتاب نامہ آ گیا۔"

نیاز صاحب کا یہ بیان یقیناً سچ تھا۔ میری ایک اور طویل تلخیص بھی حکومت کی پالیسی کی نذر ہو گئی، جس کی صرف پہلی ہی قسط "روسی نظام حکومت پر تبصرہ" کے عنوان سے شایع ہو سکی[1]

جولائی سنہ ۱۹۴۱ء میں نیاز صاحب نے نگار کا جنگ نمبر شایع کرنے کا اعلان کیا اور اس کے لئے ایک طویل مضمون لکھنے کی مجھ سے فرمائش کی، جس میں پہلی جنگ عظیم کے اختتام سے لے کر دوسری جنگ کے آغاز تک کے بین الاقوامی حالات پر سیر حاصل تبصرہ ہو۔

"یہ تو خاصا لمبا کام ہے۔" ان کی فرمائش سن کر میں نے کہا "اور مضمون بھی کافی طویل ہوگا۔"

"اس کی فکر نہ کیجیے۔" انھوں نے جواب دیا۔ "مضمون جتنا طویل بھی ہو، چھپ جائے گا اور معاوضہ بھی دوگنا ملے گا، لیکن شرط یہ ہے کہ پندرہ دن کے اندر تیار ہو جائے۔"

رات دن ایک کر کے مضمون معینہ مدت کے اندر میں نے نیاز صاحب کے حوالے کر دیا۔ اس کی تیاری کے سلسلے میں اپنے اس مضمون سے بھی میں نے بہت مدد لی، جو عربوں کی سیاسی

---

[1] نگار، جولائی [illegible]

بیداری' کے عنوان سے 'نگار' ۱۹۴۲ء میں بالاقساط شایع ہوا تھا۔ اس کے بعض کام کے طویل اقتباسات لفظ بہ لفظ میں نے اس مضمون میں بھی شامل کر دیے۔ وہ مضمون بھی چوں کہ میرا ہی تھا اس لیے حوالے دینا میں نے غیر ضروری سمجھا۔ اس جنگ نمبر کے لیے نیاز صاحب نے ایک اور مضمون مجھ سے لکھوایا لیکن جب یہ نمبر آیا تو میرا طویل مضمون "داستانِ جنگ" کے عنوان سے بہ طور مقدمہ کے ملاحظات کی جگہ پر ادارے کے نام سے شائع ہوا[1]۔ دوسرے مضمون کا بھی یہی حشر ہوا[2]۔ لیکن سب سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اسی نمبر میں ایک مضمون میرے نام سے تھا جو میرا لکھا ہوا نہیں تھا۔

---

[1] نگار، اگست ۱۹۴۲ء [2] نگار، اگست ۱۹۴۲ء 'نازی حکومت اور مزدور'

بقیہ ص ۱۷

کے گیت اور غزلیں گا رہے تھے —— "مجھے معلوم نہ تھا" رشید احمد صدیقی، جگر مرادآبادی اور سہگل تینوں غزل کے دلدادہ بلکہ پرستار۔ مگر بمبئی ترقی پسندوں کا مرکز، انقلابی محنت کشوں کا گہوارہ —— اور اسی دور سے مجروح کو غزل کا نیا آہنگ ملا۔

مجروح عربی مدارس کے فارغ التحصیل ہیں، انگریزی نہیں جانتے مگر مارکسی نظریے تک ان کی رسائی ترقی پسند تحریک کی راہ سے ہوئی۔ اور اس نظریاتی صداقت نے مجروح کی غزل کو نئی آگہی بخش دی مگر اس منزل تک پہنچنے سے پہلے بھی کئی منزلیں تھیں۔

مجروح غزل میں کلاسیکی آئین و آداب کے قائل ہیں۔ نغگی اور مرقع سازی اُن کا فن ہے اور اس کے لئے ساز و برگ وہ روایت کے سبھی نقش و نگار سے حاصل کرتے ہیں اسی لئے سجاوٹ ان کی غزلوں میں محض تراکیب یا تشبیہہ سازی سے عبارت نہیں بلکہ سجیلے پن اور البیلے پن کا نام ہے۔

محمد حسن

مجروح سلطان پوری: سجیلا غزل گو

مجروح سلطان پوری غزل کے قتیل ہیں۔ حق یہ ہے کہ دورِ حاضر میں اُن جیسا سجیلا اور طرح دار غزل گو نایاب ہے۔ انھوں نے غزل کو سیاسی رمزیت ہی نہیں ترقی پسند حسیت سے روشناس کیا، دو چار براہِ راست قسم کے شعر بھی کہہ ڈالے اور ان کو لے کر ایسا ہنگامہ مچا کہ ان کی غزل کی طرحداری اور سجیلاپن اس شور میں دب گیا۔

دراصل مجروح کے سامنے ایک نئی للکار تھی؟ کیا جدید غزل جدید دور کے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے؟ مخالفین کا اصرار تھا کہ اوّل تو غزل کی ریزہ خیالی حایل ہوگی دوسرے اس کی مخصوص لفظیات اور علامتوں پر جاگیردارانہ نظام کی جو چھاپ لگی ہے وہ اسے عصرِ حاضر کی انقلابی حسیت کو اپنانے میں حارج ہوگی تیسرے قافیے ردیف کی مجبوریاں راہ روکیں گی، مجروح نے ان سب دقتوں کو آنکھیں کھول کر تسلیم کیا ــــ اور نباہ دیا اور اس طرح نباہا کہ غزل کی لفظیات کو نئی تہہ داری اور رمزیت ملی اور غزل کو نئی سجاوٹ اور وقار۔

مجروح کے اس کارنامے کے سلسلے دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مجروح جگر کے شاگرد نہیں پرستار البتہ ہیں۔ کہا یہ بھی جاتا ہے کہ آخر دور میں جگر نے جو سیاسی رمزیت کا انداز غزل میں اپنایا اس کی تحریک انھیں مجروح کی غزل کے نئے آہنگ سے ملی تھی، (مثلاً اس طرح کا مصرعہ: "بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں") جذبی غزل میں سیاسی

رمزیت کو سمو ہی رہے تھے: ؎

اُن بجلیوں کی چشمکِ باہم تو دیکھ لیں جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے

پھر فیض کی غزل آئی ـــــ مگر یہ ذکر بعد میں!

مجروح نے غزل میں جن تقاضوں کو برتا، دراصل وہ تقاضے تھے کیا؟ ترقی پسند تحریک شاعری سے کس قسم کے تقاضے کر رہی تھی، اور ترقی پسندی کی پہچان کیا تھی؟ سوال خاصا الجھا ہوا ہے مگر بنیادی مسئلہ ان تقاضوں کی شناخت ہی کا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے بعض علم بردار ترقی پسندی کی پہچان سمجھتے تھے:

۱۔ براہ راست (خطیبانہ یا بیانیہ) انداز کو

۲۔ ہنگامی سیاست کے موضوعات پر اظہارِ خیال یا ان کے ذکر اور ان کے بارے میں پیغامِ عمل کو (یعنی ان کا تعلق ترقی پسند فکر کے بجائے وسیع تر حکمتِ عملی (Strategy) کے بجائے وقتی طریقِ کار (Tactics) سے تھا۔

۳۔ بعض موضوعات اور تصورات کے دہرانے کو

اگر ترقی پسندی کی یہی پہچان ہے (اور مدتوں بعض نقادوں کو اسی پر اصرار رہا) تو غزل تو کیا کسی بھی تخلیقی فن پارے میں پوری طرح برتنا اور برتتے رہنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ کیوں کہ اس فارمولے میں فکر کا عنصر دبا ہوا ہے۔ داخلی احساس اور نجی تاثر کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہے اور شعری حسن کی لطیف رمزیت ناپید ہے۔

اس کے مقابلے میں اگر ترقی پسندی نام ہے:۔

۱۔ بالواسطہ یا براہ راست، رمزیہ یا علانیہ انداز میں

۲۔ فکر و احساس کے ایسے اظہار کا جو انسان میں سماجی تبدیلی کی خواہش بیدار کرے اور

۳۔ زندگی اور کائنات کی طرف صحت مند رویہ پیدا کر سکے

تو یقیناً یہ ترقی پسندی وسیع تر آگہی سے عبارت ہو گی: مصرعہ

محض بنگال یا ادبیت نام کے موضوع پر مشقِ سخن کافی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات سے جو مجموعی تصورِ حیات ابھرتا ہے وہ حیات آفریں ہے یا زہرِ قاتل۔ اور یہی مجموعی نظریۂ حیات یا زندگی کی طرف رویہ کسی فن کار کی عظمت کی پہچان ہے۔

ہر دور اپنا نظریہ ساتھ لاتا ہے۔ یہ نظریہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور نئی قدروں میں ڈھلتا رہتا ہے۔ شکست و ریخت کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔ غزل نئے تجربے کے عطر کو داخلی تاثر کی شکل میں پیش کرتی ہے وہ محض تجربے کو بیان نہیں کر سکتی۔ اس تجربے سے حاصل شدہ تاثر کی مرکزی کیفیت کو پیش کرتی ہے اس لئے کسی نظریے کو جب تک غزل کو تجربے میں اور پھر تجربے سے حاصل ہونے والی تاثر کی کیفیت میں نہ ڈھالے، غزل میں اسے پیش نہیں کر سکتا۔ ایک بار یہ عمل مکمل ہو لے تو پھر غزل کی مخصوص لفظیات بار بھی نہیں ہوتیں بلکہ ان کی توسیع ہوتی جاتی ہے اور پرانے الفاظ نئے معنی حاصل کرتے جاتے ہیں لیکن اگر یہ نظریہ نہ بنا یا تجربہ بھی تاثر کی کیفیت میں نہ ڈھلا تو وہ ادھر پھرا رہے گا اور غزل میں یہ چور صاف پکڑا جائے گا۔

مجروح نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ کم گو شاعر ہیں، کم لکھتے ہیں اور اس سے کم چھپواتے ہیں اس لئے اپنے منتخب کلام میں جہاں وہ اس مہم میں کامیاب ہوئے ہیں وہاں ان کے شعر بے پناہ ہیں۔ اور وہی نئی غزل کی یادگار بلندیوں کے نشان کے طور پر یاد رکھے جانے کے قابل ہیں۔

مجروح سلطان پوری نے نظم اور گیت کے شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی "گائے جا پپیہے گائے جا" اور "کیا جانے مجھے کیا یاد آیا" متعدد مشاعروں میں مقبول ہوئے۔ طب میں دست گاہ حاصل کی، طبیب تھے اور خاصے کامیاب طبیب کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی وساطت سے علی گڑھ اور جگر مرادآبادی کی وساطت سے بمبئی کی فلمی دنیا تک پہنچے ۱۹۴۴ء میں فلم شاہ جہاں میں کے ایل سہگل مرحوم مجروح سلطان پوری کا

(بقیہ صفحہ پر)

مجروحؔ کے مجموعۂ کلام کا دیباچہ

خود شاعر کے قلم سے

مطلع عرض کرنے سے پہلے :

میرے نزدیک شاعری کی پہلی اور آخری شرط یہ ہے کہ وہ سامع و قاری کے خیالات اور جذبات کی رفیق ہو۔ اس کے بغیر نہ تو اُسے قبولِ عام کی سند مل سکتی ہے اور نہ اُسے معتبر کہا جاسکتا ہے۔ ایک بات اور کہ وہ اعلیٰ سے اَوسط درجے کے اذہان کے لیے سہل الحصول ہو کیونکہ اس کی افادیت کا تعین ہم اسی سے کرسکیں گے۔ یہاں اُن لوگوں سے اُلجھ کر مجھے وقت ضائع نہیں کرنا ہے جو افادیت کو حرفِ غلط سے زیادہ وقعت نہیں دیتے ——— میں تو اُن سے مخاطب ہوں جو اس لفظ کو زندگی کی طرح وسیع رنگا رنگ اور لابدی سمجھتے ہیں کہ میں نے صنفِ غزل کو اپنے لیے اس لحاظ سے بہتر جانا کہ اس کا ایک کامیاب شعر اپنے اختصار و دل نشینی کے باعث ابلاغ و ترسیل کی سہولتیں زیادہ رکھتا ہے۔ غزل کا دوسرا حسن اس کی غنائیت ہے، یعنی نثر کے مقابلے میں جس طرح نظم کی دلپذیری مسلم ہے اسی طرح غزل کی غنائیت نے اسے مشرق کی دوسری اصنافِ سخن کے مقابلے میں زیادہ قبول صورت بنادیا ہے۔

ویسے میں اُن اصحابِ علم و خبر کو بھی جانتا ہوں جو غزل کا تعارف غیر ملکی ادیبوں سے کراتے وقت اُسے [illegible] کا نام دیتے ہیں۔ باہر کے لوگ بیچارے غزل کی روایات اور اس کے کس بَل سے قطعی ناآشنا ہوتے ہیں، لہٰذا وہ غزل کو اور اس طرح ہمارے میرؔ و غالبؔ جیسے دیوصفت شعرا کو poet کے بجائے Lyricist سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مجھے تسلیم کہ اُن لوگوں کو سمجھانے کے لیے اُن کے پاس یہی لفظ ہے، لیکن ایسا لفظ استعمال کرنے سے حاصل کیا، جس کے ذریعے غزل کا صحیح تعارف نہ ہوسکے۔ ہمارے ان حضرات کو ایسے لفظ کی تلاش کرنی

چاہیے جس میں غزل کے نظام کی تشریح کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت کے معانی بھی پوشیدہ ہوں میں اُن صاحبان سے بھی مل چکا ہوں جو یہ فیصلہ سُناتے سُناتے بوڑھے ہو چلے ہیں کہ غزل اندھی ہے، لنگڑی ہے گونگی ہے۔ یہ نظم کی شہزادیوں میں بار نہیں پاسکتی۔ لیکن انھوں نے چار و ناچار یہ بھی ہمیشہ ہی دیکھا کہ غزل کہ غزل کے شعر کا جادو ان کی تحریروں، تقریروں میں اُن کے سر چڑھ کر بولتا رہتا ہے۔ آخر وہ کون سی کمی ہے جسے ایسے موقعوں پر دوسری اصنافِ سخن پورا نہیں کرسکتیں۔ دراصل یہ وہی سہل الحصول ہونے والی صفت ہے اور دو مصرعوں میں ایک جہانِ معنی سمو دینے والا ہنر۔ فنِ شاعری میں اشاریت کا کمال اور ایمائیت کی حد تک دیکھنا ہو تو غزل کے علاوہ کہیں دوسری طرف نہ دیکھیے۔

ویسے ہمارے اُن غزل دشمن حضرات کی نئے پن کی جستجو اگر افراط و تفریط کا شکار نہ ہوتی تو قابلِ تحسین ہوتی مگر چونکہ ان کا یہ رویہ حقیقت پسندی سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتا اس لیے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ جدّت کی دیوی ان کے اذہان سے باہر کبھی جلوہ نہیں دکھائے گی ورنہ اگر ان کا طریقہ حقیقت پسندانہ ہوتا تو یہ ہمدردی اور باریک بینی کے ساتھ اردو شاعری کے قومی و روایاتی کردار کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے سرمایے سے کچھ نمونے چُنتے اور تعمیری طریقہ اختیار کر کے اس کے امکانات پر بحثیں کرتے کہ اردو نظم و غزل کے فلاں فلاں رویے کو ترقی دی جاسکتی ہے، فلاں فلاں عنصر کو اپنا مشرقی مزاج قائم رکھتے ہوئے کس طرح جدید بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن ان حضرات کی ابھری بصارت کا یہ عالم ہے کہ نظم کے علاوہ نئی غزل کا ارتقا اس کی مسلسل تبدیلی جو پچھلی چوتھائی صدی سے زیادہ پر پھیلی ہوئی ہے، انھیں کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔

ہمارا شعروادب سادگی و پُرکاری، خلوص اور گہرائی میں اپنا ایک انفرادی رنگ رکھتا ہے، اس کا دل ہمیشہ سے بڑا کشادہ رہا ہے۔ وہ یورپ سے بھی بہت کچھ لے رہا ہے، بہت کچھ لے گا۔ مگر اپنے رنگ اور اپنے لب و لہجے میں ڈھال کر۔ لہٰذا جب اردو شعروادب کے رنگ اور لب و لہجے کی بات چلے گی تو غزل کو بھی ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔ ان ارباب محترم کو مولانا حالی کی غزل دشمنی تو یاد رہی، لیکن یہ بھول گئے کہ خود مولانا کی "مادرِ ہند" بیٹھو والی شاعری

کا کیا سوال پیدا ہوا۔ البتہ انھوں نے شاعری میں قومی بیداری کی جو روح پھونکی تھی، وہ اقبال اور جوش کی راہوں سے گزرتی ہوئی جب ترقی پسند تحریک کے سانچے میں ڈھلی ہے تو اس تحریک کی بدولت وہ روح خود غزل میں واضح طور پر ظاہر ہوئی اور آج نئی غزل میں فراق، مجاز، فیض، جذبی، جمیل مظہری اور میرے ساتھ اور بھی کئی نام، اختر سعید، حسن نعیم، تاج بھوپالی، سماحت علی خالق، غلام ربانی تاباں، قتیل شفائی، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختر کے سوا بھی ہیں۔ اور جہاں تک جدتِ محض کا سوال ہے، تقسیم ہند سے پہلے ترقی پسند مصنفین کے پہلو بہ پہلو اس وقت، حلقۂ ارباب ذوق کی کاوشیں بالکل ایسی ہی تھیں جیسی کہ آج کے جدید شاعروں کی کوششیں اور اس میں شک نہیں کہ ذہنی بے راہ روی اور لہجے کے نئے پن کی حد تک اس وقت کے حلقۂ ارباب ذوق سے لے کر آج کے جدید شاعروں تک نے نظم و غزل پر کسی قدر اپنا اثر چھوڑا ہے۔ لیکن زندہ و توانا، حسین و صحتمند جدت اب تک اگر اردو کے شعری و ادبی سرمائے میں آئی ہے تو وہ ترقی پسند تحریک اور صرف ترقی پسند تحریک کی بدولت۔ جس کے علی الرغم آج دشنام طرازی کو فیشن بنا لیا گیا ہے۔ یہ تسلیم کہ اس تحریک کے ارباب حل و عقد نے کچھ غلطیاں بھی کیں ہیں، یہ اعتراف کر لینے میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہیے کہ ہمارے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں میں وہ جو ایک امامانہ شان آگئی تھی کہ ان میں سے بعض نے تو اپنے بارے میں یہاں تک طے کر لیا کہ جو اُن سے ملتا رہے وہ ترقی پسند اور جو اُن سے ملنا ضروری نہ سمجھے اس کا کردار مشکوک۔ گویا ترقی پسند تحریک خود ان کی ذات کا نام ہے۔ یہ اور اسی قسم کی افراط و تفریط شعر و فن کے سلسلے میں بھی ہم سبھی سے ہوئی یہ اور بات کہ ہمارے تمام محاسن پر اُن چند غلطیوں کی سیاہی پھیری جاتی رہی۔ بہر حال ان باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر بصیرت اور ایمانداری سے کام لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ اس تحریک نے جو اثرات چھوڑے ہیں وہ ماہتاب و آفتاب کی طرح آج سارے عالم شعر و ادب پر ضیا افشانی کر رہے ہیں۔ آج اُن ہزاروں محاسن پر چند غلطیوں کی دھول اُڑا اُڑا کر بچوں کی طرح شور مچانا نہ کوئی نظری جدت ہے، نہ ادبی خدمت۔ ہمارے جدید شعرا میں ایسے تو ملتے ہیں کہ وہ اپنی ذہنی ایمانداری کے ثبوت کے طور پر بیک نفس سوشلزم اور سرمایہ داری کا

اخلاق اور بے کرداری سب کی نفی کرتے ہیں، بلکہ زندگی اور سماج کی ساری بچی قدروں سے انکار کرکے بے انتہا ذہین و ایماندار ہونے کا ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جس وقت وہ ترقی پسند تحریک کی برکتوں سے معاندانہ حد تک انکار کرتے ہیں تو ان کی ذہانت و ایمانداری دونوں کی اوقات ظاہر ہو جاتی ہے۔ ورنہ اگر خوب سے خوب تر کی جستجو تھی تو اُن کی آنکھ اس حقیقت کی طرف سے بند نہیں ہونی چاہیے کہ شعر و ادب میں زندگی کی تمام متحرک اور اہم قدروں کے اظہار اور فن میں نئے پن کی جو گنگا اس تحریک نے بہائی تھی آج کے جدید حضرات بالواسطہ ہی لیکن ہاتھ منہ اسی میں دھوتے نظر آرہے ہیں۔ خود ان کے لیے مثال اختر الایمان کی شاعری سماجی و معاشی ناکامیوں کی ریت میں پاؤں دھنسائے انھیں موجوں میں کھڑی ہے۔ اسی طرح اگر ہمارے جدید شعرا بھی (وحید اختر، قاضی سلیم کے خلل دو ایک کو چھوڑ) زندگی کی کسی دلدل میں، کسی چٹان پر پاؤں ٹکائے نظر آتے تو ہم زمین والو کے لیے اس سے زیادہ خوشی کا مقام اور کیا ہو سکتا تھا۔ پچھلے جدّت پسندوں میں، ن۔م راشد کی شاعری کے رگ و ریشے میں سیاست و سماجیات ہی سے پٹے ہوئے ہیں (ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف یا اتفاق بالکل الگ چیز ہے) رہ گئے میراجی ___ تو ان کے بارے میں بھی لوگ جانتے ہیں کہ انھیں "داغ دھبّوں" کی شاعری زیادہ مرغوب تھی۔

لیکن بایں ہمہ جدید شاعروں کے ہاتھوں پر لسنے پودے میں نئی کونپل پھوٹ رہی ہے اور وہ ہے شعری لہجہ کا ایک اور نیا پن۔ اگر اس کی آبیاری سبّ و شتم کے بجائے خونِ جگر سے ہو سکی، اس لہجے کو صحیح معانی مل سکے اور ان کے پاؤں کے نیچے زمین بھی رہی تو کچھ دنوں بعد عجب نہیں کہ ان کے سامنے ہمیں اپنی شاعری کی زبان پرانی معلوم ہونے لگے لیکن اکثر و بیشتر شاعروں کے موجودہ رویّے کو دیکھتے ہوئے مستقبلِ قریب میں یہ خیال حقیقت بنتا نظر نہیں آتا۔

مجروح سلطان پوری

غزل کے منتخب اشعار

شمع بھی اُجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر دیکھ

ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ
سوچتی رہی دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے

وہ بعد عرضِ مطلب ہائے رے شوق جواب اپنا
کہ وہ خاموش تھے اور کتنی آوازیں سنیں میں نے

دل سے ملتی تو ہے اک راہ کہیں سے آگے
سوچتا ہوں یہ تری راہ گزر ہے کہ نہیں

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروح
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

دستِ منعم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سرِ بازار سہی

میں نے دیکھی ہے اسی میں غمِ دوراں کی جھلک
بے خبر رنگِ جہاں سے نگہِ یار سہی

سوال اُن کا، جواب اُن کا، سکوت اُن کا، خطاب اُن کا
ہم ان کی انجمن میں سر نہ کرتے خم تو کیا کرتے

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گُل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروحؔ
ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

شبِ انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ بجھا دیا، کبھی اک چراغ جلا دیا

جفا کے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمھاری بات نہیں، بات ہے زمانے کی

کچھ بتا تو ہی نشیمن کا پتا
میں تو اے بادِ صبا بھول گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور قافلہ بنتا گیا

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

ڈرا کے موج و تلاطم سے ہم نشینوں کو
یہی تو ہیں جو ڈبویا کیے سفینوں کو

جمالِ صبح دیا، روئے نو بہار دیا
مری نگاہ بھی دیتا خدا حسینوں کو

مظہر امام

غزل

تجھے بھی جانچتے، اپنا بھی امتحاں کرتے
کہیں چراغ جلاتے، کہیں دھواں کرتے

کئی تھے جلوۂ نایاب تجھ سے پہلے بھی
کس آسرے پہ ترا نقش جاوداں کرتے

سفینہ ڈوب رہا تھا تو کیوں نہ یاد آیا
تری طلب، ترے ارمان کو بادباں کرتے

محبتیں بھی تری ہیں، شکایتیں بھی تری
یقین تجھ پہ نہ ہوتا تو کیوں گماں کرتے

ہوا تھی تیز، جلاتے رہے دلوں میں چراغ
کٹی ہے عمر، لہو اپنا رائگاں کرتے

وہ بے جہت کا سفر تھا، سوادِ شام، نہ صبح
کہاں پہ رکتے، کہاں یادِ رفتگاں کرتے

حصارِ خواب اٹھایا، چمن چمن میں رہے
مگر یہ غم ہی رہا، خود کو شادماں کرتے

قاضی عبدالودود کے لیے پرویز شاہدی ایوارڈ

بنگال اردو اکادمی نے انعامات کا اعلان کیا

کلکتہ ۷ مئی۔ مغربی بنگال اردو اکادمی نے سنہ ۱۹۸۱ء کی طبع شدہ کتابوں پر ایوارڈ دینے کے فیصلہ کا اعلان کر دیا ہے۔ آٹھ ہزار روپے کا پرویز شاہدی کا ایوارڈ (کل ہند سطح پر) مشہور دانشور قاضی عبدالودود (پٹنہ) کو دیا گیا ہے۔ پانچ ہزار روپے کا مولانا ملیح آبادی ایوارڈ (کل مغربی بنگال سطح پر) کلکتہ کے مسٹر لطیف الرحمٰن کو ملا ہے۔

کل ہند انعامات کی تفصیل یہ ہے۔

پہلا انعام۔ تین ہزار روپے فی کتاب "اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء" (ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری) کلیاتِ چکبست (کالی داس گپتا رضا) سید نجیب اشرف ندوی شخصیت اور کارنامے (ریاست علی تابش) ایران۔ عہد قدیم کی سیاسی، ثقافتی اور لسانی تاریخ (ڈاکٹر اشرف عالم) افکار رومی (مولانا عبدالسلام خاں)۔

دوسرا انعام۔ دو ہزار روپے فی کتاب۔ اصناف سخن اور شعری ہیئتیں (شمیم احمد) دردِ تہہ جام (نازش پرتاب گڑھی) نند گلاب (رضیہ سجاد ظہیر) جدید رہنمائے علاج (عبدالجبار) غزالی شہدی (ڈاکٹر سلمان عباسی)۔

تیسرا انعام۔ ڈیڑھ ہزار روپے فی کتاب۔ اردو ناول آزادی کے بعد (ڈاکٹر اسلم آزاد) نئی تعلیم کے مسائل (باقر مہدی) ہند کی اردو صحافت (ڈاکٹر محمد افضل الدین) بے سمت (مسترد حیات) پتھر الپتھر (اوپندر ناتھ اشک) رقص مے (خمار بارہ بنکوی) مثنوی حزن اختر (امجد علی خان) ورقِ انتخاب (شاذ تمکنت)۔

اعزازی انعامات: پانچ سو روپے فی کتاب۔ دکنی مثنویوں میں منظر نگاری،

(ملنسار اظہر احمد) وادیٔ غزل (رفعت سروش) شفق رنگ آنسو (رشی پٹیالوی) بھاونیہ

نامہ (مظفر مجاز) البتہ (یوسف ناظم) تذکرہ شعرائے اتر پردیش (عرفان عباسی) نقاضائے

میں (محمد عبدالقادر ادیب) مرزا سلامت علی دبیر (ڈاکٹر مرزا محمد زماں آزردہ) چراغ

منزل (دواکر راہی) سلطان خیر خواہ سوزی (حسن آرزو) ساحر لدھیانوی ایک مطالعہ

(محمود سعیدی) امیر خسرو اور علی گڑھ (محی الدین اظہر) مفت کے مشورے (سرور جہاں)

مٹی کا بلاوا (ڈاکٹر حکیم حنفی) پرکی تتلی (ہنس راج) دیدار (ڈاکٹر پریم لال) اقبال نامہ

(ڈاکٹر اخلاق اثر) زمزمے (حبیب آروی) نقش ہائے رنگ رنگ (سید رضی الدین احمد)

عکس تمنا (کمال جعفری) یادوں کے کھنڈر (نند کشور وکرم)۔

کل مغربی بنگال انعامات:

دوسرا انعام۔ دو ہزار روپے فی کتاب۔ ڈوبتے سورج کا کرب (عابد ضمیر) مجموعہ

معراج العاشقین (ثریا پروین)۔

ناشروں کو دیے جانے والے انعامات:

(الف) ادبی کتابوں کی اشاعت پر۔ پہلا انعام ایک ہزار روپے۔ ایجوکیشنل

پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی۔

دوسرا انعام۔ پانچ سو روپے۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ مکتبہ پیام تعلیم نئی دہلی۔

خوبصورت اشاعت پر انعامات پانچ سو روپے۔ (۱) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

دہلی۔ کتاب کا نام۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل۔ (۲) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

دہلی۔ کتاب کا نام۔ انیس شناس۔

ان مسودوں پر اشاعتی اعانت منظور کئے گئے:

(۱) عکس الہام۔ امین جعفری ۲۷۰۰ روپے (۲) اہو کا درد۔ نشتر خزالی۔ ۲۷۰۰

روپے (۳) پرو تیتھس۔ جاوید دانش۔ ۲۷۰۰ روپے (۴) بدلتے موسم کی آہٹ۔ اشہر ہاشمی

تین ہزار روپے۔ (۵) احساس و افکار۔ ڈاکٹر نظام الدین نظام ۲۵۰۰ روپے۔

شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی میں

عصمت چغتائی صاحبہ کی تشریف آوری

۱۰ اپریل ۱۹۸۳ء کو اردو کی مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ جو بنارس ہندو یونی ورسٹی کے مہیلا مہاودیالیہ کی گولڈن جبلی تقریبات میں شرکت کرنے کے لیے آئی تھیں، اساتذہ اور طلبہ وطالبات کی دعوت پر شعبۂ اردو میں تشریف لائیں۔

صدر شعبۂ اردو پروفیسر حکم چند نیر نے اُن کا استقبال کیا۔ اور کہا کہ ان کی ادبی تخلیقات کی عظمت اور اہمیت کے بارے میں اس وقت صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ فخر بہت کم ادیبوں کو حاصل ہوتا ہے کہ ان کی حیات ہی میں اُن کی تخلیقات بہ یک وقت اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں پڑھائی جائیں اور محترمہ عصمت چغتائی کو یہ فخر حاصل ہے۔

عصمت چغتائی صاحبہ نے تقریر کرنے کے بجائے طلبہ وطالبات اور اساتذہ سے غیر رسمی گفتگو کرنا پسند فرمایا۔ ایک سوال کے جواب میں عصمت چغتائی صاحبہ نے فرمایا کہ ہر شریف آدمی ترقی پسند ہوتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ترقی پسند کمیونسٹ بھی ہو۔ کیونکہ کمیونزم ایک سیاسی نظریہ ہے۔ ایک دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں نعرے بازی میں اعتقاد نہیں رکھتی اور یوں بھی مرغیوں کو اذان نہیں دینی چاہیئے۔ اس طرح وہ ایک گھنٹے تک مختلف موضوعات اور سوالات کا جواب دیتی رہیں۔

آخر میں ڈاکٹر حنیف نقوی، ریڈر شعبۂ اردو نے کہا کہ عصمت چغتائی صاحبہ کی پرکشش شخصیت اور دل کش فن ہماری تہذیبی اور ادبی زندگی کا بیش قیمت اثاثہ ہیں۔ شعبۂ اردو میں تشریف لا کر انھوں نے ہمیں ممنون ومتشکر فرمایا ہے۔

مسودات کی اشاعت کے لیے مالی امداد

اُردو اکادمی کا فیصلہ

اترپردیش اُردو اکادمی نے مندرجہ ذیل مسودات کی اشاعت کے لئے ان کے مصنفین کو جزوی مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ مسودے ۹۳-۱۹۹۲ء مالی سال میں اشاعت پذیر ہوں گے:

کتاب کا نام	مصنف کا نام
۱۔ پریم چند کا فکری و فنی مطالعہ	جناب سید محمد عظیم
۲۔ شفیق جون پوری: حیات اور فن	جناب ایس، ایم، عباس
۳۔ فراق کی شاعری	ڈاکٹر افغان اللہ خاں
۴۔ طبیب کی ڈائری	جناب خالد جاوید شمسی
۵۔ ہمدری افادی	ڈاکٹر فیروز احمد
۶۔ اُردو میں خطوط نگاری کا ارتقا	ڈاکٹر رشیدہ خاتون
۷۔ انیسویں صدی کے اُردو ڈرامے	ڈاکٹر محمد شاہد حسین
۸۔ شب چراغ	حسن نجمی سکندر پوری
۹۔ گلدستہ	جناب جوہر رحمانی
۱۰۔ آدھے ادھورے	جناب خورشید عالم
۱۱۔ اردو ادب میں ہندوستانی مسیحیوں کا حصہ	جناب ایس ڈی برسین قربان
۱۲۔ اُردو میں نظم معرا اور آزاد نظم	ڈاکٹر حنیف قریشی
۱۳۔ نبض	جناب جمیل احمد قادری جائسی
۱۴۔ معالجات نظام ہضم و تولید	جناب علی حیدر جعفری

اکادمی کی امداد یافتہ لائبریریوں کی فہرست میں اضافہ
نئی لائبریریوں کا انتخاب

اتر پردیش اُردو اکادمی ہر سال ایک لاکھ سے زائد رقم اُردو کے کتب خانوں کو بطور امداد دیتی آئی ہے۔ اس سال امداد کے لیے جن نئے کتب خانوں کا انتخاب کیا گیا ہے، ان کی فہرست یہ ہے:-

۱۔ شمیم ادب اُردو لائبریری، کرہاں ضلع اعظم گڑھ
۲۔ مدنی لائبریری جمعیت الطلباء، مدرسہ اسلامیہ انوار العلوم اداری گنج پوسٹ چہاٹا ضلع بہرائچ
۳۔ یوتھ ودنگ لائبریری تعلیمی مجلس، گنور ضلع بدایوں
۴۔ مولانا حسرت موہانی میموریل اُردو لائبریری ۳۲۶ لکھپیڑا باغ، بارہ بنکی
۵۔ قومی ایکتا لائبریری، قصبہ متھی ضلع بارہ بنکی۔
۶۔ دارالمطالعہ نسواں، مدرسہ نسواں کٹہرہ شہاب خاں۔ اٹاوہ
۷۔ قومی لائبریری۔ ممتاز گنج، ٹانڈہ ضلع فیض آباد
۸۔ دارالفیض لائبریری۔ مدرسہ کرایتہ دارالفیض، جلال پور، فیض آباد
۹۔ مولانا ابوالکلام آزاد جنتا کتب خانہ، دارالمطالعہ صمدیہ۔ ضلع فرخ آباد
۱۰۔ آزاد میموریل اُردو لائبریری، پرانا بازار، چھپیڑوا۔ ضلع گونڈہ
۱۱۔ عاشق پبلک لائبریری، عاشق باغ، بلہور کان پور
۱۲۔ کتب خانہ انجمن دارالتعلیم، جاج مئو، کان پور
۱۳۔ سراج العلوم اُردو لائبریری۔ سدھولی ضلع سیتاپور
۱۴۔ شبنم لائبریری ماکور۔ ضلع اناؤ
۱۵۔ غوثیہ دارالمطالعہ بازار ڈیہہ۔ وارانسی
۱۶۔ کتب خانہ جامعہ عربیہ مطالعہ علوم گیان گڑھا۔ وارانسی
۱۷۔ بچوں کا پستکالیہ ڈی ۱۲/۴۵/۱۰۳ گورباغ، وارانسی

دوسری زبان کی حیثیت سے اردو کا دوسرا مقام

سرکاری نوٹی فکیشن ۲۱ اپریل سے نافذ

حکومت اتر پردیش نے سرکاری زبان ایکٹ میں ترمیم کر کے اردو کو یوپی میں بعض مخصوص مقاصد کے لیے سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لیے ۷ اپریل ۱۹۸۲ء کو جو آرڈیننس جاری کیا تھا وہ ۲۱ اپریل سے ایک سرکاری نوٹی فکیشن جاری ہو جانے کے بعد اب نافذ العمل ہے اور ریاست میں اردو کا استعمال ان پانچ مقاصد کے لیے کیا جائے گا جن کی صراحت آرڈیننس میں کر دی گئی ہے۔

جن مقاصد کے لیے یہ آرڈیننس جاری کیا گیا تھا ان کے مطابق (۱) اردو میں دی جانے والی درخواستوں کا قبول کیا جانا (۲) ہندی نقل کے ساتھ رجسٹری کے لیے اردو میں دستاویز کا قبول کرنا (۳) اہم قوانین و ضوابط اور نوٹی فکیشن کی اشاعت (۴) سرکاری اشتہارات کی اشاعت (۵) یوپی گزٹ کے اردو ترجمے کا شائع کیا جانا شامل ہے۔

اب اتر پردیش میں تمام سرکاری افسران اور عدالتوں کے لیے اردو میں دی جانے والی تمام درخواستوں کا قبول کرنا لازمی ہو گیا ہے اور نوٹی فکیشن کے جاری نہ ہونے کا جو عذر کیا جاتا رہا ہے وہ عبث مانا جائے گا۔ یہ نوٹی فکیشن جس کا نمبر ۱۹۷۹/۲۲-۸۲-۱۹۸۰/۱ مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۸۲ء ہے، تمام متعلقہ محکموں کے نام جاری کر دیا گیا ہے اور ریاست کے غیر معمولی گزٹ میں شائع کیے جانے کا حکم بھی دیا جا چکا ہے۔

کلکتہ یونی ورسٹی میں اردو شعبہ کا افتتاح

کلکتہ یونی ورسٹی میں اردو کا شعبہ باضابطہ اور خود مختار ہو کر وجود میں آگیا ہے اب تک جدید ہندوستانی زبانوں کے شعبے میں ضم تھا اور اردو شعبے کا [illegible] افتتاح وائس چانسلر ڈاکٹر آر۔ کے۔ پودار نے بدھ کے روز کیا جب [illegible] خوشی میں سہ روزہ جشن کا آغاز ہوا۔ اردو شعبے کے پہلے پروفیسر [illegible]

یہ سارا اردو شعبے کی افتتاحی تقریبات کا آغاز سینٹ ہال دربھنگہ بلڈنگ میں ہوا۔ ڈاکٹر [illegible] نے افتتاح کرتے ہوئے کہا [illegible] اس کا ادب کافی وزنی اور قیمتی ہے۔ یونی ورسٹی میں اردو کے علاوہ شعبہ قائم ہونے سے ہم کو بڑی مسرت ہے اور اس کی ترقی کے لیے ہم ہر ممکن تعاون کریں گے۔

کلکتہ یونی ورسٹی میں اقبال چیئر پر تقرر کے سلسلے میں وائس چانسلر ڈاکٹر پوددار نے کہا کہ ابھی فیض صاحب نے اقبال چیئر کے پروفیسر کی پیش کش کو قبول کرنے کے بارے میں کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ اقبال پروفیسر کی حیثیت سے فیض احمد فیض کی تقرری یقیناً اردو شعبے کی ترقی کا سبب بنتی۔ بہرحال ہم فیض صاحب کے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔

امتحان کے پرچے اردو میں ہوں گے

ثانوی تعلیم کے مرکزی بورڈ کا فیصلہ

نئی دہلی۔ ۴ مئی۔ وزیر تعلیم مسز شیلا کول نے سید شہاب الدین ایم۔ پی کے خط کے جواب میں انھیں مطلع کیا ہے کہ ثانوی تعلیم کے مرکزی بورڈ نے اردو کے ذریعہ تعلیم پانے والے طلبا کو اردو میں امتحان کا پرچہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ مسئلہ بہت دنوں سے چل رہا تھا کہ اردو والے بچوں کو امتحان میں بڑی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے کیونکہ سوال نامہ انگریزی یا ہندی میں ہوتا ہے یا امتحان کے درمیان ان کا اردو ترجمہ بورڈ پر لکھا جاتا ہے یا پڑھ کر سنایا جاتا ہے اب ان کو اردو ہی میں پرچے ملیں گے۔

ایک ضروری اطلاع!

آپ کی فرمائش پر اردو اکادمی کی مطبوعات کی فہرست آپ کی خدمت میں مفت بھیجی جائے گی۔

اُتر پردیش اُردو اکادمی ملازمین یونین

عہدیداروں کا انتخاب

اُتر پردیش اُردو اکادمی ملازمین یونین کے سالانہ انتخاب میں مندرجہ ذیل عہدیداران/اراکین انتظامیہ بلا مقابلہ منتخب قرار دیے گئے:

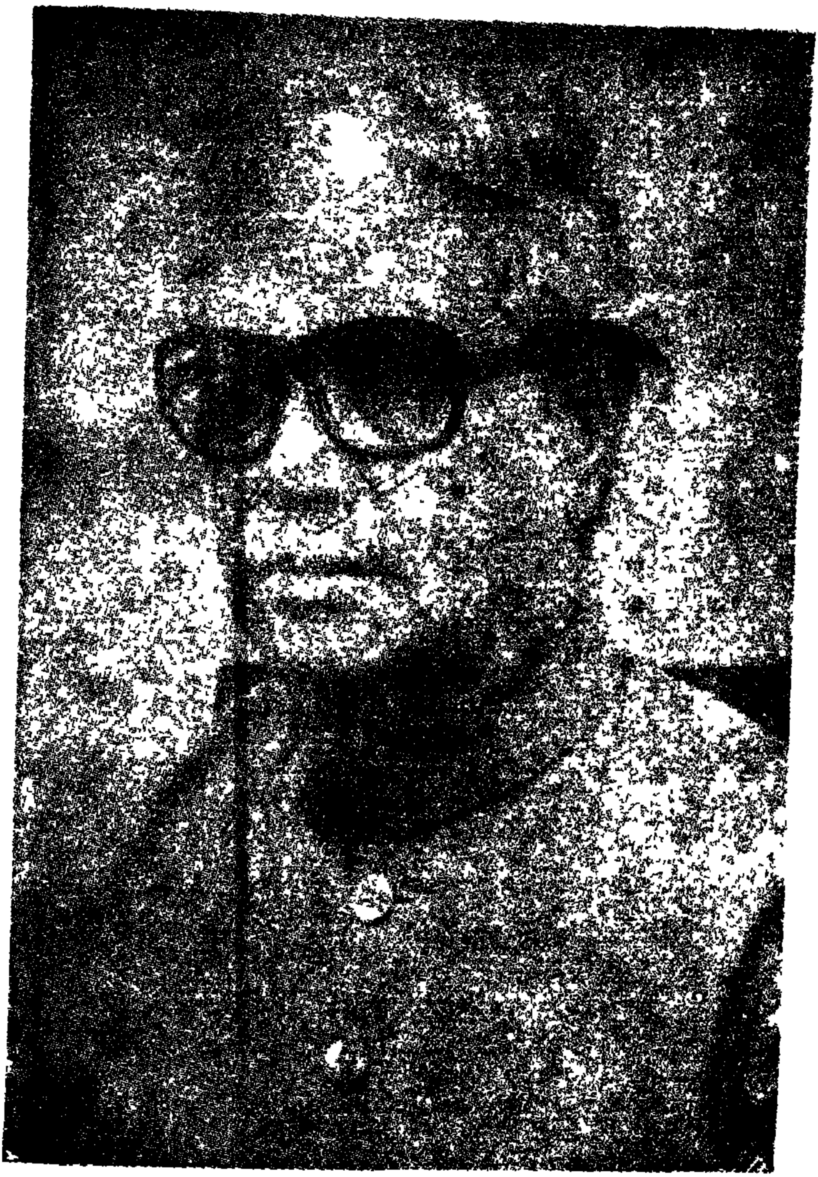
۱۔ صدر : جناب علی باقر زیدی
۲۔ نائب صدر: جناب سراج الدین
۳۔ سکریٹری : جناب محمد درویش
۴۔ جوائنٹ سکریٹری: ۱۔ جناب علیم اللہ صدیقی
۲۔ جناب سید واجد حسین
۵۔ خزانچی : جناب عقیل احمد

اراکین انتظامیہ

۱۔ جناب اظہر مسعود رضوی
۲۔ جناب اویس حسن قدوائی
۳۔ جناب شمیم حسین
۴۔ جناب فدا حسین حسینی
۵۔ جناب حسین احمد
۶۔ محترمہ شان اسلام
۷۔ محترمہ رخسانہ خان
۸۔ جناب عبد الحبیب
۹۔ جناب محمد صادق

U. P. URDU ACADEMI
KHABARNAMA MAY 82

Regd. No.
LW NP 126

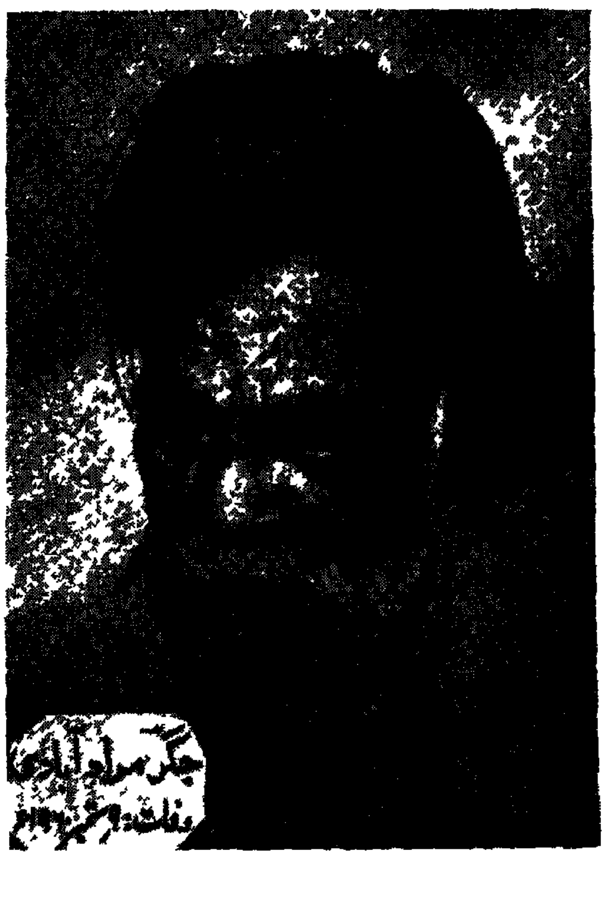


Cover printed at the Luna Printing Press, Hewett Road [illegible] Phone [illegible]

خبرنامہ

اردو اکاڈمی

۱۱ - (۳، ۵، ۷، ۹، ۱۱)



[illegible]

خبرنامہ

جلد [illegible] شمارہ [illegible]

ستمبر [illegible]

ترتیب

سالانہ چندہ: پانچ روپے

فی شمارہ: پچاس پیسے

سرورق تصویر: جگر مرادآبادی

عزیز الجبار خاں، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے دفتر اتر پردیش اردو [illegible] قیصر باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔ اور نامی پریس خاص لکھنؤ نے شائع کیا۔

اُردو اکادمی کے خلاف مہم جوئی

ادھر کچھ دنوں سے اُردو اکادمی کے خلاف مہم جوئی کا ایک سلسلۂ لامتناہی شروع کیا گیا ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اُردو اکادمی کو تعمیری اقدامات سے روک دیا جائے اور حکومتِ وقت کو بدنام کیا جائے۔

یہ سلسلہ اِن معصوم طلبا نے نہیں شروع کیا جن کی وظائف کی رقم غبن کر لی گئی، ان اُدبا اور شاعروں نے نہیں شروع کیا جن کے مسودات کے بارے میں کہا گیا کہ یہ اُردو ادب کی تاریخ میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں مگر وہ زیورِ طبع سے محروم رکھے گئے، اُن قلم کاروں نے نہیں شروع کیا جنہیں وظائف کے بغیر زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا، یہ مہم اکادمی کے اراکین نے نہیں شروع کی جن کے مقدس فیصلوں کو سرِ بازار رسوا کیا گیا اور ان صاحبِ اختیار عہدے داروں نے نہیں شروع کی جنہیں مفلوج بنا کے رکھ دیا گیا تھا۔ یہ مہم اُن عناصر نے شروع کی ہے جو اکادمی کی رگ رگ سے اس کا خون چوس لینا چاہتے تھے اور اُسے عضوِ معطل بنا دینا چاہتے تھے۔ شاید یہ سوچتے ہیں کہ اکادمی کی کردار کشی سے انہیں فردوسِ گم شدہ مل جائے گی۔ یہ مہم اُن لوگوں نے شروع کی ہے جو کسی غبن کے واقعے پر یا اُن تقرّرات پر جو سارے جمہوری اور قانونی آداب کو نظر انداز کر کے عمل میں آئے ہوں، خاموش رہنا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔

اکادمی ایک فعال اور جمہوری ادارے کی حیثیت سے کام کرنے کا سلیقہ جانتی ہے، اسکی اراکین چیلنجوں کا مقابلہ کرنے میں مہارت رکھتے ہیں، حکومت بھی جانتی ہے کہ یہ مہم جوئی کس مقصد کے پیشِ نظر کی گئی ہے۔ اکادمی آگے بڑھے گی اور اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنائے گی۔ اکادمی کو یقین ہے کہ اس نازک مرحلے پر محبانِ اُردو اس امر پر غور کریں گے کہ اُردو اکادمی کے خلاف مہم جوئی کیوں شروع کی گئی ہے۔

——— محمود الٰہی

رانی کیتکی

"کلاس نوٹ" کی صنفِ سخن سے ایجاد ہوئی تعلیم و تعلم کے صدہا مسائل اس نے حل کر دیے ہیں۔ آپ ایک بار محنت کر کے کلاس نوٹ تیار کر لیجیے پھر اسے صدقۂ جاریہ کی حیثیت حاصل ہو جائے گی اور ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو بیمے کے پریمیم کی طرح تنخواہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی رہے گی۔ آج کل کی مصروف زندگی میں طلبہ کے لیے تو یہ نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ جوابات لکھ کر گھر بیٹھے اسے کلاس روم کا جلوہ نظر آ جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ امتحان کے موقع پر "امپارٹینٹ" معلوم کرنے کے لیے وہ دربدری سے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ اسے تجربہ ہو گیا ہے کہ کلاس نوٹ کو نظر انداز کر کے کوئی امتحانی سوال سامنے نہیں آ سکتا۔

اس کلاس نوٹ کی صنف کا ایک اور رخ بھی ہے جس کا جلوہ مجھے حال ہی میں نظر آیا۔ ایم۔ اے کے زبانی امتحان میں میں نے ایک امیدوار سے سوال کیا کہ ایم۔ اے میں نثر کی کون کون سی کتابیں داخلِ نصاب ہیں؟

اس نے برجستہ جواب دیا: "رانی کیتکی" انشاء اللہ انشا جن کے مصنف ہیں [illegible] کلاس نوٹ میں رانی کیتکی کی جگہ رانی کیتلی چھپ گیا ہو گا [illegible] اور اس [illegible] اپنے ساتھی سے [illegible] کلاس نوٹ [illegible] قارئین کے سامنے پیش [illegible]

— ریاض

پروفیسر رشید احمد صدیقی

جگر میری نظر میں

غزل جتنی بدنام ہے، اُتنی ہی مجھے عزیز ہے۔ شاعری کا نام آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہوتا ہے۔ غزل کو میں فن نہیں، اپنی شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔ دونوں کو سمت رفتار ایک دوسرے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس پر [illegible] ضرورتاً، اس کا احترام کرنا چاہیے۔

ہندوستان میں جن دیسی یا بدیسی زبانوں، مولویوں یا روایات کی بڑی ان داتا ہے۔ یا رہی ہے، اُردو ان کی غزل ہے۔ غزل، شاعری ہی نہیں تہذیب بھی ہے وہ تہذیب جو دوسری تہذیبوں کی نفی نہیں کرتی بلکہ ان کی تصدیق بھی کرتی ہے اور تنقیح بھی، کبھی کبھی تزکیہ بھی۔ غزل کے اصطلاحی اور ابتدائی مفہوم پر اب زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ فن ہو، روایت ہو، مذہب و اخلاق ہو ان کا رشتہ اپنے ماسبق سے ضرور ہوتا ہے لیکن ان کا احترام کسی اور بنا پر کیا جاتا ہے۔ غزل کی اہمیت کا انحصار اس پر بالکل نہیں ہے کہ اس میں یا اس کے وسیلے سے عورتوں سے گفتگو کی گئی یا کی جاتی ہے، اس کا احترام [illegible] ہے کہ اس سے گفتگو کرنی آجاتی ہے۔ اُردو ادب میں ہر طرح کے شاعر گذرے ہیں ان کی شاعری کا مقصد و محور بھی جداگانہ رہا ہے لیکن ہماری شاعری [illegible] تو غزل ہی سے جگایا گیا ہے۔

[illegible]

[illegible] ہوگئے، بے راہ روی، جو غزل کا مقصود نہیں ہے۔ اس راہ روی کا مقصود ہے جو چنانچہ کسی [illegible] ہے رہ گذر کے فریب کو منزل مقصود سمجھ لیتا ہے۔ اردو [illegible] کے لوگوں نے زندگی کی بڑی قدروں کی اسی طرح بے توقیری کی ہے۔ غزل کو جینا یا اسے اونچے درجہ کی شاعری قرار دینا پڑھے لکھے سمجھ دار لوگوں کے نزدیک اب ہنسی کی بات سمجھی جاتی ہے۔

صنف شاعری کے اعتبار سے میں غزل کو سب سے اونچا درجہ نہیں دیتا اور نہ اچھے سے اچھے غزل گو کو سب سے بڑا شاعر ماننا ضروری سمجھتا ہوں۔ ٹھیک ساری شاعری بھی نہیں، شاعر کا درجہ اصناف سے متعین بھی نہیں ہوتا۔ شاعری میں کسی مخصوص زندگی، ذہن اور زمانہ کی عکاسی، ترجمانی یا تلاش و طلب بھی خواہ مخواہ سی بات ہے، شاعری دنیا کی مادری زبان ہے، بڑی شاعری وہ ہے جہاں انسان اپنی منزلت محسوس کرے، نہ کہ رنج و راحت، عذاب و ثواب یا [illegible]!

میں شاعری میں تجربات کا قائل ہوں، تجربات میں شاعری کا نہیں یا جو کو تجربہ ہی سمجھتا ہوں، الہام نہیں۔ میں ایسے تجربہ کو لاحاصل اور خطرناک سمجھتا ہوں جہاں نتائج کے پرکھنے کی نہ ہمت ہو نہ توفیق، نہ نیت۔ تجربہ کرنا جتنا آسان ہے اس سے کہیں زیادہ مشکل اس تجربہ سے صحیح نتیجہ اخذ کرنا ہوتا ہے، اپنی کوشش پر فخر کرنا جتنا آسان ہے اتنا ہی اپنی حماقت کو تسلیم کرنا دشوار۔ انسانی تاریخ میں جگہ جگہ اس کی مثالیں ملیں گی۔ فن اور زندگی دونوں میں جان تجربے سے آتی ہے، جو تجربے سے بھاگے یا تجربہ میں پھنس کر رہ گئے، ان کا مستقبل کوئی نہیں، بذاتِ خود میں مستقبل کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں، میں تو ماضی کے مستقبل اور مستقبل کے ماضی کا زیادہ قائل ہوں، مستقبل کا میں یوں بھی عاشق نہیں ہوں بلکہ میں نے اس کا منتظر بالعموم ایسے ہی لوگوں کو پایا ہے جو اپنے مستقبل کے لیے زیادہ فکرمند ہوتے ہیں بہ نسبت کسی دوسرے کے۔

میں شاعری میں اس لیے تجربہ کا قائل نہیں ہوں کہ غزل یا نظم آ [illegible] ہیں، بلکہ اس لیے کہ جو لوگ غزل سے دلچسپی نہیں رکھتے یا [illegible]

[illegible]
میں کسی قید میں بند نہیں ہو سکتی ہے۔ زندگی کے بدل جانے سے شاعری کا بھی ڈھنگ یا موضوع، اسلوب، انداز کا بدل جانا بھی کوئی قباحت نہیں۔ ایسا ہونا بلکہ چاہیے اور ہو کر رہے گا وضع قطع اور موضوع بھی شاعری نہیں ہے شاعری کو وضع قطع میں محدود کر دینا ستم ہے اور موضوع میں مقید کرنا پروپیگنڈہ، مجھے دونوں میں سے کسی ایک پر بھی فخر نہیں۔

سائنس اور نفسیات نے ہمارے ذہن و فکر کو نئی وادیوں اور نئے زاویوں سے آشنا کیا ہے۔ ان کا کام بھی یہی ہے۔ نئی حقیقتیں برابر سامنے آ رہی ہیں جنھوں نے جانی پہچانی حقیقتوں کو کہیں زیادہ اُجاگر کر دیا ہے کہیں ان کو پیچھے ڈھکیل دیا ہے اور کہیں بالکل ختم کر دیا ہے۔ ادب، شاعری، مصوری، زندگی، غرض ہر جگہ یہ اثرات نمایاں ہیں۔ مصوری اور شاعری کا نیا انداز دیکھو کہ ہم طرح طرح سے بدلتے ہیں، یہ بدلنا صحیح نہیں ہے۔ ہم نے حسن کو اپنی پسند یا ناپسند کی باندی بنا لیا ہے لیکن وہ حسن مقید و محدود ہے نہ انسان کی پسند و ناپسند اس لیے پسند و ناپسند کے معاملے میں احتیاط و انصاف کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے، کائنات کا حقیر ترین جز بھی اتنا ہی حسین، عظیم، ناقابلِ فہم یا ناقابلِ تسخیر ہے، جتنا کہ یہ پورا کارخانۂ قدرت۔ اس لیے جزو کل کا تصور اعتباری ہے حقیقی نہیں۔ کائنات حسن بھی ہے اور قانون بھی۔ اس حسن اور قانون کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہم ایسا نہیں کرتے۔ ہم تو اپنی پسند کی صورت کو حسن اور اپنی پسند کی لعنت کو قانون سمجھتے ہیں۔

حقیقی اور بڑی شاعری شاعر کا انفرادی، یگانہ اور لازوال کارنامہ ہوتا ہے برخلاف سائنس کے کارناموں کے جو مشترکہ محنت اور تحقیقات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ایٹم بم بنانے میں معلوم نہیں کتنے سائنس داں اور سائنس کے کارپرداز شریک رہے ہوں گے لیکن اقبال کی نظم "تنہائی" "مسجد قرطبہ" یا "ساقی نامہ" صرف اقبال کے کارنامے ہیں۔ میرا مقصد یہاں سائنس کی اہمیت و عظمت سے انکار نہیں ہے صرف شاعر کا منصب جتانا ہے۔

تیس سال کے اندر دو ایسی بھیانک جنگوں کا وقت میسر آنا جو کی

[illegible]
ہے جب تک اس طرح زیر نظر رہا ہو تو شعر و ادب کے زیر نظر ہو جانے میں کیا تعجب ہو سکتا ہے۔ اب یہ ہمارے حالی دماغ اور پڑھے لکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ بتائیں کہ ہم کس مصیبت یا فریب میں مبتلا ہیں کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم گرفتار تو ان جنگوں کے عواقب کے ہوں لیکن سمجھتے یا سمجھاتے ہوں کہ خود زندگی تعبیر ہے ان عواقب سے۔

مصیبت کو دور کرنا جتنا مشکل ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ سہل، منفعت بخش اور ذلیل مشغلہ اس مصیبت سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہوتا ہے، غلہ پیدا کرنے سے زیادہ منفعت بخش مشغلہ غلہ کی سیہ بازاری ہے۔ کسی قوم یا شعر و ادب کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ قوم یا اس کا شعر و ادب منزلت یا ذلت کے کس درجہ پر ہے۔ ہم میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ادب اور زندگی کی حرمت سے کیا حاصل، جب ان دونوں سے بیچ کھانے میں نفع ہی نفع ہو۔ صنعتی تہذیب اور معاشی بحران میں ایسا ہونا تعجب کی بات نہیں تعجب اس کا ہے کہ صنعتی تہذیب اور معاشی بحران کو انسانیت کا تقاضا یا مقصد یا تہذیب کا محور و منتہا قرار دیا جائے۔

دنیا کتنی ہی تیزی سے آگے کیوں نہ بڑھ رہی ہو انسان کا ذہن ہمیشہ اس سے آگے ہوتا ہے[1]

انسانی ذہن اپنے کارنامے پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ وہ ان کارناموں میں نہ کبھی پناہ لیتا ہے نہ ان کو پناہ دینے کی خواہ مخواہ کوشش کرتا ہے۔ بڑے بڑے کارنامے اپنی حفاظت خود کرتے ہیں، فطرت (نیچر)، افراد کا بالکل نہیں لیکن نوع کا ضرور احترام کرتی ہے۔ اس کے برخلاف آرٹ اور ادب نوع (اصناف) کا احترام بالکل نہیں کرتے۔ افراد (آرٹسٹ اور ادیب) کا کرتے

---

[1] اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں کہ ہے سرپنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا
اس شعر کو غالب کا کارنامہ سمجھیں یا نہ سمجھیں، یہاں اس کا یاد آجانا میرا کارنامہ ضرور ہے

[illegible] آزادی کے [illegible]
اور کے لیے کوئی اور ترکیب اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے، قدیم ہو یا جدید اپنے اظہار یا اقتدار کے لیے فرد کا محتاج ہے۔ کسی اور کا نہیں۔ فرد کی اہمیت سے انکار کرنا جہالت بھی ہے ظلم بھی۔

جگر صاحب کو میں نے ہر حال میں دیکھا اور پایا ہے، جب وہ آپے میں نہ رہتے جب بھی اور ہوش و حواس میں ہوتے جب بھی۔ میں نے ان کو اصغر صاحب مرحوم کے یہاں مؤدب دو زانو بیٹھے دیکھا ہے، اور ایسی مجلس میں بھی جہاں تجبر و تمکنت یا ثروت و اقتدار کی کارفرمائی ہوتی۔ شاگردوں اور عقیدت مندوں کے حلقے میں بھی پایا اور ان لوگوں کی صحبت میں بھی دیکھا جو خود جگر صاحب کی شاعری اور شخصیت پر بڑی بے باکی اور آزادی سے اظہار خیال کرتے، وہ ہمیشہ جگر صاحب ہی ملے۔ سب سے زیادہ نڈر اور بے باک میں نے ان کو بد دماغ رؤسا اور امراء کی صحبتوں میں پایا۔ دوسری طرف کم لوگ ایسے دیکھے جو خوردوں کی دل نوازی اور دوستوں اور بزرگوں کی تکریم میں جگر صاحب سے آگے ہوں۔

مجھے وہ زمانہ خوب یاد ہے جب جگر صاحب پر شراب کا بدترین تسلط تھا اکثر و بیشتر وہ آپے میں نہ ہوتے، عزیز اور عقیدت مند ان کو قدم قدم پر سنبھالتے ہوتے، اس حال میں بھی اُن کی زبان سے کبھی ایسا فقرہ نہ نکلتا یا کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہوتا جس سے خود اُن کو یا اُن کے دوستوں کو شرمندگی اُٹھانا پڑتی، شراب اور شاعری سے بے نقاب کرنے والی کم کوئی چیز ہوگی۔ جگر صاحب کو ان دونوں نے بھی کھول کر بے نقاب کیا، برہنگی کہیں نظر نہ آئی، رکھ رکھاؤ ہر جگہ [illegible] غالب نے کسی ایسے ہی موقع پر کہا ہوگا ؎

پیمانہ بر آں رند حرامست کہ غالب ۔۔۔ در بیخودی اندازۂ گفتار ندارد۔

جگر صاحب کو میں نے شاعری پر بحث کرتے بھی سُنا ہے، وہ شاعری پر بحث نہیں کر سکتے، اپنی پسند یا ناپسند کے اشعار پر وجد کر لیتے یا جھگڑ لیتے ہیں۔ وہ اقبال کی شاعری کے کچھ بہت زیادہ قائل نہیں ہیں، فانی بھی نہ تھے۔ جگر اور فانی دونوں کا شاعری کا نقطۂ نظر شخصی شاعرانہ ہے، غزل گو [illegible]

[illegible]
جوش لیکن مرزا[illegible] کے رنگ کے چھا گیا ہوں جس کے یہاں دونوں میں [illegible]
ہو جائے جگر صاحب اقبال کے قائل ہوں یا نہیں لیکن جہاں وہ جنت سے گنبد
کی جانب میں داخل ہوتے ہیں وہاں اقبال سے ان کو مفر نہیں ہوتا۔ اقبال سے
کس اردو شاعر کو اب مفر ہے۔

جگر کی شاعری نے بعض تنقید نگاروں کو بڑی دل چسپ مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے، وہ کبھی غزل کی مذمت کر کے جگر کی مذمت کرتے ہیں اور کبھی کسی شاعر کی مذمت کر کے جگر کی تعریف۔ مثلاً فلاں شاعر فلاں شاعر جیسا ہے یا نہیں اس لیے وہ اچھا یا برا ہے۔ مثلاً یہ انداز گفتگو:

جگر داغ کے قبیلے کے ہیں۔ فانی اور اصغر یا غالب سے کوئی نسبت نہیں رکھتے ..... جگر سے وہ ذہنیت شروع ہو جاتی ہے جو نئے دور کی اصل روح ہے .... جگر کے لہجے میں جو خود آگہی اور تڑپ ہوتی ہے۔ اس کا داغ اور داغ کے مدرسۂ شاعری میں کہیں پتہ نہیں اور نہ ہو سکتا تھا .... جگر کی شاعری میں جو عاشقانہ دردمندی ہے وہ کچھ ہمارے ہی دور کی چیز ہے ..... جگر کی شاعری بہت سطحی شاعری ہے، نامرادی اور بے چارگی کے احساس نے اُن کے یہاں کچھ نئے عنوان کی نرمیاں ضرور پیدا کر دی ہیں لیکن ادنیٰ درجہ کا بوس و کنار اور سستے قسم کی لذتوں کی ہوس دوسرے شاعروں کی طرح اُن کے یہاں بھی ملتی ہے ..... البتہ جگر کے کلام میں ایک تلملاہٹ پائی جاتی ہے جو ان لذتوں کے میسر نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں، جس کو خود انہوں نے اپنے لیے لذت بنا لیا ہے .... جگر کی شاعری میں نفسیاتی مدارج اور جذباتی رکاوٹوں کا کہیں پتہ نہیں ہے ..... جگر عشقیہ زندگی کے عارضی لمحات کے شاعر ہیں۔ شاعری کی نوجوان نسل نے جگر سے وہ بے باک معصومیت اور باغیانہ اور سرفروشانہ

صداقت اور خلوص [illegible] کی سی زندگی نہیں معنوں میں [illegible] اعلیٰ اخلاقی
تسلیم کیا جا چکا ہے وہ جو نوجوانوں سے جا لگی ہے...... داغ نے جو
تیر کر جگر نے پایا ہے وہ عشق کی آزمودہ کاری ہے...... جگر کے اشعار
میں کسی قسم کی گہرائیاں نہیں ہوتیں ان کے یہاں ایک تھما ہوا ایک
جذباتی ہیجان ضرور ہوتا ہے جس کو ہم اکثر کیف سمجھ لیتے ہیں......
جگر کو حکمت و اخلاق سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ کائنات اور
انسانی زندگی کے اسرار و رموز سوچنے سمجھنے کی اُن کی اندر تاب ہے
نہ اُن کو اس کی فکر کہ وہ زندگی کی ان گہرائیوں اور بلندیوں کا جائزہ
لیں...... جگر کی رسائی فکر و احساس کا دائرہ بہت تنگ ہے
اور ان کے یہاں موضوع کے اعتبار سے زیادہ تنوع بھی نہیں۔ اس
لحاظ سے وہ اپنے معاصرین مثلاً عزیز، فانی، اصغر وغیرہ کے مرتبہ کو
نہیں پہنچتے...... جگر کے اشعار میں جو نیا پن ہے اُس کا تعلق
دراصل انداز و اسلوب سے زیادہ ہے، فکر و احساس سے کم ہے
وغیرہ۔

یہ باتیں اور اس طرح کی باتیں جگر کے کلام پر صادق آتی ہوں، یا نہیں نقاد کے ذہنی اضطراب و انتشار کی غمازی ضرور کرتی ہیں۔ جگر ہی کی شاعری پر نہیں بلکہ شاعری پر بھی ہمارے اکثر نقاد اظہار خیال کرتے ہیں تو بالعموم اُن کے سامنے یا تو اقبال کی شاعری ہوتی ہے یا ترقی پسند نظریے۔ اقبال کی شاعری اور ترقی پسند نظریے دونوں اپنی اپنی جگہ مسلّم، لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شاعر انھیں دو حلقوں میں اسیر ہو، بالخصوص غزل گو! لیکن اس سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ذہنوں پر اقبال کی کیسی مضبوط گرفت ہے یا ہماری نیتوں پر ترقی پسندی کے نظریے کس درجہ مسلط ہیں۔

یہاں میں فن تنقید پر کوئی بحث چھیڑنا نہیں چاہتا لیکن اتنا ضرور کہا

[illegible]

[illegible] ہیں، معاملہ الٹا ہے، وہ ادب میں [illegible] انصاف نہیں کرتے۔ سیاسی مسئلے فرقانے ادب کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ آرٹ اور ادب کے خدمت گزاروں کو سیاسی نظریوں سے اتنا مرعوب نہ ہونا چاہیے کہ وہ ادب کے صحیح خدوخال اور صالح تقاضوں کو فراموش کر جائیں یا ان کو مسخ کرنے کی کوشش کریں۔

شاعر، ادیب، آرٹسٹ، نہ زمانے کے پابند ہوتے ہیں، نہ زندگی کے، نہ نقاد کے، زمانہ زندگی اور نقاد تینوں شاعر، ادیب اور آرٹسٹ کے منتظر ہوتے ہیں۔ زمانہ اُن کا پابند ہوتا ہے وہ زمانے کے پابند نہیں ہوتے وہ اپنے ارادوں کے غلام نہیں ہوتے بلکہ ارادوں کو بلکہ ارادوں کو اپنی ضرورت تسلیم کرواتے ہیں اگر شاعر اپنے ماحول کا پابند یا نقاد کی حکم برداری پر مجبور ہو تو شاعری، ادب اور زندگی سے تازہ کاری جو عین زندگی ہے، جاتی رہے۔ زندگی کا انسانی تصور عزت و منزلت کی زندگی کا تصور ہے، مرض و ماحول کا نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ جب ہر چہار طرف آگ لگ رہی ہو تو شاعر بانسری بجاتے رہنے میں حق بجانب ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ کہنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا کہ اگر بعض موقع پر شعر بجانا شاعری زیب نہیں دیتا تو ہر موقع پر نقاد کا بھی بانسری بجانا کوئی قابل تعریف بات نہیں ہے۔

جس طرح ملاؤں نے خدا کے آداب و اخلاق، وضع و قطع، پسند ناپسند اور علم و عمل کی مکمل ترجمانی اپنے ذمے لی ہے اور ہمہ وقت یہ بتانے پر آمادہ رہتے ہیں کہ خدا نے یہ کیا ہے، یہ کرنا چاہتا ہے اور یہ کرے گا، اسی طرح بعض نقاد فلسفے پر تیار رہتے ہیں کہ زندگی یہ ہے، ادب وہ ہے، آپ رجعت پسند ہیں، آپ ترقی پسند۔ گویا خدا انھی کا ہے اور دنیا انھی کی ہے جیسا کہ ملا جانتے ہیں [illegible] ادب وہی ہے اور شاعری وہی ہے جسے ترقی پسند جانتے ہیں تو ان کا [illegible]

...ہونا چاہیے۔

[illegible] تنقید بہ دل کا فن ہے نہ ظاہر بین کا، وہ انسان کا فن ہے اور [illegible] بہترین کارناموں کے پرکھنے کا فن ظاہر ہے بہترین کارناموں کے پرکھنے کے لیے انتہائی دیانت، دانش مندی اور احترام سے کام لینا پڑے گا۔ ترقی پسندی کے ساتھ انصاف پسندی بھی ہونی چاہیے۔ تنقید نگار نہ تو پولیس کی مانند روزنامچہ تصنیف کرتا ہے نہ خفیہ نویس فرشتوں کے مانند اعمال نامے مرتب کرتا ہے، یہ کیسی تنقید ہے کہ امت نیک ہو، پیغمبر بدکار، خدا بدکار اور جنت دوزخ خالد کی! ہر امت کا حشر اسی کے پیغمبر کے ساتھ اور اسی کے خدا کے سامنے ہوتا آیا ہے، یہ کہاں کی تنقید ہے کہ اکبر الہ آبادی ناکام رہے اس لیے کہ سر سید کام یاب رہے اور سر سید ناکام رہے اس لیے کہ کانگریس کامیاب رہی اور کانگریس اس لیے کام یاب رہی کہ چین پر روس کا قبضہ ہوگیا اور روس ناکام یاب رہے گا اس لیے رشید صدیقی جگر صاحب پر کچھ فرما رہے ہیں، میں اپنے اکثر نقادوں سے کہوں گا:

"دل نہ بہی بجوب ما طعنہ مزن بزشتِ ما"

غزل پر حکم لگانے سے پہلے ہمارے تنقید نگاروں کو یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ غزل ایک طرف نومشقوں کے لیے مشق کی حیثیت رکھتی ہے تو دوسری طرف استادوں کی استادی کا معیار بھی متعین کرتی ہے، شاعری بالخصوص غزل میں خالص احساس و فکر اور خالص انداز و اسلوب کا میں قائل نہیں، ایک کو میں مرض سمجھتا ہوں دوسرے کو پینترا بازی گری، ہم اور ہمارے شعرا اس طرح کی باتوں میں مدتوں مبتلا رہ چکے ہیں، بایں ہمہ میں انداز و اسلوب کو بہت عزیز رکھتا ہوں، کلیتہً نئی بات شاذ و نادر ہی کہی جاتی ہے، بات پرانی ہوتی ہے اسلوب بیان اس کو نیا کر دیتا ہے کوئی بات دل نشیں اور [illegible] ہو سکتی ہے اگر وہ صحیح اسلوب سے مناسب اسپرٹ میں ادا کی جائے۔ اسلوب معتدل نہ ہو تو گفتنی ناگفتنی بن جاتی ہے اور معتدل ہو تو ناگفتنی گفتنی۔ آج تک شعر و

[illegible] ہے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ [illegible]
[illegible] اسپرٹ کو کلام میں نہیں لاتے۔ مثلاً جیسے ہم روانی، شائستگی یا بد مذاقی [illegible]
[illegible] مناسب اسلوب اور اسپرٹ کا فقدان ہے بات کرنی آتی ہو تو بات بھی نہیں بگڑتی۔

ایک ہی بات ہزاروں آدمی ہزاروں سال سے کہتے آئے ہیں اور کوئی نکتہ شعر نہیں ہوتا لیکن اسی بات کو شاعر اس طرح کہہ دیتا ہے کہ وہ زبان زد ہو جاتی ہے اور کہاوت بن جاتی ہے۔ سب سے بہتر اسالیب ضرب الامثال میں ملتے ہیں۔ سہل ممتنع کا یہی مفہوم ہے، گالیاں، کوسنے، دعائیں، کہاوتیں بہت بڑے شعور کے شاہکار ہیں۔

خارجی حالات و حوادث سے موجودہ غزل گویوں میں جگر سے زیادہ براہ راست متاثر ہونے والا شاید ہی کوئی اور ہو۔ جگر میں یہ بات آج سے نہیں شروع سے ہے، انھوں نے ہر بڑے حادثہ کا اظہار اپنے کلام میں اکثر کیا ہے۔ کچھ دنوں سے ان کے کلام میں تاثرات کی یہ زیریں لہر زیادہ نمایاں ہو گئی ہے۔ غزل میں یہ چیز تو حسرت سے ہوئی تھی لیکن جگر کے یہاں زیادہ گہری اور بنیادی پائی جاتی ہے۔ حسرت کے یہاں اس کی حیثیت خبر کی سی ہے جگر کے یہاں یہ قلب کی دھڑکن بن کر نمایاں ہوتی ہے۔ میرے نزدیک یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری شخصیت کو یا شخصیت شاعری کو پست یا بلند کرتی ہے۔ شاعری اور پروپگنڈے کا فرق بھی یہیں ظاہر ہو جاتا ہے۔

حسرت اور جگر دونوں اصلاً حسن و عشق کے شاعر ہیں لیکن ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ ایک محبوب کی موجودگی میں اور دوسرا محبوب کی دوری پر غزل خواں ہوتا ہے۔ محبوب کی موجودگی وصال کی محرک ہوتی ہے دوری محبت کی۔ جگر محبت کے شاعر ہیں۔ حسرت محبوب کے۔ جگر دوری و مجبوری کی عظمت کے قائل ہیں بلکہ ہوا و ہوس کے خلاف وہ ہر قیمت پر وصل کے خریدار نہیں ہوتے۔ جگر متاع اور قیمت کے نازک اور گراں بہا رشتہ کو خوب سمجھتے ہیں اور اسے نباہتے ہیں۔ ان کے عشق میں خواہ تنہا کی

[illegible] میں جو سب سے پہلے [illegible]
[illegible] کیا۔ تہذیب رسم عاشقی حسرت کے یہاں غالب ہی ہے لیکن [illegible]
نے تادیب رسم عاشقی تک پہنچا دیا۔ اب تو یہ روایت چلی آتی تھی کہ شعراء عاشق کے
جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے پر پورا زور صرف کر دیا کرتے تھے جگر کے
یہاں محبوب کے جذبات و احساسات کی بھی ترجمانی ملتی ہے۔

شاعر و عاشق، وصالِ محبوب کی خواہش کا اظہار کرے گا تو اس کا بہت زیادہ
امکان ہے کہ وہ تہذیب سے گر جائے لیکن جب بھی وہ محبوب کے جذبات کی ترجمانی
کرے گا احتیاط و احترام کے دائرہ سے قدم باہر نہ نکال سکے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا
تو خود اپنی نظر سے گر جائے گا، جگر عشق کے غلبہ میں محبوب کی عفت کو کبھی نہیں فراموش
کرتے اردو کے عام شعرا کے یہاں محبوب کا کردار کچھ زیادہ [illegible] پسند نہیں ہے
ہندی شاعری کی روایت یہ ہے کہ اظہار عشق عورت (بیوی) کی طرف سے ہوتا ہے
اور اکثر صد مجبوری کا اظہار ہوتا ہے طلب وصال کا نہیں، یہی سبب ہے کہ اس طرح کی
شاعری کا دائرہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو، اس کی پاک دامنی مسلم ہے۔ اردو شاعری میں
عورتوں کی طرف سے مردوں نے ریختی میں جن باتوں کا اظہار کیا ہے وہ اتنی شاعری
نہیں ہے جتنی کہ ذہنی اوباشی۔ ریختی کے جواز میں بھی کچھ نہ کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن وہ
جس بات کی غمازی کرتی ہے وہ اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔ ہمارے عام شعرا کے محبوب
سے دوستی کرنے کی خواہش ہم میں آپ میں مشکل سے پیدا ہوگی جگر کے محبوب کو ہر شخص
اپنانا چاہے گا، اردو شاعری کو یہ زاویہ جگر نے دیا۔

جگر کو اصغر سے بڑی گہری عقیدت ہے لیکن شاعری میں وہ اصغر سے بالکل
علاحدہ ہیں۔ اصغر سے ان کا شغف شخصی ہے شاعرانہ نہیں جس طرح حالی کا غالب سے
تھا۔ اصغر کے یہاں تخیل زیادہ جذبہ کم ہے۔ جگر کے یہاں جذبہ کی شدت ہے [illegible]
تخیل کی کمی۔ اصغر کی شاعری حسن کی شاعری ہے جگر کی عشق کی۔ حسرت کی [illegible]
اصغر کے یہاں تصوف کا عمل دخل بنیادی نہیں ہے۔ [illegible]

[illegible]
اہم اُن کی شاعری یا شاعرانہ حسن کاری میں تصوف سے کم ہی جگہ پاتا ہے لیکن [illegible]
تک جس حد تک اُن کا تصوف ان کے مقصد کے لیے کارگر ہو سکتا تھا۔ اردو شاعری
میں تصوف کو معتقدات کے [illegible] سے نکال کر حسن کاری و حسن آفرینی اصغر نے بنا۔ اصغر
نے اپنی شاعری کا مدار تصوف پر رکھا نہ کہ تصوف کا شاعری پر، جس طرح اقبال نے اپنی
شاعری کا مدار فلسفہ پر رکھا، فلسفہ کا شاعری پر نہیں! اصغر نے بیعت کسی کی کی ہو
وہ اپنی طبع حسن شناس و حسن شعار کے تھے۔

حسرت کے یہاں زبان و بیان کی ایسی بے ساختگی ملتی ہے کہ اُن کے الفاظ
اور تراکیب کی غرابت یا اجانک پن بھی مزہ دے جاتی ہے۔ اکثر یہ غرابت ہی اُن کا
نشان دیتی ہے بچوں کی مانند وہ اس درجہ معصوم اور بے تکلف ہیں کہ ان کا جا بجا
کھل کھیلنا اور زیادہ بھلا معلوم ہونے لگتا ہے۔ سیدھی سادی بات کو بغیر کسی فلسفہ
یا تصوریت کے مورے سے کہنا اور بس کہہ ڈالنا حسرت کا حصہ ہے۔ وہ بات کہہ کر
تو خوش ہوتے ہی ہیں لیکن اس احساس سے اور زیادہ خوش ہو جاتے ہیں کہ اُن کی
باتوں سے دوسرے اُن سے بھی زیادہ خوش ہوئے۔ برخلاف دوسرے کم سواد شعرا کے
جو بات اس طرح کہیں گے گویا دنیا میں وہی یہ بات کہنے کے لیے بھیجے گئے تھے اور اگر
ہم آپ اُسے نہ سمجھیں یا اُس کی قدر نہ کریں تو اللہ کے غضب یا اروس کے ادب سے
ڈریں! غزل میں توازن حسرت نے پیدا کیا!

داغ کا رنگ اُردو شاعری سے نہ جائے گا۔ اس لیے کہ وہ کوئی رنگ نہیں ہے
بلکہ ہماری شاعری اور ہماری زندگی کے بنیادی رنگوں میں سے ہے۔ وہ ہمیشہ کسی نہ
کسی شکل میں زندگی اور زمانے سے سامنا کرتا ہمارے دلوں کو اپنی شوخی اور شرارت
سے چھوتا چھیڑتا رہے گا۔ داغ کا یہ رنگ حسرت کا یہاں بڑے پسندیدہ انداز میں
جلوہ گر ہے لیکن مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ ہماری زندگی سے شوخی اور
شرارت رخصت ہو رہی ہے، جس زندگی میں تلخی اور نفرت راہ پانے لگی ہو وہاں شوخی

... اور شرافت کا احساس [illegible] غزل [illegible] بھی پیدا ہوا [illegible] پیدا ہوتا ہے [illegible] کا کام لیوا، یہ تعدد کی بات ہے۔

میرا خیال ہے کہ جگر کی شاعری سے شراب کو جتنا فیض پہنچا اتنا شراب سے جگر کی شاعری کو نہیں پہنچا۔ شراب پی کر شاعری نہیں کی جاتی۔ جس طرح آج کل کے سپاہی شراب پی کر فوجی باجے کی گت پر محاذِ جنگ پر لڑنے مرنے جاتے ہیں۔ دراصل شخصیت شراب ہوتی ہے جہاں سے شاعری نشہ بن کر برآمد ہوتی ہے جس طرح ؎

سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

شراب نشہ نہیں پیدا کرتی نشہ شراب پیدا کرتا ہے۔ جگر میں جو اضطراب و ہیجان ہے وہ شراب کا نہیں ہے۔ "دریا بوجودِ خویش موجے دارد" جو لوگ یہ بتاتے ہیں کہ شراب چھوڑ دینے سے جگر کی شاعری کا تار و پود ڈھیلا ہو گیا، وہ دراصل جگر کے شراب پینے یا ترک کر دینے کے واقعات پر نظر رکھتے ہیں۔ جگر کی شاعری پر غور نہیں کرتے یہی مغالطہ اُن لوگوں کو ہے جو حالی کے بارہ میں کہتے ہیں کہ غزل ترک کر کے حالی شاعر نہ رہے۔ شاعری شغل نہیں شخصیت ہوتی ہے، حالی کی غزلوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ غزل پر اکتفا کرتے، حالی کی غزلوں پر اُن کی بعد کی نظموں کی بڑی واضح پرچھائیں ملتی ہے۔ جگر کی شاعری دیکھ کر مجھے اکثر محسوس ہوا کہ یہ شخص شراب ترک کیے بغیر نہ رہے گا۔ جگر نے شراب کی بنیاد شاعری پر رکھی ہے، شاعری کی بنیاد شراب پر نہیں رکھی، میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ شاعر کو اپنے تصور یا مسلک کی بنیاد شاعری پر رکھنا چاہیے۔ اپنی شاعری کو کسی تصور یا مسلک پر نہ رکھنا چاہیے۔

مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ جگر جدید اُردو غزل میں ایک نیا مقصد تھے جس کی تکمیل ہو چکی اور یہ مقصد کچھ بہت اہم بالشان مقصد نہ تھا۔ بیسویں صدی میں اُردو غزل کا مقدر حسرت، فانی، اصغر و جگر چاروں کے کلام پر مشتمل تھا، انیسویں صدی کے خاتمہ پر ہماری غزل کو ہمارے تمدن کے ساتھ نئے حالات اور نئے مطالبات کے گلشن اور گلخن سے گذرنا پڑا اور غزل ان چاروں بت [illegible] میں [illegible]

غزل

یہ بھی سچ ہے آشنائے دردِ دل ملتا نہیں
یہ بھی کہتے شرم آتی ہے کوئی اپنا نہیں

آس کے بادل نہیں، آواز کا سایہ نہیں
رہگزارِ زیست میں پھر بھی کوئی تنہا نہیں

چیختا ہوں اپنی ہی ویرانیٔ دل دیکھ کر
ورنہ میرے شہر میں اتنا بھی سناٹا نہیں

شہر کے حق آشنا ہونٹوں کو جانے کیا ہوا
بزمِ دار و گیر میں اب کوئی ہنگامہ نہیں

اس طرح خالی نگاہوں سے تکا کرتا ہوں اب
جیسے تم تو غیر تم ہو میں بھی خود اپنا نہیں

صرف اپنی خود کلامی لکھ لیا کرتا ہوں میں
آج تک فنِ غزل گوئی مجھے آیا نہیں

قمر انصاری

غزل

ہو گا کیا، نیند جو آ بھی گئی بیماروں کو
سرخیاں کچھ نئی مل جائیں گی اخباروں کو

اتنے الجھے ہوئے شاید کبھی پہلے تو نہ تھے
مسئلے آج ہیں درپیش جو فن کاروں کو

دیکھنا قبر پہ اپنی بھی لگیں گے میلے
ہم رہے یاد جو قبروں کے پرستاروں کو

قصۂ رستم و سہراب نہ دہرائیے پھر
روکئے روکئے چلتی ہوئی تلواروں کو

حرف آجائے نہ دیکھو اس کے کرم پر واعظ
اتنا مایوس نہیں کرتے گنہگاروں کو

ہاتھ کچھ اس میں ہے میرا کہ ترا پیرِ مغاں
کون لڑواتا ہے میخواروں سے میخواروں کو

حالِ بربادیٔ دل آپ کو کیونکر سمجھاؤں
آپ نے دیکھا ہے لٹتے ہوئے بازاروں کو

پھر نہ وہ لوگ تھے، وہ دل تھا نہ وہ دلِ آزار
کب تک روکتے گرتی ہوئی دیواروں کو

راس آئے نہ ستارے ہمیں، یہ خوب ہوا
ہم خدا بھی تو سمجھ بیٹھے تھے ستاروں کو

کر دیا تھا دلِ خود دار نے اتنا مجبور
خوش نہ کر پائے کبھی اپنے خریداروں کو

مختصر آپ خدا جانے ہیں کا ہے کے گمستر
جن کو جانا تھا گئے روندتے انگاروں کو

بقیہ صفحہ ۱۶

جگر میری نظر میں

جلوہ گر ہوئی جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف تک پہنچتے پہنچتے ان دبستانوں میں سے اصغر اور فانی معرضِ خفا میں آ گئے۔ حسرت کے بارے میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اُن کے پیروان معنوی بھی معدوم ہونے لگے ہیں۔ اب صرف جگر رہ گئے ہیں۔ بہ ذاتِ خود مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ بحرانی و ہیجانی دور میں غزل جگر ہی کے سہارے آگے بڑھے گی۔ جگر کی شاعری میں وہ عناصر ہیں جو اس دور کے آشوب و آزمائش میں غزل کو تب و تاب دیتے رہیں گے۔

مہدی پرتاپ گڑھی

غزل

کیا گلہ غیروں سے اپنوں ہی نے کب بخشا مجھے
لیکن اتنا تو ہوا جینے کا فن آیا مجھے

ہاتھ اُٹھتے ہیں لبوں سے دُور ہے حرفِ دُعا
زندگی نے کتنی بے مہری سے ہے سوچا مجھے

خواہشیں کب کی مجھے برباد کر دیتیں مگر
وہ چھٹی حِس تھی کہ جس نے بارہا ٹوکا مجھے

کس زباں سے میں کروں گھر کی اُداسی کا بیاں
دعوتِ فکرِ سخن دیتا ہے سناٹا مجھے

میں تو خود اس دَور کا اک سانحہ ہوں دوستو!
حادثوں کی گود میں لمحات نے پالا مجھے

غزل

یہ جنوں ہے کہ جذبہ ادراک
سی رہا ہوں میں دامنِ صد چاک

کیا کوئی دیدہ ور نہیں یارو
چشمِ نرگس ہے کس لیے نمناک

کہکشاں بن کے چھا گئے ہر سو
جب ابھر آئے ذرہ ہائے خاک

مہرباں بجلیو کہاں ہو تم
میں نے پھر چن لئے خس و خاشاک

لاکھ تالے پڑیں مگر واحد
بند ہوتے نہیں لبِ بیباک

اردو کے فروغ کے لیے کیا کریں

یہ مضمون اردو کانفرنس منعقدہ قدرت مسلم انٹر کالج سیوہارہ بجنور یوپی میں پڑھا گیا

ملک کی آزادی کے بعد تمام ملکی زبانوں کو ترقی کے مواقع فراہم کیے گئے لیکن اردو بے چاری کو ملک کی تقسیم کی ذمہ داری کا الزام دے کر دیس نکالا دیا جانے لگا۔ یہ انجام جوری میں ہی غیر بنا دی گئی۔ مایوسیوں کے اس دور میں بھی اردو کے ہمدرد اس کو اپنی چھاتی سے لگائے رہے۔ اس زبان کا تعلق روزی روٹی کے ساتھ نہیں رہ گیا پھر بھی اپنے بچوں کو مادری زبان کی تعلیم دلاتے رہے۔ مختلف تنظیموں کے ذریعہ اردو کے جائز حقوق کی بحالی کے لیے سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ اور یہ سخت جان جیسے تیسے زندہ رہی۔

خدا کا شکر ہے کہ اب مایوسیوں کے بادل چھٹ رہے ہیں حالات بدل رہے ہیں۔ بہار کی حکومت اس کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے چکی ہے۔ گو عملی طور پر زبان کو اپنا مقام حاصل کرنے میں ابھی وقت لگے گا۔ لیکن امید تو ہے۔ حکومت اترپردیش بھی دوسری زبان قرار دے چکی ہے۔ اردو والے ابھی مطمئن تو نہیں کہے جا سکتے لیکن ان اقدامات سے یہ بات کھل کر سامنے آئی ہے کہ اردو کے مخالفین کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ مخالفت کرنے والے زیادہ سیاسی عناصر ہیں جن کا نام ہی مخالفت کرنا ہے یا پھر وہ فرقہ پرست عناصر ہیں جن کو ہندوستان کے مشترکہ کلچر سے ہی عداوت ہے اس لئے کا بیڑہ ہے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ حالات امید افزا ہیں اور ہم کو مایوسیوں کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

ان حالات میں اردو کے ہمدردوں کی ذمہ داریاں کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے فروغ کے لیے سرگرم مختلف تنظیموں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ فروغ اردو کے لئے کئے جانے والے کاموں میں ربط پیدا کیا جائے۔ اردو تنظیموں کا اہم

[illegible]

[illegible] اس احساس [illegible] کرتا ہے کہ ہم انگلش میڈیم [illegible] اسکولوں [illegible] کرتے ہیں لیکن اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ ہمارے بچوں کے لیے اردو تعلیم کا بھی بندوبست کیا گیا ہے یا نہیں۔ اگر ایسے اسکولوں میں اردو تدریس کا انتظام کیا جائے تو بہت بہتر ہوگا۔

ہمارا کوئی بچہ مادری زبان سے نابلد نہ رہے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو پڑھنے والوں کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے اسکولوں میں اردو ٹیچر نہیں ہوتے وہاں کوشش کر کے اردو ٹیچر فراہم کرائے جائیں۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ یہاں محکمہ تعلیم کے عہدیداروں سے الجھنا ہوگا۔ اردو کے کم از کم چالیس طلبا ہوں تو اردو ٹیچر مل سکے گا لیکن بھلا ہو ان ہیڈ ماسٹروں کا جو اس تعداد کو کاغذ پر پورا ہی نہیں ہونے دیتے۔ اردو کے ہمدردوں کو ایسے تنگ نظر لوگوں سے ہوشیار رہنا چاہیے اور ان کے خلاف شکایات اردو تنظیموں کو اور محکمہ تعلیم کو بھیجنی چاہئیں۔

دیہات میں اردو کی تعلیم کا بندوبست نہ ہونے کے برابر ہے۔ تنظیموں کی سرگرمیاں شہروں تک محدود ہیں۔ گاؤں میں اردو والوں کی آبادی اکثر مقامات پر کم ہوا کرتی ہے چنانچہ ان میں اتنی سکت نہیں کہ وہ کسی سے الجھ سکیں۔ یا آگے جا کر جدوجہد کر سکیں۔ اس کا تو صرف ایک حل ہے کہ پرائمری اسکول میں اردو ٹیچر لازمی طور پر رکھا جائے وہ دیگر مضامین بھی تو پڑھا سکتا ہے۔

دینی مکاتب پوری تندہی کے ساتھ اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مسجد سے ملحق چھوٹے مدارس میں عربی کے ساتھ ساتھ اردو بھی پڑھائی جاتی ہے۔ ان میں سے کچھ مدارس [illegible] صرف کلام پاک کی تعلیم دی جاتی ہے اور یہاں [illegible] کے باعث اردو [illegible] جا سکتے۔ بہت سے مدارس میں [illegible] میں [illegible] سے محروم ہے [illegible]

[illegible]
یہاں اساتذہ کی کمی بہت ہے [illegible] تعلیم [illegible]
دیہاتوں کے حالات [illegible] سے [illegible] پرائمری تعلیم [illegible]
اپنے بچوں کو سرکاری [illegible] بھیجتے ہیں۔

ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ ذریعہ تعلیم مادری زبان ہونا چاہیے۔ حکومت اتر پردیش آٹھویں جماعت تک اردو میڈیم کی اجازت برسوں پہلے دے چکی ہے لیکن افسوس کہ اس کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی ہے۔ ہندی داں اردو کے ذریعہ تعلیم [illegible] والے بھی اکثر افراد نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔

عام طور پر سرپرست حضرات اپنے بچوں کو اختیاری مضمون کے طور پر تو اردو پڑھا سکتے ہیں۔ لیکن اردو میڈیم سے ڈرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ آگے چل کر تو ہندی میڈیم ہی چلنا ہوگا اور وہ اس میں کمزور رہ جائے گا [illegible] فضول ہیں۔ ہمارا مشورہ ہے بہار وغیرہ میں بے شمار اردو میڈیم اسکول چل رہے ہیں۔ اس سلسلے میں زیادہ ذمہ داری پرنسپل صاحبان و منتظمین پر عائد ہوتی ہے۔ وہ یہ [illegible] لاگو کریں۔

اردو اساتذہ اور پرنسپل حضرات ایسے اردو طلباء کو [illegible] جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ ان کو خصوصی وظائف دیئے جائیں۔ ہم کو اردو کی مشترکہ قومی ورثے کی حیثیت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ یوپی اردو اکیڈمی [illegible] وظائف دیتی ہے۔ ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔

اردو کی نصابی کتب کی فراہمی بھی ایک مسئلہ ہے۔ تعلیمی سال شروع ہوتے ہی یہ کتابیں عنقا ہو جاتی ہیں۔ اس لیے میری تجویز ہے کہ ہر اسکول [illegible] اسٹور قائم فرمائیں اور طلباء کتابوں کے سیٹ براہ راست [illegible] قبل از وقت رکھا سکتے ہیں۔

اردو کے فروغ کے لیے حسب ذیل [illegible]

جو [illegible]

کا [illegible] بھی [illegible] وہ پڑھے لکھے [illegible]
جا سکتا ہے۔ انجمنیں، پنچایتیں، اردو اکیڈمی اس قسم کے مدارس کی امداد کر کے ان کی حوصلہ افزائی کر سکتی ہے۔ اس سے اردو والوں کو روزگار بھی فراہم کیا جا سکتا ہے۔

ادبی سرگرمیاں اردو کے فروغ میں معاون ہوتی ہیں۔ وقتی طور پر چاہے وہ کچھ بھی نہ ہوں تب بھی کم از کم بے حسی اور جمود کو کم کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔ مشاعرے، تقریری مقابلے، کانفرنسیں وغیرہ اپنی اپنی جگہ پر افادیت کی حامل ہیں۔ ان کے انعقاد میں اردو دوستوں کو تعاون دینا چاہیے تاکہ جو لوگ ان سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں وہ مایوس نہ ہوں۔

چند معمولی باتیں !:۔ کچھ معمولی باتیں بھی نتائج افزا ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک شہر کے بازار سے گزرنے والا اجنبی اردو میں لکھے سائن بورڈ دیکھ کر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس شہر میں اردو کے ہمدرد موجود ہیں۔ شاید ان کے بچے اردو پڑھ بھی رہے ہوں۔ اس لیے کوئی اردو اسکول بھی ہوگا۔ اور اردو کا کام کرنے والے کچھ لوگ بھی ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہندی یا انگریزی میں بورڈ لگانے کو ہم منع نہیں کرتے لیکن آپ اپنی زبان کو خود ہی غیر بنا رہے ہیں۔ سائن بورڈ اردو میں بھی لکھوا لیجیے۔ نیم پلیٹ پر نام صرف انگریزی میں لکھا ہو تو اس سے ہماری شان نہیں بڑھ جاتی۔ اردو میں بھی لکھوا لیجیے۔ خالص اردو داں حضرات کو پڑھنے میں آسانی ہوگی پھر اردو [illegible] کو بھی [illegible] ملے گا۔ اور اس کو [illegible] اس سے اس کے [illegible] وقت لگا [illegible] نتائج [illegible] ۲، سرکاری دفاتر میں اردو میں درخواستیں دی جا سکتی ہیں۔ اس حق کو استعمال کرنا چاہیے اس سے [illegible]

[illegible] خط و کتابت اردو میں کرتے ہوئے ہمیں جھجکنا نہیں چاہیے۔ ایک پرنسپل سکسینہ صاحب الٰہ آباد بورڈ کے ممبر منتخب ہوئے تو میرے [illegible] عزیز نے مبارکباد کا خط ہندی میں لکھا۔ لیکن ادھر سے جواب اردو میں آیا اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا گیا تھا کہ آئندہ خط و کتابت اردو میں کیجیے۔ خیال عام ہے کہ خط اگر اردو میں لکھ بھی دیں تو پتہ لکھتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اس سے ہم اردو کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ پتہ بھی اردو میں لکھیے کیا ہندی انگریزی کے خط ضائع نہیں ہوتے۔ اس لیے ڈرنے کی ضرورت نہیں کہ آپ کا خط ضائع ہو جائے گا۔ سعادت علی صدیقی کے خطوط تو مجھ کو برابر ملتے ہیں وہ بھی تو اردو میں ہی لکھتے ہیں بے تکلف کی بھی ضرورت نہیں۔ اگر پوسٹ مین اردو نہیں جانتا تو آپ کیوں ڈرتے ہیں جب ڈاک آنے لگے گی اردو داں پوسٹ مین ہی آپ کے حلقے میں رکھا جائے گا۔

۳۔ زبان و ادب کی ترقی کے لیے کتابوں، اخباروں اور رسالوں کی توسیع اشاعت بہت ضروری ہے۔ اس میں تعاون ضروری ہے۔ اشاعت تو تبھی بڑھے گی جب ان کے خریدار ہوں۔ کتابیں خرید کر پڑھیے۔ اس سے اردو ناشرین کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ مصنفین کو کچھ معاوضہ مل جائے گا۔ چھاپہ خانے کو کام ملے گا اور اس طرح اردو داں عملے کو روزگار ملے گا۔ عام کتب فروش اردو کتابیں اس لیے نہیں رکھتے کیونکہ ان کی فروخت بہت کم ہے۔ اس سلسلے میں اردو والوں کی بے حسی قابل افسوس ہے۔ دانشور طبقہ کتب خانوں سے کام چلا لیتا ہے یا نمونے کی کاپی بہ تبصرہ وصول کر کے خوش ہو جاتا ہے۔ متوسط طبقے کے لوگ ایک دو ہفت روزہ یا فلمی رسالہ خرید کر عہدہ برآ ہو جاتے ہیں اور اکثر تو چائے خانوں یا ہیئر کٹنگ سیلون میں جا کر اخبار بینی کے شوق کی تکمیل کر لیتے ہیں۔

اگر آپ اردو کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تو اتنا تو [illegible] آمدنی سے دس، پانچ روپے ہر مہینے اردو رسائل، [illegible] کی

[illegible] ہیں [illegible] ہے [illegible]
تعجب کی بات یہ بھی ہے کہ کئی رسالے دیکھ کر بھی رخصت ہو جاتے ہیں لیکن خالص علمی و ادبی قسم کی کتابوں اور رسالوں کی کھپت بہت ہی کم ہے۔ ایک ایک کتاب کا پہلا ایڈیشن ہی برسوں پڑا رہتا ہے اور آئندہ اس کی اشاعت کی پبلشر کو ہمت نہیں پڑتی۔ آپ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک ادبی کلب قائم کر سکتے ہیں۔ ان سے جمع کی گئی رقم سے مختلف رسالے منگا سکتے ہیں۔ چھوٹی موٹی لائبریری قائم کر سکتے ہیں۔

آپ اپنے احباب بچوں کو خوشی کے موقع پر روپے دیتے ہیں، مٹھائی دیتے ہیں۔ بازار میں بچوں کی رنگ برنگی خوبصورت سی چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی تو دستیاب ہیں دلچسپ کہانیوں کی کتابیں لے کر دو یقیناً خوش ہوں گے۔

دوست احباب کے درمیان تحائف کے تبادلے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کے کسی دوست نے آپ کو کتاب بطور تحفہ دی ہو۔ ویسے اس کا رواج کم ہی ہے۔ اس کو فروغ ملنا چاہئے۔ یہ بڑی معمولی اور آسان سی باتیں ہیں۔ ان پر عمل کر کے ہم اپنی زبان کو بہت کچھ دے سکتے ہیں۔ کرنا کچھ مشکل بھی نہیں زیادہ کے چکر میں نہ پڑ کر ہم صرف اتنا کر لے سکیں جتنا آسانی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اردو کے لیے خدمت کا جذبہ وقتی نہ ہو۔ بلکہ اس کا مفاد ہمیشہ پیش نظر رہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ ہمدردیاں جلسوں، کانفرنسوں اور مقالات تک ہی محدود رہتی ہیں۔ میں خود اپنی ذات کو بھی اسی خانے میں پاتا ہوں۔ آپ نے بلایا تو یہ مقالہ پڑھ دیا ورنہ عنوان کا انکاری مفہوم ہی میرے لئے بھی آسان ہے۔ "اردو کے فروغ کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے" یعنی کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ بجز اس کے کہ تنظیمیں بنائیں۔ چندے وصول کریں اور دوست احباب کے درمیان عہدوں کا بٹوارہ کر کے گھر بیٹھ [illegible] کریں۔ ان کا اخبارات میں اپنے نام اور عہدے [illegible] کرا [illegible] کے مرتبہ شدہ مطمئن ہو جائیں۔

اتر پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام

رباعیات حالی

مرتبہ:

محمد رحمت اللہ رعد

کسی زمانے میں کان پور کے نامی پریس کو بڑی شہرت حاصل تھی اس کے مالک محمد رحمت اللہ رعد حسن طباعت کے قابل حد رشک نمونے پیش کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے "رباعیات حالی" کی پیش کش ہیں جس کا عکس شائع ہو گیا ہے۔ انھوں نے خصوصی دلچسپی لی۔ حالی کے مشورے کے بعد ان کے دیوان سے رباعیات کا انتخاب انھوں نے خود کیا اس کی کتابت کا کام اعجاز رقم کے شاگرد رشید الطاف حسین کے سپرد کیا اور پھر اس عروس جمیل کو عوام کے سامنے لباس صوری میں پیش کیا۔

فوٹو آفسیٹ اڈیشن

قیمت: ۳/- روپے

ملنے کا پتہ
اتر پردیش اردو اکادمی، بلہرہ ہاؤس، قیصر باغ لکھنؤ

مغربی بنگال اردو اکادمی کے زیر اہتمام

اردو شاعروں کے

تین نایاب تذکروں کی اشاعت

شیفتہ کا گلشنِ بے خار

باطن کا گلستانِ بے خزاں

صابر کا گلستانِ سخن

ان تینوں تذکروں کا عکسی ایڈیشن بہت جلد بازار میں آجائے گا۔ تفصیلات کا انتظار کیجئے۔

اسعد بدایونی

غزل

ایک منظر بے زباں آنکھوں کے بس میں کیوں نہیں
لمحۂ آئندہ میری دسترس میں کیوں نہیں

میں خلا کی وسعتوں میں ایک سہما سا پرند
میرا مسکن باغ سے باہر قفس میں کیوں نہیں

اک سفر پھیلا ہوا آنکھوں سے سانسوں کی طرف
سلسلہ جس کا مگر تارِ نفس میں کیوں نہیں

کیوں مرے پیروں کو رغبت آبلہ پائی سے ہے
لطفِ ہستی گلشنِ بے خار و خس میں کیوں نہیں

ہر طرف بے رنگ آوازوں کی فصلیں ہیں حسین
ایک بھی آہٹ ہماری دسترس میں کیوں نہیں

ضلع اردو کانفرنس فرخ آباد

— [illegible] بر شہر [illegible] انجمن علم و ادب کے زیر اہتمام ایک
ضلع اردو کانفرنس زیر صدارت جناب راجندر بہادر موج فتح گڑھی
یوپی اردو اکیڈمی کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ضلع کے محبانِ اردو مسلم
و غیر مسلم حضرات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ کنوینر جناب جاوید اختر نے
کانفرنس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو کو دوسری
سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے زور دیا۔ جناب
عبدالجلیل شاہد نے اردو کی صوتی و معنوی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے اردو کی
افادیت پر زور دیا۔ جناب عبدالحفیظ صاحب وکیل نے اسکولوں میں طلباء
کی مشکلات کا ذکر کیا۔ جناب فضل احمد نے فرخ تحصیل کے اسکولوں کے اردو
تعلیمی مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے انجمن علم و ادب فتح گڑھ سے معاونت
کی اپیل کی۔ جناب راجندر ناتھ سبل نے اسکولوں اور کالجوں میں پرائمری اسکول و نظر
میں اردو معلموں کی تقرری کے سلسلے میں ششکشا تعلیم الہ آباد کے دفتر سے رجوع کیا اور ان کو
لیں۔ جناب اکرم فاروقی نے اردو کے فروغ و ترویج سے متعلق مسائل کو حل کرنے
کے لیے ایک مجلس عمل کی تشکیل کی تجویز پیش کی جس کی تائید جناب مسرور
سرور نے کی اور بہ اتفاق رائے گیارہ حضرات پر مشتمل ایک مجلس عمل کی تشکیل
عمل میں آئی۔ جناب راجندر بہادر موج نے اپنی صدارتی تقریر کرتے ہوئے
اپیل کی کہ محبانِ اردو کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں نیز جن
مدارس میں اردو پڑھائی کا انتظام نہیں ہے اس کے لیے کوشش کریں۔ انہوں
نے مزید کہا کہ ضلع کے مختلف مقامات پر اردو کے فروغ و تعلیم بالغان کے لیے شبینہ

اسکول ما بود او بچیاں کا قوم کی جانب سے تحسین کے لیے [illegible]
ہے تا سب اساتذہ نے کار دہ دیا۔ آخر [illegible]
کو [illegible] پیش کرنے کے [illegible] بار بار پیش کیے [illegible]
فیصلہ دینے کی اپیل کی گئی۔

کانفرنس کا اختتام شعری نشست پر ہوا۔

کنوینر کانفرنس

جاوید اکرم

غزل

جواب بن نہ سکے جب کہیں حوالوں میں
سوال رکھ دیئے اُس نے مرے سوالوں میں

اُسے خبر ہی نہ تھی آفتاب نکلے گا
سفید پھول سجائے تھے اُس نے بالوں میں

یہ اور بات تمہارے نصیب میں غم تھے
مسرتیں بھی تھیں اُن نرگسی پیالوں میں

سمندروں کی طرح چاند اضطراب میں تھا
تڑپ رہی تھیں کئی مچھلیاں اُجالوں میں

زمیں پہ آ کے فرشتے لہو لہان ہوئے
کسی چٹان سے ٹکرائے تھے خیالوں میں

—— جاوید اکرم

U. P. URDU ACADEMI
KHABARNAMA Sept. 82

Regd. No.
LW/NP,126

اترپردیش اردو اکادمی کی تازہ پیش کش

عروسِ جمیل لباسِ حریر میں

یعنی

نصاب کی بنیادی کتابوں کے عکسی ایڈیشن کم قیمت پر

دستیاب ہیں

مقدمہ شعر و شاعری

قیمت صرف ۵ پانچ روپے

آبِ حیات

قیمت صرف ۹ نو روپے

کلیات نعت محسن کاکوروی

قیمت صرف ۱۲ بارہ روپے

آپ کی فرمائش کے ہم منتظر ہیں

سکریٹری

اترپردیش اردو اکادمی، قیصر باغ، لکھنؤ

Cover printed at : ANUJ PRINTERS, C-1106, Mahanagar, Lucknow 226006

خبرنامہ

اتر پردیش اردو اکاڈمی



"اردو ہماری تہذیب کا جزو ہے کیونکہ اس کا اثر دوسری زبانوں پر عظیم اور خوشگوار رہا ہے اور یہ تمام دوسری زبانوں کی طرح ہماری خوبیوں میں اضافہ کرتی ہے اور مزید یہ کہ دوسری زبانوں سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔

...... دستور کی رو سے اردو کو ایک قومی زبان قرار دیا گیا ہے ادبی نقطۂ نظر سے بھی بلا شبہ وہ ایک جاندار اور زندہ زبان ہے۔ میں مقابلہ تو نہ کروں گا لیکن دستور میں لکھی ہوئی چودہ زبانوں میں سے بہت سی ایسی زبانیں ہیں جن کا ادب اور بولنے والوں کی تعداد اردو [illegible]

اترپردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

جلد ۱۱ — شمارہ ۵

نومبر ۱۹۸۲ء

سالانہ چندہ
پانچ روپے
فی شمارہ
پچاس پیسے

ترتیب

عزیز الجبار خاں، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے دفتر اترپردیش اردو اکادمی قیصر باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔ [illegible] پریس لکھنؤ سے چھپا۔

اداریہ

ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

ہم اردو والے نومبر کے مہینے کو ہمیشہ اس لیے بھی یاد رکھتے ہیں کہ اس میں ملک کی دو ایسی عظیم شخصیتوں نے جنم لیا جنھوں نے لسانی اقلیتوں کو جمہوری حقوق دلانے کی کوشش کی تاکہ ملک کی ترقی میں یہ اپنا مثبت کردار ادا کر سکیں۔ یہ شخصیتیں ہیں — پنڈت جواہر لعل نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی۔

جنگِ آزادی کے دوران اردو کا دوسرا نام نعرۂ رجز تھا اور اسی نعرۂ رجز نے ہندوستانیوں کو جنگِ بے برگ و ساماں اور سفرِ بے ننگ و میل پر کاربند رکھا۔ پنڈت نہرو جنگِ آزادی کے عظیم رہنماؤں میں تھے۔ وہ اس نعرۂ رجز کی اثر انگیزی اور انقلاب آفرینی کے عینی شاہد تھے۔ اسی لیے آزادی کے بعد جب اردو کے لیے حالات ناسازگار ہوئے تو وہ اس کے تحفظ کے لیے آگے بڑھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اردو کی وسیع المشربی اور ملک کے اتحاد کے لیے اس کی خدمات کا بارہا ذکر کیا۔ اس طرح کہاں کہ برف پگھلنے لگی اور دلوں میں اردو کے خلاف جو کدورت بھر دی گئی تھی، وہ دور ہونے لگی۔ پنڈت نہرو نے تنہا وہ کام کیا جو کسی منظم تحریک کے بھی بس کی بات نہیں تھی۔ ان کی عمر نے وفا نہیں کی مگر جلد ہی ہندوستان نے اس کا نعم البدل پالیا۔

شریمتی گاندھی نے اردو کا چلن عام کرنے کے لیے ان مطالبات کو مشعل راہ بنایا جنھیں اردو والے وقتاً فوقتاً ارباب اقتدار کے سامنے پیش کرتے آئے تھے۔ اور آج اردو کے سیاق و سباق میں اگست ۴۷ء کے ہندوستان سے موجودہ ہندوستان کا موازنہ کیجیے تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اردو نے اپنے جمہوری حقوق کی بازیابی کے لیے پُر خطر راستے طے کر کے اس مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں یہ شعر اس کے حال کا ترجمان بن گیا ہے۔

جست کرتا ہوں تو اڑ جاتی ہے منزل سے نظر
حائل راہ کوئی اور بھی دیوار سہی

ہمیں یقین ہے کہ شریمتی اندرا گاندھی کی فعال قیادت اردو کو وہ حق بھی دے گی جو ابھی اسے نہیں ملا ہے۔ اسی کے ساتھ ہمارا یہ فرض ہے کہ اردو کو جو کچھ بھی اب تک ملا ہے' اسے عوام تک پہنچائیں اور استفادے کی راہیں وسیع کریں اس باب میں اردو اکادمی کی پیش قدمی جاری رہے گی اور محبان اردو کی خدمت کرتی رہے گی۔

محمود الٰہی

غالب شناسی

مرزا غالب کی شخصیت بھی عجیب ہے۔ جب تک زندہ رہے یا تو زمانہ ان کے پیچھے پڑا رہا یا یہ زمانے کے پیچھے پڑے رہے۔ عام خیال یہ تھا کہ ان کی وفات کے بعد یہ سیلاب بلا کسی اور کے گھر چلا جائے گا مگر بیکسی عشق کے ماتم کرنے والوں کی کبھی کمی نہیں ہوئی یہاں تک کہ موجودہ صدی میں ان کی عظمت نقطۂ عروج تک پہنچ گئی اور وہ دانشورانِ اردو کی لیاقت و صلاحیت کا سمبل بن گئے اور عام طور پر یہ تاثر قائم ہو گیا کہ جس نے غالب کو پہچان لیا، اس نے اردو کو پہچان لیا۔ غالب شناسی بھی بڑی ترقی پر رہی جو گزری اور گزشتہ نصف صدی سے غالب شناسوں کی صف میں آنے کے لیے سب سے بڑا معیار یہ رہا ہے کہ غالب کا کوئی شعر دریافت کر لیا جائے۔

غالب شناسی کا یہ معیار صرف برصغیر میں برقرار نہیں رہا بلکہ یورپ میں بھی برصغیر کے معیار کو غالب شناسی کا معیار بنایا گیا۔ ہمارے ایک بزرگ استاد کسی علمی سفر پر لندن گئے ہوئے تھے، انھوں نے دیکھا کہ لندن کے محبانِ اردو یا تو غالب پر سوار ہیں یا غالب ان پر سوار ہیں۔ دیوان غالب کے ہر جنبش لب کے ساتھ نسخۂ حمیدیہ کا کوئی شعر ضرور برآمد ہوتا تھا۔ ان بزرگ استاد کو کوئی گھاس نہیں ڈالتا تھا کیونکہ اول تو گفتگو میں یہ غالب کا کوئی شعر نہیں سناتے تھے اور اگر سناتے بھی تھے تو مروجہ دیوان سے۔

ایک دن لندن کے غالب شناسوں کو دعوت نامہ ملا کہ آج شام کو فلاں جگہ غالب پر ایک مخصوص ادبی نشست منعقد ہو گی جس میں غالب کا نودریافت کلام پیش

کیا جائے گا۔

اب کیا تھا، نشست گاہ میں غالب شناسوں کی وجہ سے تل رکھنے کو جگہ نہیں تھی۔ لندن کی زمستانی ہواؤں میں شمشیر کی تیزی تھی مگر بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے بعض حضرات پسینے میں شرابور نظر آرہے تھے۔

بزرگ استاد لب کشا ہوئے کہ میں نے انڈیا آفس لائبریری میں اشعارِ غالب کی ایک نئی بیاض دریافت کی ہے، اس کی ایک غزل پیش کر رہا ہوں۔ پھر انھوں نے غزل کا مطلع (جس میں بنات النعش گردوں، مردم گزیدہ، لاف دانشِ خمیازہ، عرضِ صورت جیسی ترکیبیں بڑی خوبصورتی سے باندھی گئی تھیں) جیسے ہی پیش کیا چھتیں اُڑ گئیں اور ایک غالب شناس پری وش تو داد دیتے دیتے ان سے لپٹ گئی اور کہا کہ اس مطلع میں غالب کا تحت الشعور مجسم ہو کر سامنے آگیا ہے ——— اور پھر جب بزرگ استاد نے مقطع پڑھا مجمع کو سانپ سونگھ گیا اور ہر غالب شناس سر جھکائے ہوئے بڑی خاموشی سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

مقطع میں یہ تھا کہ اے غالب مجھے معاف کرنا کہ لندن کی سرزمین میں آج تیرے نام پر اور تیری فارسی زدہ ترکیبوں کا سہارا لے کر میں نے بھی تھوڑی سی شہرت کما لی۔

آج غالب شناسی اور ترقی کر گئی ہے۔ آج اگر بے معنی اور مفہوم سے عاری اشعار آپ کو یاد نہیں ہیں تو آپ کا شمار اردو شناسوں میں نہیں ہو سکتا!

(نباض)

پنڈت جواہر لال نہرو

معلوم ہوتا ہے کہ حکومت پنڈت موتی لال نہرو کی حوصلہ مند طبیعت، ان کے اولوالعزم دماغ، ان کے فقر و استغنا، ان کی بے پایاں قربانیوں اور ان کے بے نفس و بے غرض جذبۂ حب وطن سے بے انتہا متاثر ہوئی ہے۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس خاندان کے افراد، اس کی ملکیت اور اس کے اثاثۂ خانہ داری پر آئے دن نظر لطف و کرم مبذول ہوا کرتی ہے۔ ایک عرصے کی بات ہے کہ پنڈت نہرو کے اسیر فرنگ ہونے کے بعد کسی جرمانے کے سلسلے میں آپ کا موٹر قرق کر لیا گیا تھا۔ اس کے بعد آج تک جرمانوں اور قرقیوں کی زنجیر کی کڑیاں ختم نہ ہوئیں۔ حال ہی میں پنڈت شیام لال نہرو کی دختر کا ارغنوں باجہ اور گھڑی حکومت کی نذر ہوئی ہے۔ تلاشیاں تو معمولی بات ہیں۔ ان سب امور کے علاوہ گرفتاریوں کا سلسلہ بھی سرگرمی سے جاری ہے اور جواہر لال نہرو جو پچھلے دنوں قید سے رہا ہو کر آئے تھے، اب پھر لکھنؤ جیل میں اپنے والد محترم سے ملاقات کے دوران میں گرفتار کر لیے گئے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کا شمار ان چند نفوس عالیہ میں ہے جنھیں متحدہ ہندوستان اپنا قائد و رہبر تسلیم کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کر سکتا۔ درحقیقت وہ تمام صفات و کمالات جو ہندوستان کے ایک لائق فرزند اور ہند کے رہبر و رہنما کے لیے

باعث فخر و مباہات ہو سکتے ہیں۔ وہ نہرو خاندان میں ایک صفتِ عمومی کی حیثیت رکھتے ہیں اور شاید اسی وجہ سے اس قدر نظرِ کرم مبذول ہو رہی ہے ؎

آزمائش ہے نشانِ بندگانِ محترم
جانچ ہوتی ہے اسی کی جس پہ ہوتا ہے کرم

(اداریہ روزنامہ زمیندار لاہور مورخہ
۱۶ مئی ۱۹۲۲ء)

پروفیسر کلیم الدین احمد

اپنی تلاش میں!

[مشہور دانشور اور نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد 'اپنی تلاش میں' کے زیر عنوان خود نوشت لکھ رہے ہیں اس کی تیسری جلد حال ہی میں شائع ہوئی۔ اس کا یہ اقتباس قارئین کی خدمت میں پیش ہے]

۱۹۵۱ء میں مجھے حرارت آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر رگھوناتھ سرن کو خیال ہوا تھا کہ مجھے ٹی۔ بی ہو گئی ہے۔ ایکسرے میں کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ لیکن پھر بھی ان کا خیال تھا کہ مجھے کہیں infection ضرور ہے اور انھوں نے اسی کا علاج کیا تھا اور میں اچھا بھی ہو گیا تھا۔ ۵۳-۱۹۵۲ء میں ڈین بھی تھا۔ کالج اور یونیورسٹی سے متعلق کاموں کا بڑھتا ہوا بوجھ تھا۔ اس کا میری صحت پر اثر پڑا لیکن میں نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ۱۹۵۴ء میں میں نے محسوس کیا کہ پیٹھ میں داہنی جانب درد رہا کرتا ہے اور ریاح کی بھی شدت ہے۔ ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے دیکھا۔ ان کا خیال ہوا یہ سب کچھ معدے کی خرابی کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے دو طرح کے پوڈر دیئے ہدایت یہ تھی کہ ایک پوڈر کا ایک ہفتے میں استعمال ہو اور دوسرے پوڈر کا دوسرے ہفتے میں۔ ان دونوں پوڈر کا مہینوں استعمال ہوتا رہا لیکن کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔

پھر ڈاکٹر عبدالحی صاحب سے کہا انھوں نے سمجھا کہ شاید Nasal...

Pain ہے Irgapyrin کا نسخہ لکھا۔ کچھ دنوں کے لیے بظاہر تکلیف کچھ کم ہوگئی اور میں حسب معمول کاموں میں مشغول رہا۔ ۱۹۵۵ء میں یہ تکلیف پھر ابھری۔ ڈاکٹر صاحب پھر آئے۔ بہت دیر تک دیکھ بھال کی پھر دوا Irgapyrin اور Infrared Ray بتایا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ درد اپنی جگہ پر قائم رہا خصوصاً Posture بدلنے میں زیادہ تکلیف ہوتی تھی۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے بغور معائنہ کیا اور کہا کسی سرجن سے مشورہ کیجیے۔ ڈاکٹر نواب آئے۔ دیر تک ریڑھ کی ہڈیوں کو دبا کر دیکھا اور بہت سے جتن کیے پھر کہا یوں تو پتہ نہیں چلتا Spine کا X-Ray ضروری ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر عبدالحئی صاحب سے بھی باتیں کیں۔ حالت یہ تھی کہ درد تیز ہوگیا تھا، ریاح کی شدت تھی اور کبھی کبھی ایسا لگتا تھا کہ کسی نے لوہے کے حلقے میں سینے کو ڈال دیا ہے۔ بعض احباب نے کہا کہ کیپٹن پال کے پاس Portable X-Ray machine ہے، انھیں بلا لیجیے، وہ گھر پر ایکسرے کردیں گے۔ وہ بلائے گئے۔ بہت دیر تک میرا معائنہ کرتے رہے آخر کہا کچھ ریڑھ میں شکایت معلوم ہوتی ہے لیکن میں ایکسرے نہیں کروں گا۔ کیوں کہ Portable machine میں Power بہت کم رہتا ہے Lungs وغیرہ کے لیے ٹھیک ہے۔ یہ ہڈیوں کا معاملہ ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس سے مرض کا صحیح حال نہ معلوم ہو۔

کیپٹن پال تو چلے گئے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ آر۔ سی۔ دت Radiologist کے یہاں چلا جائے۔ دوسرے روز صبح کے وقت میں گیا۔ زہرا بھی ساتھ تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتادیا تھا کہ کس حصہ کا ایکسرے لینا ہے۔ دت نے فوراً ہی ایکسرے لے لیا اور کہا کہ شام کے وقت ایکسرے پلیٹ اور اپنی Findings دوں گا۔ شام ہوئی تو زہرا گئیں پلیٹ لانے کے لئے، واپسی میں بہت دیر ہوئی۔ آئیں تو میں نے پوچھا: کیا ہوا۔ کہا: ہاں کچھ ہے۔ یہ کہہ کر فوراً دوسرے کمرے میں جہاں صالحہ رہتی تھیں چلی گئیں۔ بہت دنوں

کے بعد زہرا نے بتایا کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ رپورٹ دیکھ کر انھیں بہت صدمہ ہوا۔
تھا اور چونکہ یہ ممکن نہ تھا وہ صالحہ کے پاس جاکر رونے لگی تھیں اور صالحہ نے انھیں
اپنے پاس لٹا کر دلاسا دینے کی کوشش کی تھی اور وہ روتے روتے سو گئی تھیں۔ صبح
کو دیر کی وجہ بتائی کہ میں پلیٹ اور رپورٹ لے کر ڈاکٹر عبدالحئی کے یہاں چلی گئی تھیں
انھوں نے اسے بہت دیر تک دیکھا تھا۔ پھر میں ڈاکٹر نواب کے یہاں چلی گئی تھی۔ انھوں
بھی پلیٹ دیکھا تھا اور کہا تھا کہ میں ڈاکٹر عبدالحئی سے باتیں کروں گا اور کل ہم دونوں آئیں گے
زہرا نے مجھے نہ تو پلیٹ کی جھلک دیکھنے دی اور نہ رپورٹ ہی دکھائی۔ ڈاکٹروں نے
بھی صورت حال نہیں بتائی۔ جب میں رو بصحت تھا تو سبھوں نے کہا کہ ریڑھ کی ایک
ہڈی جو مربع کی شکل کی ہوتی ہے مثلث ہو گئی تھی اور Spine کی دونوں جانب
خاصے تک Infection پھیلا ہوا تھا۔ بعض ڈاکٹروں نے دیکھا تو کہا کہ آپ اتنے
دنوں تک اس شدید درد کو برداشت کیسے کیے ہوئے تھے اور اس عالم میں کالج
اور یونیورسٹی کے ہجوم کا رش کیسے نپٹتے تھے۔ کسی نے کہا کہ اگر کچھ دن اور غفلت ہوتی
تو پھر میں ہمیشہ کے لیے Bed-ridden ہو جاتا۔ اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا
میرے بس کی بات نہ تھی۔

دوسرے دن ڈاکٹر عبدالحئی اور ڈاکٹر نواب دونوں آئے۔ دیر تک مشورہ کرتے
رہے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ پلاستر کرنا ہوگا۔ پلاستر شاید دو طرح کرتے ہیں۔ ایک شکل
یہ ہوتی ہے کہ پیٹھ پر پلاستر لگا کر ایک طرح کا Mould بنا لیتے ہیں
اور وہ جب سوکھ جاتا ہے تو اس میں لٹا دیتے ہیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اس قسم کا پلاستر
ہو کیونکہ یہ زیادہ Bearable ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحئی صاحب
نے کچھ دوائیں لکھ دیں۔

دوسرے دن ڈاکٹر نواب ایک کمپاؤنڈر کو لے کر آئے۔ ضروری سامان بھی ساتھ

تھے کہا ایک چوکی چاہیے۔ چوکی کو پلنگ کے قریب رکھا اور پھر مجھے کہا کہ کپڑے اُتار کر اس چوکی پر چلے آئیے۔ میرے جسم کو ایک خاص پوزیشن میں رکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ پلاسٹر بن گیا ہے اب پلنگ پر چلے جائیے۔ پلنگ پر جانے میں مجھے تکلیف ہوئی تو چوکی کو اٹھا کر پلنگ کے برابر کر دیا۔ پھر کہا کہ پلاسٹر کو دو تین دنوں تک دھوپ میں رکھنا ہوگا کہ یہ اچھی طرح سوکھ جائے۔ سوکھ جائے گا تو میں پھر آؤں گا۔ پلاسٹر دھوپ میں ڈال دیا گیا۔

تین دنوں کے بعد ڈاکٹر نواب آئے پلاسٹر کو دیکھا کہا۔ سوکھ گیا ہے۔ پھر پلاسٹر میں روئی بچھائی اور مجھے اس میں لٹا دیا۔ زہرا کو کہا دیکھ لیجئے۔ یہ کام کیسے ہوتا ہے۔ آئندہ آپ ہی کو یہ کام کرنا ہوگا۔

میں نے پوچھا اس پلاسٹر کی مصیبت سے کب نجات ملے گی کہا: تین مہینوں کے بعد پھر زہرا کو کچھ ضروری ہدایتیں دے کر چلے گئے۔ اور میرے لیے ایک نئی قسم کی زندگی کا آغاز ہوا۔

میری دنیا بڈ روم تک محدود ہو گئی جسمانی کوئی تکلیف نہ تھی۔ درد محسوس نہ ہوتا تھا۔ ریاح بھی رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی، سینے کے گرد جو آہنی حلقہ تھا وہ بھی ڈھیلا ہو گیا تھا۔ البتہ PAS کی وجہ سے معدہ خراب ہو گیا تھا تو ڈاکٹر عبدالحئی صاحب نے کہا کہ اسے بند کیجئے۔ میرے احباب اور شاگردوں نے ساتھ دیا۔ برابر آجایا کرتے تھے اور ان سے باتیں کرنے میں وقت بھی آسانی سے گزر جاتا تھا اور کچھ دل چسپی بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن رات کے وقت جب سب لوگ سو جاتے تھے اور میں جاگتا رہتا تھا تو طرح طرح کے خیالات ستاتے رہتے تھے۔ کبھی سوچتا کہیں جانبر نہ ہو سکوں گا۔ کبھی سوچتا تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے Bed-ridden ہو جاؤں گا۔ پھر سوچتا تھا کہ اگر میں مر گیا تو زہرا اور بچوں کا کیا ہوگا۔ کبھی سوچتا اگر

۲۳ ۲۹ جب زلزلہ آیا تو میں کیسے بھاگوں گا۔ کبھی سوچتا کہ اگر گھر میں آگ لگ گئی تو کیا ہوگا [illegible] کو میں سوتا تو بغل کے کمرے میں روشنی جلتی رہتی تھی۔ ایک رات نیند ٹوٹی تو اندھیرا گھپ کچھ نہیں سوجھتا تھا فوراً شک گذرا کہ کہیں میں اندھا تو نہیں ہو گیا ہوں۔ لیکن میں نے زہرا کو نہیں پکارا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کچھ بھی نظر نہ آیا گھنٹوں کے بعد صبح کے آثار نمایاں ہوئے تو کچھ ہلکی سی روشنی کمرے میں آنے لگی۔ کمرے کے دروازے بند تھے اور پلنگ میں جو مسہری لگی ہوئی تھی وہ نظر آنے لگی تب جا کر دل کو تسکین ہوئی۔

ایک طرف دوائیں تھیں، ڈاکٹری علاج تھا، دوسری طرف ایک ماورائی علاج بھی جاری تھا۔ کچھ میرے مخلص ہندو شاگرد اور احباب تھے جنھیں علم جوتش پر یقین کامل تھا ایک پدم دیو نرائن شرما تھے، انھوں نے بیماری سے پہلے لے کے۔ داس گپتا کو مجھ سے بلا کر ملایا تھا۔ داس گپتا پوربی بنگال کے باشندے تھے اور وہاں سے سب کچھ کھو کر پٹنے پہنچے تھے اور بی۔ این کالج میں انگلش کے لکچرر ہو گئے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ پٹنہ کالج چلے آئیں، اور پدم دیو ان کو اسی غرض سے میرے پاس لائے تھے۔ انھیں پامسٹری سے بھی واقفیت تھی اور قیافہ شناسی بھی جانتے تھے پہلے دن جو مجھ سے ملے تو میرا ہاتھ دیکھ کر بول اٹھے you have lost a son یہ سن کر مجھے کچھ تعجب بھی ہوا کیونکہ حسنی کے اسقاط حمل کا میرے قریبی عزیزوں کے علاوہ کسی کو علم نہیں تھا۔ زہرا کو دیکھتے ہی کہا you are a diabetic حالانکہ اس وقت کسی کو شبہ بھی نہ تھا کہ انھیں diabetes ہے لیکن اس کے کچھ دنوں بعد وہ اس موذی مرض کا شکار ہو گئیں [illegible] تھا لیکن میں سمجھتا تھا کہ یہ [illegible] داس گپتا سے کہا [illegible]

کے لیے کچھ کیجیے۔ انھوں نے کہا: میں کیا کروں میرے بھائی کو بلوائیے۔ وہ آگئے مجھے دیکھا۔ ہاتھ کی انگلیوں کو بہت دیر تک دیکھتے رہے پھر کہا آپ کو Bone T.B. ہے۔ یہ بات تو سبھی جانتے تھے۔ پھر کہا میں اس کا تدارک کرتا ہوں۔ اس کے کئی دنوں کے بعد وہ پھر آئے اور ایک سونے کا تعویذ (۹) میرے داہنے بازو پر باندھ دیا۔ کہا میں نے بہت پوجا کے بعد یہ چیز تیار کی ہے۔ اور ایک نیلم کی انگوٹھی دی۔ کہا اسے پہلے دو تین دنوں تک تکیے کے نیچے رکھیے اور اگر کوئی نقصان نہ ہو تو پھر اسے پہن لیجیے۔ زہرا نے وہ انگوٹھی میرے تکیے کے نیچے رکھ دی اور تین دنوں کے بعد پہنا دی۔ کچھ دنوں کے بعد پدم دیو نے کہا: آپ کی جو جنم کنڈلی ہے وہ مجھے دیجیے، پدم دیو اور دامودر اسے لیکر رکھولتی باسدیو نرائن سنہا کے یہاں چلے گئے۔ وہ بھی مشہور جوتشی تھے لیکن ان کا پیشہ یہ نہیں تھا وہ سرکاری ملازم رہ چکے تھے لیکن جوتش سے انھیں خاص شغف تھا۔ تجمل حسین صاحب ایک بار زہرا کو اور مجھے ان کے یہاں لے گئے تھے دراصل تجمل حسین دریافت کرنا چاہتے تھے کہ وہ منسٹر کب ہوتے ہیں اس وقت وہ ام پی تھے۔ ان کے پاس گاڑی نہ تھی اس لیے ہم دونوں کو بھی پکڑ کر لے گئے تھے جب اپنے بارے میں پوچھ چکے تو میری طرف اشارہ کرکے کہا: ان کے متعلق کچھ بتائیے انھوں نے سنہ پیدائش اور وقت وغیرہ پوچھا جو میں نے بتایا۔ تھوڑی دیر میں انھوں نے ایک زائچہ بنا ڈالا کہا تفصیل سے بعد میں بتاؤں گا۔ لیکن آپکا زائچہ امرناتھ جھا کے زائچے سے اور فلاں صاحب جو الہ آباد ہائی کورٹ کے جج ہیں بہت ملتا جلتا ہے آپ کو جو اپنی ملازمت میں اندر ملی موشن ملتا ہے۔ اس سے آپ آگے جائیے گا۔ اگر آپ پرنسپل ہو سکتے ہیں، اس وقت میں پروفیسر تھا تو آپ ڈی پی آئی ہو جائیے گا۔ اگر ڈی پی آئی ہو سکتے ہیں تو وائس چانسلر ہو جائیے گا تفصیل سے میں پھر بتاؤں گا لیکن

مجھے ان چیزوں سے دل چسپی نہیں تھی اس لیے میں دوبارہ نہیں گیا تھا۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ دامودر اور پدم دیو اکھوری بابا سدیو نرائن کے یہاں گئے، میری جنم کنڈلی دکھائی، انھوں نے کہا کہ جنم کنڈلی تو میرے پاس موجود ہے جو جنم کنڈلی انھوں نے بنائی تھی وہ نکالی اور دونوں کو ملا کر دیکھا پھر پوچھا یہ کس نے بنائی ہے جب ان لوگوں نے بتایا تو کہا، بہت Accurate ہے۔ پھر ان لوگوں نے صورتحال بیان کی اور کہا کہ کرونا بابو نے نیلم کی انگوٹھی پہننے کے لیے دی ہے۔ انھوں نے کہا یہ ٹھیک نہیں، یہ مرض Saturn کی وجہ سے ہے۔ نیلم کی انگوٹھی Saturn کی طاقت کو اور بڑھا دے گی، کہیے کہ اسے اتار دیں اور سفید پکھراج کی انگوٹھی پہنیں، پدم دیو اور دامودر نے آ کر کہا، نیلم کی انگوٹھی اتار دیجیے اور وہ اسی وقت اتار دی۔

پدم دیو کرونا بابو سے مرعوب نہ تھے۔ انھوں نے دامودر سے کہا پکھراج کی انگوٹھی بنوا دیجیے۔ چنانچہ دامودر نے انگوٹھی بنوائی، اسے لے کر اکھوری بابا سدیو کے یہاں گئے اور انھوں نے انگوٹھی کو لے کر کچھ پوجا کی اور دامودر دو انگوٹھیاں لیے ہوئے میرے پاس آئے۔ ایک تو وہی پکھراج کی تھی اور دوسری لوہے کی انھوں نے کسی اور جوتشی سے بھی مشورہ کیا تھا اور اس نے لوہے کی انگوٹھی بنائی تھی۔ دامودر نے کہا: یوں تو لوہے کی انگوٹھی بنی بنائی ملتی ہے لیکن میں نے ایسی ناؤ میں سے جو برسوں گنگا میں رہ چکی تھی، ایک کانٹی نکلوا کر یہ انگوٹھی بنائی ہے اور دونوں انگوٹھیاں پہنا دیں۔ پکھراج والی انگوٹھی کی قیمت میں نے پوچھی اور دے دی۔ دوسرے دن جگت نندن آئے تو میں نے پوچھا لوہے کی انگوٹھی کا کیا راز ہے انھوں نے کہا دیکھئے میں بھی پہنے ہوئے ہوں یہ Saturn کے خراب اثر کو روکتی ہے۔ اور کہنے لگے کہ ہم لوگ سائنس کالج میں

Telescope سے جب بھی Saturn کو دیکھتے تھے لوہے کی انگوٹھی پہن لیا کرتے تھے تاکہ کوئی برا اثر نہ ہو۔ پھر دامودر اپنے ایک دوست آئی۔ جھا کو لے آئے یہ رانچی میں انڈین نیشن کے رپورٹر تھے اور انھیں پامسٹری سے واقفیت تھی انھوں نے میرے ہاتھ کی چھاپ لی۔ اور کچھ دنوں کے بعد اپنی ریڈنگ لاکر دی جو بہت طویل تھی جس میں میرے ماضی اور مستقبل کے متعلق بہت سی باتیں تھیں اور پھر میری شخصیت کا تجزیہ تھا، ماضی کے متعلق جو باتیں تھیں وہ ایسی تھیں جو عام طور سے لوگ جانتے تھے، مستقبل کے متعلق جو باتیں تھیں وہ اسی قسم کی تھیں جو ایک ذہین آدمی جو مجھ سے واقف تھا میرے مستقبل کے متعلق کہہ سکتا تھا۔ میری شخصیت کا تجزیہ جو تھا اس کے متعلق میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں کیونکہ وہ بہت قسم کا تھا۔ ڈاکٹر بی۔ پی۔ چودھری صدر شعبۂ سنسکرت آئے یہ بھی جوتش میں درک رکھتے تھے وقت اور سنہ پیدائش پوچھا۔ کچھ دنوں کے بعد آئے اور کہنے لگے میں آپ کے ماضی کے متعلق آپ سے پہلے کچھ باتیں پوچھتا ہوں یہ دیکھنے کے لیے کہ میری ریڈنگ صحیح ہے یا غلط۔ اس کے بعد انھوں نے چار پانچ سوالات کئے۔ یہ سوالات اب مجھے یاد نہیں۔ جو سب کے سب غلط نکلے۔ یہ تو انھوں نے کہا: کچھ غلطی ہوئی ہے، میں پھر دیکھوں گا اور پوچھا کہ آپ کی پیدائش کہاں ہوئی تھی، میں نے کہا پٹنے میں، پھر وہ چلے گئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد آئے اور کہا میں نے آپ کا زائچہ بنارس میں بنوایا تھا اور ان لوگوں نے بنارس کے وقت کے مطابق بنا دیا تھا اس لیے غلطی ہوئی۔ لیکن آپ اچھے ہو جائے گا۔ جس ستارے نے آپ پر یہ آفت ڈھائی ہے آگے آپ سے بہت سے کام لینے ہیں۔

ایک لیاقت علی شاہ تھے۔ ڈاکٹر محمود صاحب ان کے معتقد تھے ایک روز بیرسٹر جنید رشید جو اس وقت منسٹر تھے ہم لوگوں سے ملنے کے لیے آئے۔ اس

وقت میں وارڈنس بنگلو۔ میں رہتا تھا جب ہم لوگوں سے باتیں کر کے وہ باہر نکلے ہم لوگ [illegible] تک آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب ان کی گاڑی پر بیٹھے ہوئے ہیں یہی لیاقت علی شاہ تھے۔ پٹیل صاحب بھی ان کے معتقدوں میں تھے، ہم لوگوں کو ان سے ملایا، اس کے بعد جب کبھی پٹنے آئے تو ہم لوگوں سے بھی ملنے کی خواہش ظاہر کرتے تھے گاڑی بھیج دی جاتی تھی اور وہ آجاتے تھے۔ وہ زیادہ خموش رہتے تھے۔ زہرا کچھ کھانے کے لیے کہتیں تو کچھ کھا لیتے تھے۔ زیرلب کچھ بولتے رہتے تھے، باتوں کا کبھی سیدھا جواب نہیں دیتے تھے ان کے بولنے کا ایک خاص oblique طریقہ تھا جو اس سے واقف نہیں تھا اسے سمجھنے میں دقت ہوتی تھی۔ زہرا سے وہ صرف ایک چیز کی فرمائش کرتے۔ ڈلی اور کتھہ، اور زہرا بھیج دیا کرتی تھیں، یا ان کے ساتھ کر دیا کرتی تھیں مجھ سے وہ کہتے تم قطب ہو قطب۔ جب وہ میری بیماری کے زمانے میں دوپٹنے آئے اور انھیں میری علالت کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے آنے کی خواہش ظاہر کی۔ آئے تو وہ سیڑھیوں پر نہیں چڑھتے تھے کیونکہ وہ Blood Pressure کے مریض تھے لیکن وہ اوپر آگئے، دیر تک بیٹھے رہے اور زیرلب کچھ بولتے رہے۔ پھر یک بیک سب ٹھیک ہے کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور چلے گئے۔ اختر نے کہا میں آپ کو ایک انگوٹھی دیتا ہوں اور انھوں نے چاندی کی انگوٹھی دی جس پر نقش تھا اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ صدرالدین نے دیکھا: کہا بڑی زبردست آیت ہے یہ انگوٹھی شاید قادیان میں بنتی ہے اختر بھی یہ انگوٹھی پہنے ہوئے تھے۔ فضل امام نے کہا میں نے حضرت صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ آپ کی صحت کے لیے دعا کریں۔ پھر جو جواب آیا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ میں نے دعا کی ہے مجھے دکھلایا۔

تین مہینوں تک علاج ہوتا رہا اور میں پلاسٹر میں اسی طرح بے بس پڑا رہا اور زہرا دن رات میری دیکھ بھال میں مصروف رہتیں۔ میں نے ایک بار کہا بھی کہ دن کے لیے کوئی نرس رکھ لو۔ انھوں نے کہا: نرس کیا کرے گی؟ ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب نے بھی کہا: نرسنگ کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ زہرا تو سب کام کر ہی لیتی ہیں پھر خرچ بھی بہت ہوگا جس کی ضرورت نہیں غرض یہ قرعۂ فال زہرا کے نام ہی رہا۔ جب تین مہینوں کی مدت ختم ہوگئی تو ڈاکٹروں نے کہا: پھر ایک بار ایکسرے لینا چاہیے۔ مجھے سبھوں نے بیڈ شیٹ میں لٹا کر اوپر سے اتارا اور گاڑی میں لٹا کر پھر ار۔ سی۔ دت کے یہاں لے گئے اس نے ایکسرے لیا شام کو حسب معمول پلیٹ اور رپورٹ دی۔ زہرا انھیں لیکر ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب کے یہاں گئیں انھوں نے دیکھا، ڈاکٹر نواب نے دیکھا۔ کوئی خاص فائدہ نظر نہ آیا۔ زہرا کی پریشانی کا کیا پوچھنا۔ انھوں نے ڈاکٹر نواب سے کہا: آپ نے تو کہا تھا کہ پلاسٹر تین مہینوں کے بعد ہٹا دیا جائے گا۔ انھوں نے کہا: یہ تو میں نے کلیم صاحب کی تشفی کے لیے کہا تھا۔ مرض اتنا بڑھ گیا تھا کہ چھ مہینوں سے کم میں افاقے کی امید غلط ہے۔ اگر میں پہلے ہی کہہ دیتا کہ چھ مہینوں تک پلاسٹر میں رہنا پڑے گا تو وہ گھبرا جاتے۔ زہرا اپنی پریشانی میں ڈاکٹر ڈی، این، بنرجی کے پاس گئیں۔ انھوں نے دونوں پلیٹ دیکھے، نسخے دیکھے کہا تین مہینے ہو گئے ابھی تک کوئی Improvement نہیں ہے یہ تشویش ناک بات Tap کرا کے فاسد مادے کو نکالنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب کی بھی یہی رائے ہوئی لیکن ڈاکٹر نواب نے کہا Spine کا آپریشن کرنا ہوگا

اور یہ آپریشن ہے کوئی معمولی بات نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس آپریشن کی کوئی خاص urgency نہیں ہے۔ مرض بڑھ گیا تھا غالباً ۱۹۵۱ء میں جو کلیم صاحب بیمار ہوئے تھے اس وقت یہ شروع ہوا تھا لیکن کسی نے اس طرف توجہ

نہ کی۔ دواؤں سے کچھ رک گیا پھر چار برسوں تک یہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ اچھا ہونے
میں کچھ دیر لگے گی۔ غرض وہی علاج جاری رہا۔ تین مہینوں میں کچھ لاغر ہوگیا تھا
پلاسٹر کچھ ڈھیلا معلوم ہونے لگا اور رات کو نیند میں میں نیچے کی طرف سرک جاتا تھا
اور پلاسٹر بغلوں میں گڑنے لگتا تھا۔ ڈاکٹر نواب صاحب سے کیفیت بیان کی گئی وہ
آئے۔ پلاسٹر کو نکال کر کچھ کانٹ چھانٹ کی پھر مجھے اس میں لٹا دیا کچھ دنوں کے بعد
پھر وہی صورت ہوئی تو ڈاکٹر نواب نے کہا کہ پلاسٹر کو ہٹا دیجئے لیکن اسی طرح
لیٹے رہیے کہ پیٹھ کو کچھ حرکت نہ ہو۔ ڈاکٹر عبدالحی صاحب آئے دیکھا پلاسٹر نہیں ہے
تو بہت خفا ہوئے۔ وہ خفا کم ہوتے ہیں۔ کہنے لگے پلاسٹر ضروری ہے۔ خدانخواستہ
کچھ ہوگیا تو آپ چلنے پھرنے سے معذور ہو جائیے گا، میں نے کہا: ڈاکٹر نواب نے کہا
ہے۔ انھوں نے کہا ایسا نہیں کہا ہوگا۔ میں نے ڈاکٹر نواب سے کہا: انھوں نے کہا
No plaster is better than a plaster which
causes discomfort اور پھر میں پلاسٹر میں نہیں لیٹا۔ پلاسٹر سے
نکلنے سے مجھ کو بہت راحت ملی۔ اور میں ڈاکٹر عبدالحی صاحب کی warning
کو بھی بھول گیا۔ لیکن میں چوبیس گھنٹوں تک بعد اسی طرح لیٹا رہتا تھا کہ پیٹھ کو ذرا
بھی جنبش نہیں ہوتی تھی۔ جب گرما کی چھٹیاں ختم ہوئیں تو میں نے جگت نندن سے کہا
کہ اب میں چھٹی نہیں لوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ کام کروں گا تو بیماری کا ہر وقت
دھیان نہیں رہے گا۔ ڈاکٹر کے۔ کے دت سے میں نے کہا کہ فائلیں سب میں
دیکھ لوں گا کوئی اہم انٹرویو ہوگا تو وہ بھی میں اپنے بیڈروم میں کر لوں گا۔ روٹین
ورک آپ کر دیجئے۔ وہ بھی راضی ہو گئے۔ چنانچہ فائلیں آنے لگیں۔ میں انھیں
پڑھ کر احکام صادر کرد یا کرتا تھا، چکس پر بھی دستخط کر دیتا۔
کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر نواب کا دربھنگہ ٹرانسفر ہوگیا۔ یہ بھی ایک عجیب واقعہ

تھا۔ ڈاکٹر نواب بہت اچھے سرجن تھے اور بہت اچھے انسان بھی تھے۔ ڈاکٹر نواب کا ٹرانسفر ہوا تو وہ مسٹر ایل۔ پی سنگھ چیف سکریٹری سے ملے اور اپنی کچھ دشواریاں بیان کیں۔ انھوں نے کہا کہ Representation دیجیے۔ ڈاکٹر نواب نے ایسا ہی کیا۔ اس بیان سے کیفیت طلب کی گئی کہ کیوں نہ ان پر گورنمنٹ کے حکم نہ ماننے کی وجہ سے Disciplinary کارروائی کی جائے۔
ڈاکٹر نواب پھر ان سے ملے اور کہا کہ گورنمنٹ کا حکم نہ ماننے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ میں ابھی دربھنگہ چلا جاتا ہوں وہ دربھنگہ چلے گئے اور وی۔ این سنگھ کوس لمن الملک الیوم بجانے لگے۔ جب ڈاکٹر نواب جانے لگے تو ڈاکٹر مکھوپادھیا کو لے کر آئے۔ کہا میں دربھنگہ جا رہا ہوں میں نے آپ کا case ڈاکٹر مکھوپادھیا کو سمجھا دیا ہے۔ اب یہی آپ کی دیکھ بھال کریں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر مکھوپادھیا آنے لگے۔ ایک روز انھوں نے ایک نئی دوا کا ذکر کیا۔ کہا یہ Steroids دوا ہے اور امریکہ اور یورپ میں اس کا استعمال ہو رہا ہے اور یہ بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ اس کو منگا لیجیے اس زمانے میں کسی Foreign دوا کو منگانے کی اجازت نہ تھی۔ راج کماری امرت کور مرکزی حکومت میں ہیلتھ منسٹر تھیں۔ زہرا انھیں جانتی تھیں۔ زہرا نے راجکماری امرت کور کو خط لکھا تفصیل سے میری بیماری کا حال بتایا اور ڈاکٹر مکھوپادھیا کا حوالہ دے کر کہا انھوں نے یہ دوا بتائی ہے۔ اسے منگانے کی اجازت دی جائے۔ میں نے زہرا کو منع کیا کہ راجکماری امرت کور کچھ نہیں کریں گی لیکن انھوں نے خط بھیج دیا۔ کچھ دنوں کے بعد ان کے سکریٹری ڈاکٹر بنجامن فرنکلین کا لمبا خط آیا شروع میں بہت کچھ ہمدردی کا اظہار تھا پھر لکھا تھا فلاں فلاں دوائیں ہندوستان میں ملتی ہیں اور استعمال کی جا رہی ہیں۔ آخر میں لکھا تھا کہ گورنمنٹ سمجھتی ہے کہ جب مقامی

دوائیں موجود ہیں تو ایک نئی دوا جو ابھی [illegible] سے ہے لے منگانے کی اجازت درست نہیں۔ زہرا مایوس ہوگئیں اور وہ خط ڈاکٹر مکھو پادھیا کو دکھلایا انھوں نے کہا ڈاکٹر فرنیکلن کو واقفیت نہیں ہے۔ یہ دوا کافی آزمائی جا چکی ہے۔ پھر زہرا کو یاد آیا کہ جب وہ ۱۹۴۸ء میں یورپ گئیں تھیں تو سوئٹزرلینڈ بھی گئی تھیں اور وہاں ایک فیملی سے دوستی بھی ہوگئی تھی جن کا ہندوستان میں [illegible] یا [illegible] کے نام سے فرم بھی تھا ان کا پتہ موجود تھا زہرا نے انھیں خط لکھا صورت حال بتائی اور یہ بھی لکھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے [illegible] کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ انھوں نے فوراً جواب دیا کہ میں نے دوا بھیج دی ہے۔ میرا فلاں ایجنٹ بمبئی میں ہے آپ ڈاکٹر مکھو پادھیا سے یہ لکھوا کر کہ مسٹر احمد کے لیے یہ دوا ضروری ہے بھیج دیجئے وہ انتظام کر دے گا چنانچہ انھوں نے اس ایجنٹ کو ڈاکٹر مکھو پادھیا کی سفارش بھیج دی اور اس نے وہ دوا بھیج دی ٹکیوں کی تعداد ۵۰۰ تھی جو ضرورت سے زیادہ تھی میں نے سوچا یہ ہمارا ہندوستان ہے اور یہ یورپ۔ چند دنوں کی سرسری ملاقات تھی لیکن وہاں سے فوراً مدد آئی اور دلّی سے سوکھی ہمدردی۔ اور دواؤں کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحئی صاحب کے مشورے سے اس دوا کا استعمال ہونے لگا دسمبر کے آخری ہفتہ میں یا جنوری کے پہلے ہفتہ میں ڈاکٹر عبدالحئی صاحب نے کہا کہ پھر ایکسرے لینا چاہیے پھر مجھے اسی طرح ار۔ سی۔ دت کے یہاں لے جایا گیا۔ اب کے پلیٹ اور رپورٹ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مرض میں ۷۰ فیصد افاقہ ہے یہ نئی دوا کا اثر تھا یا جو دوائیں دی جا رہی تھیں ان کا مجموعی اثر تھا، یہ کہنا مشکل ہے۔ اب زہرا کی جان میں جان آئی۔ میں بھی مطمئن ہوگیا اور میں لیٹے رہنے کی سزا کو برداشت کرنے کے لیے خوشی سے تیار ہوگیا

وقت گذرتا گیا، آسانی سے اور جلد گزرتا گیا۔ اگست سے نومبر تک ایک ایک دن پہاڑ معلوم ہوتا تھا خصوصاً راتیں بڑی مشکل سے کٹتی تھیں۔ ڈاکٹر عبدالحئی صاحب نے کہا پھر ایکسرے لے لیا جائے۔ ڈاکٹر عبدالحئی صاحب نے پلیٹ دیکھا کہا سب ٹھیک ہے۔ میں آکر مزید ہدایت دوں گا۔

جولائی میں کالج کھلا امرت دھاری اپنی گاڑی لے کر آئے کہا چلیے آپ کو آفس پہنچا دوں۔ میں ان کے ساتھ گیا گاڑی سے اترا تو وہاں پر کافی بھیڑ ہوئی تھی یا میں ابھی تک کمزور تھا میں کچھ لڑکھڑا سا گیا امرت دھاری نے میرا ہاتھ لیا ورنہ شاید میں گر جاتا۔ پہلا دن تھا بہت ملنے والے آئے۔ زیادہ تو میری صحت یابی پر مبارکباد کہنے کے لیے اور کچھ ایسے بھی تھے جو یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کیا واقعی میں اچھا ہو گیا ہوں یا یوں ہی ایک دن کے لیے کالج چلا آیا ہوں اور پھر جا کر شکن بستر بن جاؤں گا۔

میں نے اس تفصیل سے اس علالت کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ایک یا تجربہ تھا، ایک آزمائش تھی اور یہ آزمائش صرف میری ہی نہیں تھی بلکہ بہت سے لوگوں کی تھی۔ زہرا کی محبت اور ان کے صبر و تحمل کی آزمائش تھی۔ ڈاکٹر عبدالحئی ڈاکٹر نواب، ڈاکٹر مکھو پادھیا کی Medical Skill اور بے لوث جذبۂ خدمت کی آزمائش تھی میرے شاگردوں اور colleagues کے خلوص اور ہمدردی کی آزمائش تھی۔ ڈاکٹر باسدیو نرائن کی بے انتہا شرافت کی آزمائش تھی۔ میرے احباب آتے تھے میرا دل بہلایا کرتے تھے لیکن سبھوں کو یقین تھا کہ یہ ایسی مہلک بیماری ہے کہ میرا بچنا ناممکن ہے یا اگر بچ بھی گیا تو کام کر لینے کے قابل نہ ہوں گا لیکن کبھی کسی نے یہ بات ظاہر نہ ہونے دی جب میں بالکل اچھا ہو گیا اور relapse کا بھی کوئی خطرہ نہ رہا تو رام جی ورما نے کہا کہ ڈاکٹر جی نے آپ

کو کھڑا کر دیا ورنہ ہم لوگ سمجھ چکے تھے کہ آپ اب پرنسپل کے کام کا بوجھ سنبھالنے کے
لائق کبھی نہ ہو سکیں گے اور سبھوں نے اپنے طور پر کوششیں بھی کیں۔ مسلمانوں نے
دعائیں کیں۔ اختر نے انگوٹھی دی جو شاید منیر احمدی کو وہ نہیں دیتے۔ ہندوؤں نے
پوجا کرائی اور دوسرے جتن کئے۔ میرے شاگرد بیدھو بھوشن داس کٹک سے
آئے ہوئے تھے۔ وہ پانڈے بھی ہیں اور جوتشی بھی۔ مجھے دیکھا اور پھر کٹک جا کر
خط لکھا آپ اچھے ہو جائیے گا۔ ایک گرہ ہے میں نے پوجا کا انتظام کر دیا ہے۔

آل احمد سرور کمیٹی کی سفارشات

مرکزی وزارت تعلیم کی ایک سات رکنی تحتی کمیٹی نے جو پروفیسر آل احمد سرور کی قیادت میں قائم کی گئی تھی سفارش کی ہے کہ گجرال کمیٹی کی تجویز کے بموجب ان علاقوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد تقریباً دس فی صدی ہو اردو ذریعہ تعلیم والے پرائمری اسکول قائم کئے جائیں۔

تحتی کمیٹی کے خیال میں یہ بات بھی پسندیدہ ہوگی کہ جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد دس فیصدی سے کم ہو وہاں دو زبانیں جاننے والے اساتذہ مقرر کئے جائیں۔

مرکزی وزارت تعلیم و ثقافت نے یہ تحتی کمیٹی جون ۱۹۷۹ء میں گجرال کمیٹی کی ان سفارشات پر غور کرنے کے لیے مقرر کی تھی جن پر وزارت عمل کر سکتی ہے۔ بعد میں کانگریس (۱) کی حکومت برسر اقتدار آنے کے بعد اس کمیٹی کا دائرہ عمل وسیع کر کے اس میں پوری مرکزی حکومت کے لیے قابل عمل سفارشات پر غور شامل کر دیا گیا تھا۔

پروفیسر آل احمد سرور نے جو آج کل سری نگر میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں اپنی مختصر رپورٹ میں معمولی تبدیلیوں کے ساتھ گجرال کمیٹی کی اہم سفارشات کو برقرار رکھا ہے ان سفارشات میں سہ لسانی فارمولے میں تبدیلی جن علاقوں میں دس فی صدی یا اس سے زیادہ اردو بولنے والے ہوں وہاں سرکاری کاموں میں اردو کا استعمال اور لسانی اقلیتوں کے لیے تحفظات کی سفارشات شامل ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور کے علاوہ کمیٹی میں پروفیسر سروپ سنگھ (ایم۔ پی لوک دل) رکن ہیں مسٹر عابد علی مدیر سیاست حیدرآباد بیگم صالحہ عابد حسین (افسانہ نگار) اور مسٹر علی محمد خسرو جو ابھی حال تک مغربی جرمنی میں ہندوستان کے سفیر تھے شامل ہیں۔

تحتی کمیٹی نے کہا ہے کہ ریاستی حکومتوں سے کہا جائے کہ وہ سہ لسانی فارمولے میں اردو کو اسی طرح شامل کریں جس طرح آندھرا اور بعض دوسری ریاستوں میں کیا گیا ہے۔

تحتی کمیٹی کا یہ بھی کہنا ہے کہ راجدھانی دہلی میں ایک علاحدہ کالج قائم کیا جائے جہاں گریجویٹ سطح تک اردو کے ذریعہ تعلیم دی جائے اور سولن (ہماچل پردیش) اور پٹیالہ (پنجاب) میں اساتذہ کی تربیت کے انتظامات کیے جائیں اور اگر یہ محسوس کیا جائے کہ موجودہ آئندہ تربیت پانے والے اساتذہ کی تعداد کو ان جگہوں پہ کھپانا دشوار ہو تو دوسری جگہوں مثلاً حیدر آباد، لکھنؤ اور سری نگر میں نئے تربیتی مراکز قائم کیے جائیں۔

تحتی کمیٹی کی خواہش ہے کہ مرکز ریاستوں کی توجہ آئین ہند کی دفعہ ۳۴۷ کی طرف مبذول کرائے جس کے تحت وہ آندھرا اور بہار کی طرح اردو کو سرکاری رتبہ دے سکتی ہیں۔

جہاں تک انتظامیہ معاملات میں اردو بولنے والی اقلیت کی سہولتیں دینے کا تعلق ہے سب کمیٹی کے خیال میں اس سلسلے میں اہلیت ۱۵ فیصدی کے بجائے دس فیصدی ہونا چاہیے۔

کمیٹی نے دو تحقیقی ادارے قائم کرنے کے سوال پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور یہ اپیل کی ہے کہ موجودہ اداروں مثلاً خدا بخش مشرقی لائبریری پٹنہ، ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد یا کسی اور اہل ادارہ کو مضبوط بنانے کے لیے ٹھوس تجاویز پر غور کیا جائے۔ اس کے علاوہ اردو زبان و ادب کی تحقیق کے لیے ایک مرکزی ادارہ قائم کرنے کی بھی سفارش کی گئی ہے۔

تحتی کمیٹی کی تجویز ہے کہ مرکزی ہندی ڈائرکٹوریٹ کے مشورے سے فروغ اردو بورڈ ایک معیاری بنیادی پروگرام بنائے۔ کیونکہ ہندی ڈائرکٹوریٹ اس بات پر رضامند

ہوگئی ہے کہ اردو کی ادبی کتابوں کو ہندی میں شائع کیا جائے۔ اور ان کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا جائے۔

کمیٹی کی سفارش ہے کہ فروغ اردو بورڈ کو مضبوط بنانے کی کوشش کی جانا چاہیے اور مرکزی وزارت تعلیم میں ایک خصوصی شعبہ قائم کیا جائے جو مرکز اور ریاستوں میں تعلیم کے میدان میں اردو کے فروغ کو مربوط کرنے اور ان کی نگہداشت کرے۔

ایک اور تجویز یہ ہے کہ اردو ٹائپ اور اسٹینو گرافی کے مراکز اہم اردو بولنے والے علاقوں میں کھولے جائیں۔ اور اردو ٹائپ رائٹر بنانے کے لیے جلد از جلد اس کے بورڈ کی منظوری دی جائے۔

اس کمیٹی کی دوسری سفارشات مراسلاتی کورسوں، اردو ادیبوں کو بڑھاپے کی پنشن اور وظیفہ کی رقم میں اضافے۔ اہم اردو لائبریریوں کے لیے رقوم کی منظوری اردو کتابوں کی فروخت کو فروغ دینے کی مہم اور سرکاری نوٹسوں اور فارموں کو اردو میں مہیا کیے جانے سے متعلق ہیں۔

سید نجم الدین نقوی

غزل

اک بت کی جو آرزو بہت ہے
رسوائی کو بہ کو بہت ہے

مانا کہ ستم شعار ہے وہ
کیا کیجیے خوبرو بہت ہے

اے چشم سرشک خون ذرا تھم
مجمع سر آب جو بہت ہے

شاید کہ ہے شیخ مجلس آرا
میخانے میں ہا و ہو بہت ہے

مجنوں سے ملے تو ہنس کے بولا
دامن میں ترے رفو بہت ہے

مت جائیے سوئے گل فروشاں
سینے میں مرے لہو بہت ہے

ہاتھوں سے ملے جو اُس کے نقوی
یک جرعۂ مشکبو بہت ہے

یوم سرسید کے موقع پر انتخاب مضامین گزٹ کا اجرا

۱۷ر اکتوبر کو یوم سرسید کے موقع پر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں آندھرا پردیش اردو اکادمی کی شائع کردہ کتاب انتخاب مضامین انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجرا مرکزی وزیر توانائی جناب شیو شنکر نے فرمایا۔ اس موقع پر کتاب کا تعارف کراتے ہوئے وائس چانسلر جناب سید حامد نے فرمایا کہ سرسید کے یہ مضامین اخبار سائنٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے اخذ کیے گئے ہیں۔ یہ ایک ایسا اخبار تھا جس نے اجتماعی طرز احساس کو اپنی صحافت کا حوالہ بنایا تھا۔ نیز انیسویں صدی کے نصف آخر کی سماجی سیاسی اور تعلیمی تاریخ کا یہ ایک معتبر اشاریہ ہے۔ اس اخبار نے قومی وحدت کو مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے کتاب کے مرتب ڈاکٹر اصغر عباس کا ذکر کرتے ہوئے وائس چانسلر نے کہا کہ اس سے قبل اصغر عباس کی سرسید پر دوسری کتابیں شائع ہو چکی ہیں جنھیں علمی حلقوں میں پسند کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب بھی بڑی محنت سے اس طرح کیا گیا ہے کہ سرسید کا طرز فکر سامنے آگیا ہے۔

طاہر قزلباش

ثاقب مرحوم

لکھنؤ اسکول ایک عرصے سے علم و ادب کا گہوارہ مانا جاتا ہے یہاں کے علم و ادب اور تہذیب کی شہرت دنیا میں چاروں طرف ہے۔ اس زرخیز زمین نے بڑے بڑے جیّد عالموں، شاعروں، صحافیوں اور ادیبوں کو جنم دیا ہے۔ اس کے شعر و سخن میں ممتاز کہنہ مشق شاعر مرزا ذاکر حسین قزلباش ثاقب لکھنوی نے بھی جنم لیا جن کی شخصیت ادبی و علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ اور جب بھی لکھنؤ کے شعراء کا مختصر سے مختصر تعارف کہا جائے گا تو اس میں ثاقب لکھنوی کے نام کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا

ثاقب لکھنوی میں لکھنوی تہذیب پوری طرح رچی بسی تھی اور ان کے تمام اشعار میں اس کی جھلک ملتی ہے۔ ثاقب لکھنوی نے غزل میں ایک انوکھا پن نیا نکھار اور نئی زندگی بخشی ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی — اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

بہت سی عمر مٹا کر جسے بنایا تھا — مکاں وہ جل گیا تھوڑی سی روشنی کے لیے

نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی — ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

حشر میں میرا ہو چھپنا تو آخر کس طرح — آپ بھی بھولے نہ تھے مجھ کو بھی کچھ کچھ یاد تھا

ثاقب مرحوم نے جب شاعری شروع کی تو وہ زمانہ بڑے امتحان کا تھا۔ اس وقت لکھنؤ میں بیک وقت کئی اساتذہ شاعری کے میدان میں موجود تھے۔ لیکن ثاقب لکھنوی نے شکست نہیں قبول کی اور اپنی شعری تخلیقات کی بنا پر غلبہ حاصل کیا۔

شعر گوئی کے میدان میں وہ میر و غالب کی پیروی کرتے تھے جس کو وہ یوں کہتے ہیں ؎

ملی اس شرط پر ہے جانشینی میر و غالب کی — کہ رکھا جائے میرے بھی مقدر کا ورق سادہ

ثاقب مرحوم کے یہاں زبان اور ترتیب کا ایک خاص مزاج و انداز ملتا ہے اتنی

آسان زبان میں وہ شعر کہا کرتے تھے کہ قاری بے ساختہ اس جادو سے متاثر ہو جاتا تھا۔ سادہ سادہ لفظیں آسان زبان جیسے کوزہ میں سمندر بھرا ہو۔

اختصار سے ثاقب مرحوم مایوس نہیں ہیں اور وہ تھوڑے وقفہ کو بھی کافی تصور کرتے ہیں۔ اس شعر میں کتنا سوز، درد کتنی حسرت اور تمنا ہے ؂

آدھی سے زیادہ شب غم کاٹ چکا ہوں اب بھی اگر آجاؤ تو یہ رات بڑی ہے

درد و غم کچھ کم نہ تھا لیکن کبھی کسی سے اس کا اظہار نہ کیا۔ ان کا یہ شعر ان کے غم کو پوشیدہ نہ رکھ سکا۔

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

ثاقب مرحوم بھی آلام روزگار کا شکار رہے ہیں انھیں کافی حد تک دنیاوی زندگی کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے باوجود بھی اس جلن، تڑپ، کسک کے تاثرات کو متھاس کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اس کا کسی سے اظہار نہیں کرتے اور اگر کسی نے پوچھا تو یوں کہتے ہیں ؂

پرسشِ حال اس نے کی تو بے تھکے یہی کہنا پڑا کہ اچھا ہوں

ثاقب مرحوم نے صبر و استقلال کا دامن چاک نہیں ہونے دیا اور چہرہ پر وہی سکون اور مسکراہٹ موجود، چاہے زمانہ انھیں کچھ بھی کہے، وہ صبر کرتے رہے جس کو وہ یوں فرماتے ہیں ؂

پھول سا قلب ہے، اور صبر کی سِل رکھتا ہوں جب وہ کہتا ہے زمانہ کہ میں دل رکھتا ہوں

ثاقب مرحوم کی شاعری کو اگر پرکھا جائے تو عالمی پیمانے پر بھی کھری اترتی ہے۔ کیوں کہ وہ ایک سچے اچھے عظیم اور ہر دلعزیز شاعر تھے جن کو ادبی دنیا میں کسی طرح بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

جسمانی طور پر ۲۴ نومبر ۱۹۴۹ء میں اس خرابے سے انتقال فرما گئے۔ مگر اپنے شعری کارناموں سے ابھی زندہ ہیں اور زندۂ جاوید رہیں گے جس کو وہ یوں کہہ گئے ہیں ؂

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

خورشید افسر بسوانی

غزل

دام صد موج سے پیدا ہے خطر پانی میں
اے پرندے ذرا آہستہ اتر پانی میں

ایک دریا میں جو ڈوبا ہے وہ ابھرا ہی نہیں
طے ہوا کتنی ہی روحوں کا سفر پانی میں

جانے کیا سوچ کے پہلے تو بھرے مٹھی میں
اور پھر پھینک دیئے سارے گہر پانی میں

آنکھ ہوا جھیل ہوا دریا ہو کر بھرنا کوئی
کچھ نہ کچھ فرق تو مل جائے گا ہر پانی میں

غم سمندر ہے، سمندر کی کوئی تھاہ نہیں
تو مری مان، نہ اس طرح اتر پانی میں

کبھی اس بحرِ بیک آب سے مل کر دیکھو
کیسے کیسے نظر آتے ہیں بھنور پانی میں

مجھ میں اعجازِ عصا ہے نہ وہ تقدیسِ کلیمؑ
پھر بھی رکھتا ہوں میں اک راہ گزر پانی میں

میں ہی اک تپتی ہوئی ریت میں ڈوبا افسر
ورنہ لوگ اور بھی ڈوبے ہیں مگر پانی میں

اردو ——— ایک معاشرہ

اناؤ ۲۴ اکتوبر۔ اردو شاعر و ادیب راجندر بہادر موج ممبر یوپی اردو اکادمی نے آج گنگا گھاٹ ضلع اناؤ میں صحافیوں اور ادیبوں کی ایک میٹنگ میں جو زیر اہتمام ہندی اردو سمیلن منعقد ہوئی تھی کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"اردو صرف ایک زبان ہی نہیں ہے بلکہ ایک طریق زندگی، ایک معاشرہ ایک تہذیب، اور ایک خیر سگالی باہمی مفاہمت کا ذریعہ بھی ہے۔ اردو کی ترقی، قومی یک جہتی کی اساس کی ترقی ہے اور ملک کی ترقی کا ایک موثر طریقہ ہے۔

جناب موج نے مزید فرمایا "جنگ آزادی کی تاریخ میں اردو ادیبوں کی خدمات و محبان اردو کی قربانیوں کا ایک شاندار باب ہے"۔

آخر میں سمیلن نے اردو کا ایک شبینہ اسکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

سمیلن کے ادھیکش ڈاکٹر کے کے ورما نے سمیلن میں شرکت والوں کا شکریہ ادا کیا۔

رام لعل کی تصانیف اردو کورسوں میں

اردو کے ممتاز افسانہ نگار رام لعل صاحب کا ناولٹ "نئی دھارا" جسے یوپی اردو اکادمی ۱۹۸۲ء میں انعام بھی دے چکی ہے کو پنجاب یونیورسٹی نے ادیب فاضل کے کورس میں شامل کر لیا ہے۔ اس سے قبل رام لعل صاحب کے افسانوں کا ایک مجموعہ "اکھڑے ہوئے لوگ" گورو نانک یونیورسٹی کے ایم اے کے کورس میں شامل ہے اس تصنیف کو بھی یوپی اردو اکادمی ۱۹۶۷ء میں انعام دے چکی ہے۔

میرٹھ یونیورسٹی میں مذاکرہ

میرٹھ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین نے یونیورسٹی کے کمیٹی روم میں اردو دوستوں اور دانشوروں کی موجودگی میں اس امر پر اظہار اطمینان کیا کہ اترپردیش کے نئے وزیر اعلیٰ جناب شری پت مشر صاحب نہ صرف سلجھے ہوئے صاف ذہن کے سیاست داں ہیں بلکہ شستہ و شائستہ مذاق کے حامل مہذب انسان، کثیر المطالعہ شخصیت ہیں۔ انھیں اردو سے بڑا لگاؤ اور گہرا شغف ہے۔ اس بات کے شاہد ان کے وہ مبارکبادی خطوط ہیں جو ابھی حال ہی میں عید کے موقع پر انھوں نے ملک کی مقتدر ہستیوں کو اپنے چھپے ہوئے پختہ اردو رسم خط میں تحریر کئے تھے

موضوع گفتگو قیادت کی تبدیلی کے بعد اردو سے متعلق پالیسیوں کا نفاذ اور وعدوں کا ایفا تھا۔ کئی دانشوروں کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ کیا ریاست کا نیا کارواں اردو کے ساتھ حسن سلوک کی روش پر گامزن رہے گا؟ ڈاکٹر شاہین اور ڈاکٹر قمر رئیس نے اس بات پر زور دیا کہ اردو نوازی کی پالیسی کو پوری کانگریس جماعت کی اکثریت حاصل تھی۔ مرکز اور خصوصاً شریمتی اندرا گاندھی ہماری لائق و فائق وزیر اعظم کی حمایت حاصل ہے اس لیے اس میں تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ وزیر اعلیٰ کا منصبی مقام ہے کہ وہ اردو کے فیصلوں کو تیزی کے ساتھ نافذ فرمائیں۔ ان کی فعال شخصیت سے اس بات کی پوری امید ہے۔

اس مذاکرے میں شامل شرکاء کے اسمائے گرامی ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر بشیر بدر، پروفیسر وسیم بریلوی، پروفیسر خالد حسین خاں، ڈاکٹر ڈی۔ آر۔ شرما [illegible] کے علاوہ جناب [illegible] صاحب و [illegible] کو صدارت جناب ڈاکٹر رام [illegible] سنگھ صاحب وائس چانسلر میرٹھ یونیورسٹی میرٹھ۔

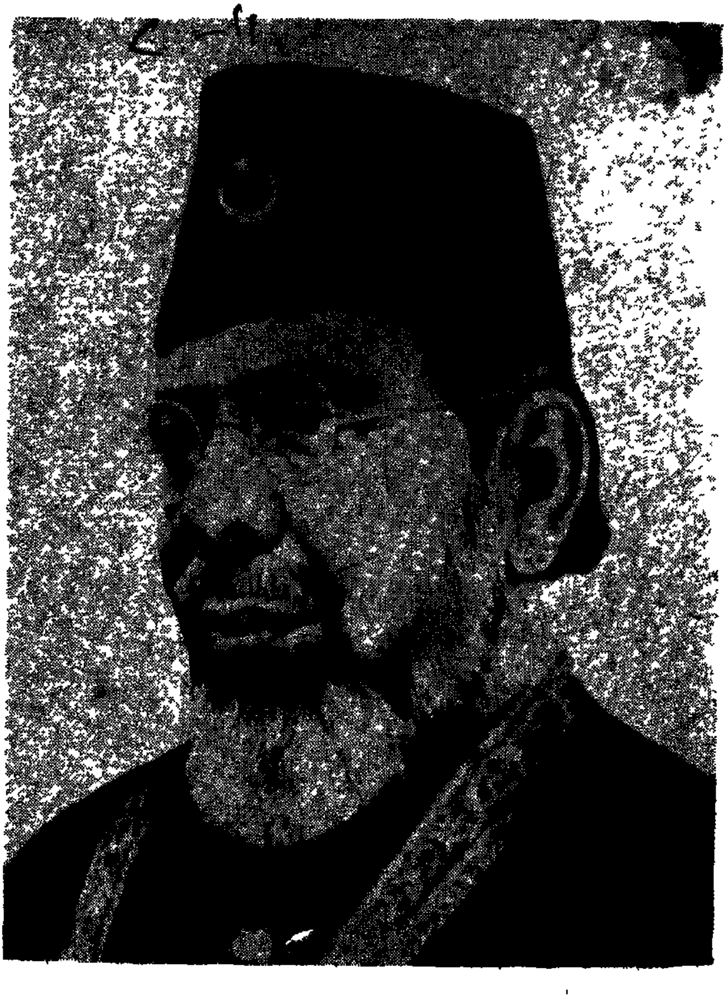
Uttar Pradesh Urdu Akademi
KHABARNAMA NOVEMBER 82

REG N.
LW/NP-126

Cover printed at : ANUJ PRINTERS, C 1106, Sector A-3, Mahanagar, Lucknow

خبرنامہ

اتر پردیش اردو اکادمی



محمد علی جوہر نمبر

اترپردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

(بیادگار جوہر)

جلد ۱۱ شمارہ ۷

جنوری ۱۹۸۳ء

نگراں

پروفیسر محمود الٰہی

سالانہ چندہ :- پانچ روپے

فی شمارہ :- ۵۰ پیسے

سرورق تصویر : مولانا محمد علی جوہر

عبدالجبار خاں، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے دفتر اترپردیش اردو اکادمی قیصر باغ لکھنؤ سے شائع کیا اور نامی پریس نخاس لکھنؤ نے طبع کیا۔

ترتیب

اداریہ

جوہر کی یاد میں!

آزادی کتنی بڑی نعمت ہے اور ہمارے ملک کو یہ کتنی قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی ہے، اس کا تھوڑا بہت اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم جدوجہد آزادی کی منصفانہ تاریخ کا مطالعہ کریں۔ نئی نسل اپنی تاریخ سے بیگانہ ہوتی جارہی ہے اور اس کے ایک بڑے گروہ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ جدوجہد آزادی کی فعال اور فیصلہ کن قیادت کن بزرگوں کے حصے میں آئی تھی۔ قصور نئی نسل کا نہیں ہے، قصور ہمارا ہے کہ ہم اس کے سامنے حق و صداقت پر مبنی صحیفۂ تاریخ نہیں پیش کر سکتے۔

یہ کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے کہ اردو نے اپنی ہم عصر زبانوں کے مقابلے میں تحریک آزادی کا قابلِ فخر حد تک ساتھ دیا اور یہ واحد ہندوستانی زبان ہے جس میں انڈین نیشنل کانگریس اور آزادی کی علمبردار دوسری جماعتوں کے سالانہ جلسوں میں قابلِ لحاظ تعداد میں خطبات پڑھے گئے۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ آزادی کی راہ میں اردو نے جو خدمات انجام دی تھیں، اُن سے ابھی تک عوام کسی نہ کسی سبب سے بے خبر رکھے گئے۔

یہ بات اترپردیش اردو اکادمی کے واجبات میں داخل ہے کہ اگر ایک طرف وہ شعر و ادب کی ممتاز شخصیتوں پر سمینار منعقد کرے اور ان کی تخلیقات منظرِ عام پر لائے تو دوسری طرف تحریک آزادی کے سیاق و سباق میں اردو کے کردار کو ذہن نشین کرائے۔ اس طرح مولانا محمد علی جوہر پر کسی سمینار کا

انعقاد اس کے دونوں مقاصد کی تکمیل کا ایک بہت مناسب ذریعہ ہے۔ جوہر کا شمار ان زعمائے قوم میں ہے جنھوں نے ہندوستان کے بچے بچے کو بیدار کیا اور ان کے اندر آزادی کامل کی تڑپ پیدا کی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ اردو کے اچھے شاعر اور بے باک و بیدار مغز صحافی تھے۔

اکادمی نے آزادی کے ادب کی ترتیب و اشاعت کا ایک جامع منصوبہ مرتب کیا ہے۔ جوہر پر یہ سیمنار اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، اس سیمنار میں جو مقالات پڑھے جائیں گے وہ جلد ہی کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوں گے۔ جوہر پر کچھ اور مواد زیر ترتیب ہے جس کی اشاعت بھی جلد از جلد ہوگی۔

محمود الٰہی

مقطع میں آپڑی ہے ... ...

عظمت کا راز

جس طرح نالہ پابندِ نَے نہیں ہوتا، اسی طرح تحقیق یا ریسرچ موضوع کی پابند نہیں ہوتی۔ اس علمی آزادہ روی میں کبھی کبھی بڑے حکیمانہ نکات سامنے آجاتے ہیں۔ ایک صاحب ان لوگوں کی عظمت کا راز معلوم کرنا چاہتے تھے جن کا شمار اردو کے صاحبِ طرز ادیبوں اور شاعروں میں بھی ہوتا تھا اور تحریک آزادی کے سورماؤں میں بھی۔ پہلے تو انھوں نے ایک فہرست مرتب کی جن میں از روئے احتیاط صرف تین نام شامل کئے اور اس فہرست کا عنوان انھوں نے "حریت کامل اور اردوئے معلی کے عناصر ثلاثہ" رکھا ــــ یہ عناصر ثلاثہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی اور مولانا محمد علی جوہر۔ پھر انھوں نے الہلال، البلاغ، کامریڈ ہمدرد، اردوئے معلی اور مستقل کی فائلیں چاٹ ڈالیں، آرکائیوز کے محفوظ ریکارڈ کا معائنہ کیا؛ ان عناصر ثلاثہ کے بچے کھچے احباب و معاصرین کو ڈھونڈ نکالا اور ان کا انٹرویو لیا۔ یہی نہیں، انھوں نے ایک سوالنامہ مرتب کیا جسے سرفروشانِ اردو

کے پاس بھیجا کر اس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

اس تگ و دو کو دیکھ کر لوگ سمجھے کہ اب ان کی ریسرچ مکمل ہونے والی ہے اور یہ جلد ہی ان عناصر ثلاثہ کی عظمت کے اسرار و رموز پر مستند مقالہ شائع کر دیں گے۔

—— مگر لوگوں کو حیرت ہوئی کہ ذوق تحقیق نے ان صاحب کو پاگل خانے میں پہونچا دیا!!

ہوا یہ تھا کہ یہ بیچارہ گلی کوچے میں یہی چیختا چلاتا پھرتا تھا کہ ان عناصر ثلاثہ نے کبھی ادبی تقریبات نہیں منعقد کیں، کبھی ادبی جلسوں کی صدارت ان لوگوں سے نہیں کرائی جو علامہ اقبال کے بارے میں یہ انکشاف کرتے تھے کہ انھوں نے ساری عمر قید فرنگ میں گزار دی تھی، انھوں نے اپنے خارج الوزن مجموعۂ کلام پر انعامات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی، لسانی اور قومی مسائل میں یہ طریقہ نہیں اختیار کیا کہ قوم سے کچھ کہتے اور ارباب اقتدار سے کچھ ... —— اور —— اور —— اور انھوں نے "زادراہ" کے سیاق و سباق میں سفر کو وسیلۂ ظفر نہیں بنایا —— پھر یہ آخر عظیم کیسے ہوئے؟ یہ عظیم نہیں تھے، یہ عظیم نہیں تھے۔!!

ایک دن یہ صاحب چیختے چلاتے ایک ادبی محفل میں پہونچ گئے تو لوگوں نے ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو انشاء اللہ خاں انشا کے ساتھ روا رکھا گیا تھا۔ انشا کا تو کچھ پتہ نہیں چلا کہ کس بحر حیا میں جا کر ڈوب مرے لیکن یہ صاحب بہ نفس نفیس پاگل خانے میں موجود ہیں اور تفنن طبع کے طور پر کبھی کبھی یہ شعر بھی گنگناتے رہتے ہیں جو ادبی محفل سے نکالے جانے کے وقت ان کی شان میں پڑھا گیا تھا۔

اقبال کے نفس سے ہے لالے کا رنگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

—— نباض

پروفیسر آل احمد سرور

محمد علی جوہر کی یاد

باطل کے سامنے نہ جھکا جو تمام عمر
ہندوستاں تجھے وہ قلندر بھی یاد ہے

بجلی تھا جس کا ذہن، نظر تیغ تیز تھی
آئینہ حرم کا وہ جوہر بھی یاد ہے

تقریر میں وہ سیلِ کہستاں کا سا جلال
تحریر میں وہ طنز کا نشتر بھی یاد ہے

افکار میں وہ لذّتِ عرفان و آگہی
اشعار میں وہ بادہ و ساغر بھی یاد ہے

پُرسوز، لالہ کار، جنوں پیشہ، دل نواز
ہر رزم و بزم کا وہ شناور بھی یاد ہے

اس خاکداں میں جس کی سمائی نہ ہو سکی
طغیانِ شوق کا وہ سمندر بھی یاد ہے

تخریب جس کی باعثِ تعمیرِ نو ہوئی
وہ بُت شکن بھی یاد ہے بُت گر بھی یاد ہے

جھوٹے نگوں پہ جان جو دیتے ہیں اے سرورؔ
پوچھو یہ اُن سے کیا کوئی جوہر بھی یاد ہے

(ماخوذ)

مولانا محمد علی جوہر

آپ بیتی

(میری زندگی کے پچاس سال)

جس خالق نے مجھے ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ کو پیدا فرمایا تھا اس کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج بتاریخ ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ میں نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے کئے۔ اس پوری مدت پر نظر ڈالتا ہوں تو عجیب عجیب خیالات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۷ رمضان المبارک ۱۲۹۷ھ کو میرے والد نے بعارضہ ہیضہ کوئی تیس تینتیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت میری والدہ مرحومہ کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کی تھی۔ سوائے قرآن پاک کچھ نہ پڑھا تھا اسی کی مدد سے خود اردو کا بین السطور ترجمہ پڑھنے کی استعداد پیدا کر لی تھی۔ والد نے تیس بتیس ہزار کا قرضہ چھوڑا تھا اور پانچ لڑکے اور ایک لڑکی جن میں سے سب سے بڑی کی عمر ۱۳ سال کی تھی جو تین برس ہی کی عمر میں مرگی کے موذی مرض میں مبتلا رہے اور سب سے چھوٹا خود میں تھا جس کی عمر اس وقت پونے دو سال کی تھی۔ مجھے اپنے والد مرحوم بالکل یاد نہیں مگر والدہ مرحومہ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ علاوہ اس فیض گراں مایہ کے جو شوکت صاحب کی محبت، نگرانی اور ترغیب و تحریص کی بدولت مجھے نصیب ہوا ہے میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے مجھے اسی مرحومہ کے ذریعے سے پہنچایا ہے۔ والد مرحوم کی وفات کے دن سے خود گھر کی بوڑھی ماماؤں کا سا سادہ اور سستا لباس پہنا اور انھیں کی طرح روکھی سوکھی کھا کر گذر کی مگر ہمارا کوئی سوال رد نہیں کیا اور ہمیں اس عیش و آرام میں رکھا، پالا

اور بڑا کیا جو ہمارے ان چچاؤں کی اولاد کے عیش و آرام سے کسی طرح کم نہ تھا مگر کچھ زیادہ ہی تھا جو بفضلہ تعالیٰ والد مرحوم کی وفات کے وقت زندہ اور سلامت تھے؛ جن کی جائدادوں پر قرضے وہ بوجھ نہ تھا جو ہمارے ترکے پر تھا اور جو ریاست رام پور میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے۔ ان سب سے پہلے ہمیں کو گھر سے نکال کر بریلی اسکول میں تعلیم کے لیے والدہ مرحومہ نے بھیجا اور وہ سب تو اسکول چھوڑ چھوڑ کر گھر چلے گئے مگر ہماری ہی تعلیم جاری رہی اور شوکت صاحب جس طرح ریاست رام پور کے باشندوں میں سے غالباً سب سے پہلے کسی ہندوستانی یونیورسٹی کے گریجویٹ ہوئے اسی طرح ان میں سب سے پہلے آکسفورڈ کا گریجویٹ میں ہوا۔ میرے سب سے بڑے چچا جو ہماری جائداد کا انتظام فرمایا کرتے تھے اور ریاست میں ایک بہت بڑے عہدے پر ممتاز تھے اس وقت زندہ تھے جب میں ان کے سب سے چھوٹے مرحوم بھائی کا سب سے چھوٹا لڑکا اور ایک بیوہ کا پرورش کردہ اسی ریاست میں ان سے بھی بڑے عہدے پر مقرر کیا گیا تو انھوں نے اس اعزاز پر مجھے گلے لگا لیا اور پیار کیا۔

ریاست ہائے رام پور اور بڑودہ میں اچھے خاصے عہدوں پر ملازمت کرنے اور جو جو خدمتیں تفویض ہوتی رہیں انھیں نیک نامی کے ساتھ بجا لانے اور چند اور ریاستوں میں ان سے بھی اعلیٰ عہدوں کے دیے جانے مگر بہ مجبوری قبول نہ کر سکنے کے بعد میں نے دنیائے صحافت میں قدم رکھا اور ملک و ملت کی خدمت کے لیے اس شعبۂ زندگی میں داخل ہوا۔ آج یہ کہنا مشکل ہے کہ ان خدمات کی انجام دہی میں نیک نامی حاصل کی یا بدنامی لیکن غالباً یہ تو آج بھی نہ کہا جائے گا کہ گم نام رہا۔ مسلمانوں کی سب سے پہلی نمائندہ سیاسی انجمن یعنی مسلم لیگ کی سنہ ۱۹۰۶ء میں بنیاد ڈالی اور سنہ ۱۹۱۷ء میں اس کا صدر منتخب ہوا۔ گو قید فرنگ کی بدولت کرسیٔ صدارت پر میری تصویر ہی "جلوہ افروز" ہوئی اس عزت افزائی کے باعث اپنی ملت کا آج تک مشکور ہوں۔ مگر میری نظر میں جو اس کی

حقیقت تھی وہ اس زمانے کے اس شعر سے واضح ہوتی تھی ؎

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمھیں جوہر لیکن صلۂ روز جزا اور ہی کچھ ہے

پانچ سال کی نظر بندی اور قید سے رہائی پر ۱۹۲۰ء میں جمعیت خلافت کی طرف سے ایک وفد کا سر گروہ ہو کر یورپ جانا اور وزرائے برطانیہ، فرانس و اطالیہ و پاپائے روم سے ملنا پڑا۔ پھر دو سال کی قید سخت کی سزا بھگتی اور اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں ہندوستان کی سب سے بڑی نمائندہ سیاسی انجمن انڈین نیشنل کانگرس کی صدارت کے لیے باتفاق رائے انتخاب ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں سب سے پہلے عالم اسلام کی موتمر کے لیے بھی مسلمانان ہندوستان کی نمائندگی کے لیے جمعیت خلافت کی طرف سے منتخب ہوا ؎

نے بے سعادت آں بندۂ کرد نزول گہ بہ بیت خدا گہ بہ بیت رسول

گو موتمر کا اجلاس دوم حج کے موقع پر مکہ معظمہ میں منعقد نہیں کیا گیا لیکن موتمر کی شاخ ہند کی طرف سے اس کے لیے بھی بلا اختلاف منتخب ہوا۔ ان مناصب کے متعلق جو فرائض تھے انھیں نیک نامی سے انجام دیا، یا بد نامی نصیب ہوئی یہ نہیں کہہ سکتا مگر یقیناً گم نام نہیں رہا۔

لیکن نہ یہاں کا نام مطلوب ہے اور نہ یہاں کی نیک نامی جو کچھ مطلوب ہے وہی "صلۂ روز جزا" ہے جس کا ۱۹۱۷ء کے انتخاب صدارت کے بعد کے شعر میں ذکر ہے۔ دیکھئے وہاں کیا ملتا ہے ؎

کیا نہ ہو گی میری ہی حاجت روا جس کا مولیٰ قاضی الحاجات ہے

اس کی رحمت پر ہو جس کا آسرا اس کو کیا حزنِ غمِ مافات ہے

لے چلے ہیں اس کی رحمت کا یقیں اپنی تو صاحب یہی لوقات ہے

خود خدا شاہد ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے، اس پر اور اس کے رسول پر ایمان ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ بہ سختی سے ع ۔

ان کو مانا ہے، پہ کہنا نہیں مانا ان کا

ہزاروں گناہ کیے ہیں، فرائض مذہبی کی ادائگی میں لاکھوں کوتاہیاں ہوئی ہیں تاہم اس رحیم و کریم کا شکر ہے کہ اسلام کے مصائب میں شریک کر کے آنکھیں کھول دیں اور اپنے گمراہ بندے کو راہ راست پر لایا۔ ممکن ہے کہ اب بھی یہ وسوسۂ شیطانی ہی ہو اور میری بھی وہی حالت ہو جس کے متعلق غالب نے لکھا ہے کہ ع:

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

لیکن دل تو کہتا ہے کہ جس کے نام نامی پر میرے والدین نے میرا نام رکھا اسی کے طفیل میں مجھ پر بھی کرم ہوا۔ جتنا سوچتا ہوں وہی حقیقت معلوم ہوتی ہے جو حالت نظر بندی چھندواڑے میں ان اشعار میں ظاہر کی گئی تھی۔

یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر — دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے
اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم — حق کے عقدے اب کہیں جا کر کھلے
اب ہوا ہے ماسوا کا پردہ فاش — معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ — بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

کیا یہ جائز نہیں کہ میں بھی اپنے ہم نام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل میں آج جبکہ مجھے پیدا ہوئے نصف صدی گزر چکی اپنے دل کی ڈھارس بندھاؤں ..... اور اس غزل کا مقطع بھی سچ ہو جائے کہ ۔

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر — مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

جب میں دس بارہ برس کا لڑکا تھا تو خیال کیا کرتا تھا کہ پچاس برس کا آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے اور بڑھاپے میں اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے میں دوسروں کی مدد لینا پڑتی ہے اور دوسروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے اس لیے میری آرزو تھی کہ خدا کرے پچاس برس کی عمر سے پہلے ہی موت آ جائے تا کہ سسک سسک کر اور پلنگ پر

پڑے پڑے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا نہ پڑے۔ آج پچاس سال کا ہو گیا مگر اب تک موت نہ آئی حالانکہ جس سال سے میدانِ صحافت میں قدم رکھا ہے، ذیابیطس جیسے موذی اور مہلک مرض میں مبتلا ہوں اور جو راحت و آرام، سکون و بے فکری اس کا مقابلہ کرنے کے لیے درکار ہیں وہ مفقود ہیں۔ اس وقت تک جتنی عمر ہوتی ہے اس کا آخری تہائی حصہ اسی مرض میں گزرا ہے۔ اعضا میں اب قوت باقی نہیں ہے، حافظہ بے حد خراب ہو گیا ہے لیکن بحمد اللہ اب تک دوسروں کا دست نگر ہونا نہیں پڑا۔ اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے کھانے پینے میں ابھی دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت نہیں لینی پڑی اور گو سال گذشتہ میں چار ماہ صاحب فراش بھی رہا تب بھی ملک و ملت کے کاموں میں شرکت کی اور بیٹھے بیٹھے بلکہ لیٹے لیٹے بھی وہ خدمات انجام دیتا رہا جو کانگریس اور خلافت کے سلسلے میں مجھ سے متعلق تھیں۔ اسی حالت میں حج و زیارت کا شرف بھی نصیب ہوا اور گو اسی دن جس دن موتمر عالم اسلام نے رسمی افتتاح کے بعد اپنا اصلی کام شروع کیا آدھے جسم میں بے حسی پیدا ہو گئی اور وہ بھی قلب والے آدھے حصے میں اور میں سمجھا کہ اللہ میاں نے اپنے گھر بلا کر ہمیشہ ہی کے لیے مہمان نوازی فرمائی مگر موت نصیب ہو کر جنت المادیٰ میں سونا میسر نہ ہوا۔ دوسرے ہی دن سے موتمر کے ہر جلسے میں شریک ہوا اور جو کچھ ہو سکا کیا۔ اس کے ختم ہوتے ہی زیارت روضۂ رسولؐ کے لیے چلا تو راستے میں دنبل نکل آیا جس سے خیال ہوا کہ شاید اسی سوراخ سے ملک الموت تشریف لانے والے ہیں اور جنت المادیٰ و جگہ جنت البقیع میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مہمان نوازی کا سامان کر دیا جائے گا مگر جو موت مکہ معظمہ میں نصیب نہ ہوئی تھی وہ مدینہ منورہ میں بھی میسر نہ آئی۔ البتہ جب مولوی ثناء اللہ صاحب نے بندھا ہوا ہاتھ مدینہ منورہ سے واپسی پر دیکھ کر پوچھا تو غالب کے غیر مطبوعہ کلام میں سے یہ شعر سنانا پڑا کہ؎

موت ان کی ہے جو بس مر کے وہیں دفن ہوئے　　زندگی ان کی جو اس کوچے سے گھائل آئے

نہ معلوم ہمارے قبہ و قبر شکن بھائی اس موت کے قائل ہیں یا نہیں جو صرف انھیں کا حصہ ہے (جو کہ مر کے وہیں دفن ہوئے) لیکن میں تو اس قبہ و قبر شکنی پر بھی اس کا قائل ہوں اور نیز اس زندگی کا جو اُن کا حق ہے (جو اس کوچے سے گھائل آئے) میں کہ بحمداللہ اس سے گھائل ہو کر آیا ہوں۔ باوجود روز افزوں ملکی و ملی، ذاتی مصائب کے آج ۱۵/ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ تک اس زندگی کا لطف اٹھا رہا ہوں جو اس "کوچے" سے گھائل آنے والوں کو عنایت ہوتی ہے اور اس "کوچے" کی خاکروبی کی خدمت جہاں تک ہو سکتا ہے اس دور افتادگی کی حالت میں بھی کرتا ہی رہتا ہوں چاہے کسی اور بھائی کو جو وہاں سے گھائل ہو کر نہیں آیا ہے پسند آئے یا نہ آئے جس کی طفیل میں یہ زندگی نصیب ہوئی۔ اسی کے طفیل میں اس ذات پاک سے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے التجا ہے کہ اگر اس کوچے ہی میں ایک مشت استخواں کے لیے دو مشت خاک پاک نصیب ہو جائے تو بڑا کرم ہو گا لیکن اگر اس سعادت سے محروم رہوں تب بھی یہ تو آج حکم ہو جائے کہ جس بندے کا نام محمدؐ اور علیؑ کے اسمائے گرامی پر آج سے پچاس سال پیشتر ہم نے رکھوایا تھا اس کو اب جتنے دن اور جینا ہے محمدؐ اور علیؑ ہی کے دین کی خدمت کے لیے جلایا جائے تاکہ ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات ہو کیونکہ ؎

وہی دن ہے ہماری عید کا دن
جو تری یاد میں گزرتا ہے

اور جہاں کہیں بھی موت آئے اسی راستے میں آئے جس میں محمدؐ اور علیؑ کو آئی تھی۔

(مضامین محمد علی بحوالہ
ہمدرد ۱۷/ جون ۱۹۲۷ء)

محمد حامد علی

صلۂ شہید کیا ہے   تب و تاب جاودانہ

لندن میں گول میز کانفرنس کی کارروائی جاری تھی جس میں کچھ سیاسی رہنما، والیان ریاست کے نمائندگان اور حکومت برطانیہ کے نمائندے حصہ لے رہے تھے۔ یکایک ایک مرد مجاہد کی للکار نے سامعین کے دلوں کی حرکت تیز تر کردی، وہ للکار رہا تھا۔

"میں یہاں درجہ نوآبادیات طلب کرنے نہیں آیا ہوں، نہ میں درجہ نوآبادیات کے حصول پر یقین رکھتا ہوں۔ صرف ایک چیز ہے جس کا میں عہد کرچکا ہوں اور وہ کامل آزادی ہے ..... میں دوستانہ طور پر ایمانداری اور صفائی سے کہتا ہوں، کہ تمہارا سب سے بڑا گناہ ہندوستان کی بے دست و پائی ہے ..... ہمارے ملک میں بتیس کروڑ نفوس انسانی آباد ہیں، اگر وہ لاکھوں کی تعداد میں قحط اور طاعون وغیرہ سے ہلاک ہوسکتے ہیں تو یقیناً ان میں سے کچھ برطانوی گولیوں سے مرنے کیلئے تیار ہوسکتے ہیں۔ یہی وہ سبق ہے جو گاندھی جی ہم کو سکھانا چاہتے تھے اور یہی وہ سبق ہے جو ہم کو اب سیکھ لینا چاہئے ..... اصل میں جو سوال ہم کو سب سے زیادہ پریشان کررہا ہے وہ ہندو مسلم سوال ہے لیکن اس کی حقیقت کچھ نہیں، فی الحقیقت ہندو مسلم مشکلات، فوجی مشکلات کی مانند خود تمہاری پیدا کردہ ہیں.....
خدائے برتر کے حکم کے سامنے میں اول مسلمان ہوں دوم مسلمان ہوں اور آخر

نہ معلوم ہمارے قبہ و قبر شکن بھائی اس موت کے قائل ہیں یا نہیں (جو صرف انھیں کا حصہ تھا جو مکہ سے سرکے وہیں دفن ہوئے) لیکن میں تو اس قبہ و قبر شکنی پر بھی اس کا قائل ہوں اور نیز اس زندگی کا جو اُن کا حق ہے (جو اس کوچے سے گھائل آئے) میں کہ بحمد اللہ اس سے گھائل ہو کر آیا ہوں باوجود روز افزوں ملکی و ملی، ذاتی مصائب کے آج ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ تک اس زندگی کا لطف اٹھا رہا ہوں جو اس کوچے سے گھائل آنے والوں کو عنایت ہوتی ہے اور اس کوچے کی خاک روبی کی خدمت جہاں تک ہو سکتا ہے اس دور افتادگی کی حالت میں بھی کرتا ہی رہتا ہوں چاہے کسی اور بھائی کو جو وہاں سے گھائل ہو کر نہیں آیا ہے پسند آئے یا نہ آئے جس کی طفیل میں یہ زندگی نصیب ہوئی۔ اسی کے طفیل میں اس ذات پاک سے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے التجا ہے کہ اگر اس کوچے ہی میں ایک مشت استخوان کے لیے دو مشت خاک پاک نصیب ہو جائے تو بڑا کرم ہوگا لیکن اگر اس سعادت سے محروم رہوں تب بھی یہ تو آج حکم ہو جائے کہ جس بندے کا نام محمدؐ اور علیؑ کے اسمائے گرامی پر آج سے پچاس سال پیشتر ہم نے رکھوایا تھا اس کو اب جتنے دن اور جینا ہے محمدؐ اور علیؑ ہی کے دین کی خدمت کے لیے جلایا جائے تاکہ ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات ہو کیونکہ ؎

وہی دن ہے ہماری عید کا دن
جو تری یاد میں گزرتا ہے

اور جہاں کہیں بھی موت آئے اسی راستے میں آئے جس میں محمدؐ اور علیؑ کو آئی تھی۔

(مضامین محمد علی بحوالہ
ہمدرد ۱۸ جون ۱۹۲۷ء)

محمد حامد علی

صلۂ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

لندن میں گول میز کانفرنس کی کارروائی جاری تھی جس میں کچھ سیاسی رہنما، والیان ریاست کے نمائندگان اور حکومت برطانیہ کے نمائندے حصہ لے رہے تھے۔ یکایک ایک مرد مجاہد کی للکار نے سامعین کے دلوں کی حرکت تیز تر کردی، وہ للکار رہا تھا۔

" میں یہاں درجہ نوآبادیات طلب کرنے نہیں آیا ہوں، نہ میں درجہ نوآبادیات کے حصول پر یقین رکھتا ہوں۔ صرف ایک چیز ہے جس کا میں عہد کرچکا ہوں اور وہ کامل آزادی ہے ..... میں دوستانہ طور پر بیباکی اور صفائی سے کہتا ہوں، کہ تمہارا سب سے بڑا گناہ ہندوستان کی بے دست و پائی ہے ..... ہمارے ملک میں تیس کروڑ نفوس انسانی آباد ہیں، اگر وہ لاکھوں کی تعداد میں قحط اور طاعون وغیرہ سے ہلاک ہوسکتے ہیں تو یقیناً ان میں سے کچھ برطانوی گولیوں سے مرنے کیلئے تیار ہوسکتے ہیں۔ یہی وہ سبق ہے جو گاندھی جی ہم کو سکھانا چاہتے تھے اور یہی وہ سبق ہے جو ہم کو اب سیکھ لینا چاہئے ..... اصل میں جو سوال ہم کو سب سے زیادہ پریشان کررہا ہے وہ ہندو مسلم سوال ہے لیکن اس کی حقیقت کچھ نہیں، فی الحقیقت ہندو مسلم مشکلات، قومی مشکلات کی مانند خود تمہاری پیدا کردہ ہیں .....
خدائے برتر کے حکم کے سامنے میں اول مسلمان ہوں دوم مسلمان ہوں اور آخر

مسلمان ہوں ۔۔۔۔۔ لیکن جن امور کا ہندوستان سے تعلق ہے، ہندوستان کی آزادی سے تعلق ہے، ہندوستان کی فلاح و بہبود سے تعلق ہے میں اول ہندوستانی ہوں دوم ہندوستانی ہوں اور آخر میں ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی کے سوا کچھ نہیں ۔۔۔۔۔ آج جس مقصد کے لئے میں یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اپنے وطن کو صرف اس صورت میں جانا چاہتا ہوں کہ ارمغانِ آزادی میرے ہاتھ میں ہو ورنہ میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا اور اس کے بجائے ایک غیر ملک میں مرنا پسند کروں گا بشرطیکہ وہ آزاد ملک ہو، پس اگر ہندوستان میں تم ہمیں آزادی نہ دو گے تو یہاں میرے لئے ایک قبر کی جگہ تمہیں دینی پڑیگی۔"

یہ آواز ہندوستان کے شیر دل رہنما، جنگ آزادی کے سر بکف مجاہد، بے خوف صحافی، قادر الکلام شاعر اور شعلہ بیان خطیب مولانا محمد علی جوہر کی تھی ۔ اس آواز میں ہندوستان کے تینتیس کروڑ دلوں کی دھڑکن شامل تھی۔ محمد علی اپنے قول کی صداقت کا ثبوت دیتے ہوئے ۴؍ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں ایک شہید کی رشکِ خلق موت سے ہم آغوش ہو گئے۔

مولانا محمد علی آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے۔ لندن کے دوران قیام میں برطانوی سامراج کی حکمتِ عملی اور انگریزوں کی ذہنیت کے غائر مطالعے اور مشاہدے نے ان پر بہت سے رازہائے سربستہ منکشف کر دیئے تھے اور ان کے دل میں برطانوی استعماریت کے خلاف شدید جذبۂ نفرت جاگزیں ہو گیا تھا۔ لندن سے واپسی کے بعد چند سال بڑودہ اور بعض دوسری ریاستوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے لیکن اس طائر لاہوتی کا ذوقِ پرواز قفسِ زریں کے بجائے پہنائے فلک کا متلاشی تھا، محمد علی ملازمت کو خیرباد کہہ کے میدانِ

صحافت میں ایک باکمال شہسوار کی شان سے داخل ہوگئے۔ ۱۹۱۱ء انھوں نے اپنا شہرۂ آفاق انگریزی اخبار "کامریڈ" جاری کیا اور ایک محب وطن اردو اخبار کی ضرورت کے پیش نظر ۱۹۱۳ء میں "ہمدرد" کا اجرا کیا۔ مولانا محمد علی ایک مسلم الثبوت صحافی اور خوش فکر شاعر تھے لیکن وہ بنیادی طور پر ایک صاحب فکر سیاستداں تھے ان کی صحافت اور شاعری ان کے سیاسی افکار و نظریات کی آئینہ دار تھیں، مولانا کا مطمح نظر ہندوستان و مشرق وسطی بشمول ترکی سے انگریزوں جبر و استبداد کا استیصال اور ان کی انسانیت سوز حکمت عملی کا جنازہ نکالنا تھا۔

محمد علی کی شاعری روایتی شاعری یا قافیہ پیمائی نہیں ہے بلکہ معنی آفرینی اور حقیقت بیانی کا بہترین نمونہ ہے جو اس دور کے کوائف عالم، ہندوستان کی جدوجہد آزادی اور انگریزوں کے استبداد کی معتبر دستاویز ہے، اسی طرح ان کی صحافت بھی ان کے بقول پیسہ کمانے کیلئے نہیں بلکہ ملک و ملت کی خدمت کرنے کے لئے تھی۔ صحافت کے میدان میں محمد علی کی منفرد حیثیت تھی ان کی صحافت کا طرۂ امتیاز بے خوفی، صاف گوئی، حق نوازی اور باطل شکنی تھی، وہ اپنی تحریروں میں اپنے دل کی تڑپ، اپنے اشکہائے نیم شبی اور اپنی آہ سحرگاہی کو سمو دیتے تھے، صحافت میں ان کی راست گوئی اور بے خوفی رنگ لائی، کامریڈ میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون کے ذریعہ ترکوں کو انگریزوں کے خلاف برسرپیکار رہنے کی ترغیب دینے کے الزام میں علی برادران کو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک قید فرنگ کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اور کامریڈ و ہمدرد کی ضمانت ضبط ہوئی۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں قید فرنگ سے رہائی کے بعد علی برادران نے سرگرم عملی سیاست

میں قدم رکھا اور کانگریس کے اجلاس منعقدۂ امرتسر میں شرکت کی، اس وقت ملک جذبۂ آزادی کے نازک ترین دور سے گزر رہا تھا، انگریز پہلی عالمی جنگ میں کامیاب و کامران ہونے پر سرشار تھے، ہندوستانیوں پران کی نگاہ شرربار اور تیز ہوگئی تھی، ملک میں بیداری کی ہر کوشش کو وہ سختی سے کچلنے لگے تھے لیکن مولانا محمد علی کی خطر پسند طبیعت کو وہی فضا سازگار ثابت ہوئی، محمد علی کی تحریک و ترغیب سے ملک کے طول و عرض میں مسلمان کانگریس میں شامل ہونے لگے اس سے پہلے کانگریس میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی برطانوی سامراج کی بیخ کنی کے لئے محمد علی اپنی پوری قوتِ عمل کے ساتھ سرگرم تھے۔ تحریکِ خلافت محمد علی کی فکر و نظر کی مرہونِ منت ہے جس نے جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کیا ہے، مولانا نے اپنی مجاہدانہ تگ و دو سے ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں خلافت کمیٹی کی شاخوں کا جال بچھا دیا اور ملک کے طول و عرض میں سرفروشوں کی ایک ایسی فوج تیار کردی جو طبلِ جنگ کے لئے گوش برآواز تھی، مولانا محمد علی کی سرکردگی میں تحریکِ خلافت کے پرجوش مجاہدین نے صحیح وقت پر اپنی کمک سے کانگریس اور آزادی کو طاقت بخشی اور ان میں تیزی اور سرگرمی پیدا کرکے آزادی کی منزل کو قریب تر کر دیا۔

خلافت کمیٹی اور کانگریس کے باہم مشورے اور تعاون سے ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون یا ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی، مہاتما گاندھی اور علی برادران نے ایک ساتھ پورے ملک کا دورہ کیا ملک بھر میں جنگِ آزادی کے شعلے بھڑکنے لگے جس کی تمازت قصرِ بکنگھم کی دیواروں کو پگھلانے لگی، محمد علی ایک شعلہ نوا مقرر تھے ان کی تقاریر نے ملک میں بیداریٔ عمل کی فضا پیدا کردی محمد علی کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی سیاست کا رخ اس طرح موڑ دیا کہ وہ انگریزوں کے خلاف الگ محاذِ جنگ

پر لڑنے کے بجائے برادران وطن کے ساتھ مل کر میدان میں آگئے اور اپنی سرفروشی وجانبازی کی داستانوں سے تاریخ ہند کو روشن کر گئے، ان کا دوسرا عظیم کارنامہ کانگریس کو ایک عظیم قومی جماعت کی حیثیت سے آگے بڑھانا ہے۔

ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کو برطانوی فوج کی ملازمت سے روکنے کے الزام میں ۱۹۲۱ء میں محمد علی دو سال کے لئے دوبارہ آہنی سلاخوں کے پیچھے بھیج دئے گئے، ان کی گرفتاری کے موقع پر مولانا آزاد نے لکھا تھا "ان کی گرفتاری میں ہمارے لئے کوئی غم نہیں ہے البتہ ان کی (علی برادران) عزت پر رشک! اور ان کے اور اپنے مقصد کے لئے پہلے سے زیادہ مستعدی ہونی چاہئے، ۱۹۱۵ء میں ان کی نظر بندی کے ۹ ماہ بعد مجھے نظر بند ہونا پڑا تھا اور میں نے اس وقت حسرت سے کہا تھا کہ اس راہ میں وہ مجھ سے بازی لے گئے، آج بھی ہم افسوس کرنے کی جگہ سچی مبارکباد دیں گے اور کہیں گے کہ وہ ہم سب سے بازی لے گئے"

۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی کانگریس کے کوکناڈا اجلاس کے صدر منتخب کئے گئے ان کے دور صدارت میں پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس کے جنرل سکریٹری تھے ان کے بارے میں نہرو جی اپنی آپ بیتی "میری کہانی" میں رقم طراز ہیں "ان کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی بہت شدید ہوا کرتی تھیں اور میں خوش قسمتی سے ان لوگوں میں تھا جنھیں وہ پسند کرتے تھے، ہم میں الفت و محبت کے تعلقات تھے اور ہم ایک دوسرے کی بہت قدر کرتے تھے....... (میں) ان کی غیر معمولی سرگرمی، زبردست قوت عمل اور انتہائی ذکاوت کا دلدادہ تھا..... ہندوستان کی آزادی کے وہ دل سے شیدائی تھے" نہرو جی کی اس تحریر سے مولانا محمد علی کی قدر آور

شخصیت، بے پناہ صلاحیت اور ملک کی سیاست میں ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

محمد علی کے مزاج میں فکر و عمل کا خوش گوار امتزاج تھا، وسعتِ مطالعہ غور و فکر اور مشاہدات و تجربات نے ان کی ذات کو انسان دوستی، احترام مذاہب اور ہر نوع کی عصبیت سے گریز کی صفاتِ جمیلہ سے مزین کر دیا تھا، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان انگریز سامراج کی تعمیر کردہ دیوار کو انھوں نے اپنی ضربِ کاری سے مسمار کر دیا تھا اور چشم عالم نے نظارہ کر لیا کہ محمد علی کے دورِ رہنمائی میں ہندو اور مسلمانوں کے مابین اخوت، محبت اور تعاون کی جو فضا قائم ہو گئی تھی تاریخ میں اس کی مثال ملنی محال ہے اور جس کے دیکھنے کو آج بھی آنکھیں ترس رہی ہیں محمد علی ہندوستان کے ان رہنماؤں میں تھے جنھوں نے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو تمام مسائل پر ترجیح دی اور اپنی جانفشانی سے اسے کامیاب کر کے دکھا دیا، محمد علی نے آزادئ وطن کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا وہ اسی کے لئے زندہ رہے اور مرے بھی اسی کے لئے، ان کی وفاکیشی خلوص کار اور جاں سپاری نے انھیں حیاتِ جاوداں بخش دی۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم

مولانا محمد علیؒ

ولادت تو آمدزاد ہوتی ہے۔ لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی! عام طور پر موت اپنا شکار خود منتخب کرتی ہے۔ محمد علی نے خود موت کا انتخاب کیا! اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی زندگی اور موت دونوں کو ایک برگزیدہ حقیقت بنا دیا ـــــ ارفع وارجمند!

محمد علی کی زندگی اور موت دونوں ان کی انفرادی اور شخصی افتادِ طبع کی جلوہ گری تھی! شخصیت کی اسی جلوہ گری کا نام آرٹ بھی ہے ـــــ نایاب اور گرانمایہ!

محمد علی کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز تھے۔ کس کی زندگی میں نہیں ہوتے لیکن ان کی موت نے ہر نشیب کو فراز اور ہر فراز کو پُرشوکت بنا دیا۔

محمد علی کو بدتوفیقوں اور بدمذاقوں سے سابقہ پڑا، ایسے بدتوفیق اور بدمذاق جو بھوکے تھے، بوالہوس اور کینہ پرور بھی۔ محمد علی نے ان سب سے انتقام لیا لیکن اپنی زندگی میں نہیں بلکہ اپنی موت سے!

محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ تنگ ظرفوں کا خیال ہے۔ ہماری قومی زندگی میں آج کتنے دھارے بہہ رہے ہیں، کتنے چشمے اُبل رہے ہیں۔ کیسے کیسے عزائم بیدار اور کتنی روحیں دار و رسن کی طلبگار ہیں! یہ کس کا فیضان ہے۔ محمد علی نے ہمارے خون کو رگوں میں دوڑنا پھرنا ہی نہیں بتایا بلکہ مرحوم آج خود ہماری آنکھوں سے خون بن کر

چمک رہے ہیں۔ مردِ غازی کے کارناموں کا اندازہ مقبوضات کی وسعت، مالِ غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہما ہمی و طرب انگیزی، برگستواں کی زینت، تمغہ اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دہکتی ہوئی روح، اور دمکتے ہوئے چہرے ــــ ڈوبتے ہوئے سورج سے!

محمد علی کا قلب حزیں تھا لیکن روح تابندہ و تپاں ــــ بشارتِ ازلی بھی۔ حزیں یوں کہ جن کو وہ محبوب رکھتے تھے وہ بھی ان کے مخالف تھے کیسی مخالفت؟ اصولی نہیں بلکہ اکثر ذاتی مفاد، نفس پروری اور تن آسانی کے لیے۔ وہ ایک شیر کی مانند تھے جس کو شیروں سے نہیں، لومڑی اور بھیڑیوں سے سابقہ ہوا۔ بشارتِ ازلی اس لیے کہ شخصیت کامیاب رہی۔ شخص کا انجام ناقابلِ التفات، توفیقِ انسانی اور تقدیرِ الٰہی کبھی کبھی برگزیدہ افراد کی ناکامی میں بھی جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اسے ناکامی نہیں کامرانی بتایا گیا ہے۔

محمد علی کی ذہانت اور فطانت اب کہاں ملے گی۔ وہ تیغِ اصیل تھے جو رزم میں بے پناہ تھی اور بزم میں ایک جلوہ گری۔ وہ مخالفت کرتے تھے۔ ان کو پناہ دیتے تھے، ان کی دل دہی اور دل آسائی کرتے، ان کے مارنے مرنے پر تیار رہتے، محمد علی کی آغوش میں رحمت تھی۔ ان کی مدد لینے کے یہ معنی تھے کہ اب ساری ذمہ داری، ساری ظلاکت و ہلاکت محمد علی کی کامیابی یا شہرت مدد لینے والے کی!
وہ آغوشِ مادر، بازوئے برادر اور راحتِ عزیزاں تھے!

کس بلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے، بولتے تو معلوم ہوتا ابوالہول کی آواز اہرامِ مصر کا سے ٹکرا رہی ہے، لکھتے تو معلوم ہوتا کرپ کے کارخانے میں توپیں ڈھل رہی ہیں یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے! میں نے ان کو اسٹیج پر آتے اور بولتے ہوئے سنا ہے اور محمد علی کو داد دینے سے پہلے انیسؔ کو داد دی ہے۔ ع

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے!

اسٹیج پر محمد علی جس طرح جھومتے بل کھاتے پہنچتے، جس کڑک، تڑپ غریو اور غلبہ سے بولتے وہ بہتوں نے دیکھا ہوگا۔ وہ بولنے میں تلوار اور گرز دونوں سے کام لیتے۔ وہ حربے کا جواب صرف اپنی تقریر سے دے سکتے تھے۔

محمد علی پر دولت و شہرت کی بارش ہوئی، محمد علی نے ان دونوں کو سیلاب کی طرح بہا دیا۔ دونوں نے مفارقت کی۔ بدنامی اور مفلسی سے بھی سابقہ پڑا، لیکن یہ چیزیں جسم و جان کی تھیں۔ ان کی روح پاک تھی ــــــ ظاہر ــــــ کیا معلوم زندہ رہتے تو کیا ہوتا۔ بوریائے بوذرؓ اور سریر سلیماں کو یکساں سمجھنے والے کی موت آخر کیا شہادت دیتی ہے!

محمد علی کی موت کی خبر سنی تو تھوڑی دیر کے لئے یقین نہیں آیا، رہ رہ کر یہ خیال آتا رہا کہ محمد علی کو آخرت نے زیر کس طور پر کیا ــــــ خود موت پر کیا گزری ہوگی،

پھر سوچنے لگا کہ اگر محمد علی کی بجائے قضا و قدر یہ چارۂ کار پیش کرتے کہ محمد علی کی بجائے ہندوستان کے کسی اور مسلمان لیڈر کو حوالہ کرو۔ یہ سوال آتے ہی خدا جانے یہ فیصلہ دل میں کیسے آیا بہت جلد اور بڑی قطعیت کے ساتھ کہ محمد علی کے بدلے میں مسلم ہندوستان کا بڑے سے بڑا لیڈر دیا جا سکتا تھا اور اس کا ماتم نسبتاً کم ہوتا! لوگ آزردہ

نہ جانے انسان کے دل میں عجیب عجیب خیالات آتے رہتے ہیں۔ انھیں خیالات کو کبھی الہام قرار دیا جاتا ہے اور کبھی یہ مہمل بھی ہوتے ہیں لیکن ان کے عجیب ہونے کے معنی ہمیشہ مہمل ہونے کے تو نہیں ہیں۔ محمد علی میں مکرر بیانیاں بھی ہیں جن سے شعر کے لطف و بے ساختگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ملک وملت کی جنگ اب بھی جاری ہے لیکن نعرۂ جنگ خاموش ہے، فتح و شکست تو اسی لئے بنائے گئے ہیں کہ فتح و شکست ہوتی رہے۔ لیکن جنگ آزما کہاں ہے؟ شہادت کس کو نصیب ہوگی، ایسا حسینؓ کہاں جس کی خود یزید کو تلاش ہو!

آئیے جہاں کل فاتح بیت المقدس نے سر جھکایا تھا۔ وہاں آج محمد علی کی معراج منائیں!!

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد۔

عبدالمجید سالک مرحوم

علّامہ اقبال اور علی برادران

دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے مقام پر کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس قرار پائے۔ اس موقع پر گاندھی جی، تلک جی، مسز بیسنٹ، پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے بڑے بڑے رہنما کانگریس میں شریک ہوئے۔ پنڈت موتی لال نہرو نے صدارت کی، مسلم لیگ کا اجلاس منڈوہ کنہیا لال میں ہوا، حکیم اجمل خاں نے صدارت فرمائی۔ اس موقع پر مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی بھی بیتول سی۔ پی جیل سے رہا ہو کر آ پہنچے۔ علامہؒ اور مرزا جلال الدین نواب سر ذوالفقار علی خاں کی موٹر کار میں لاہور سے چل کر امرتسر کے ہنگاموں کو دیکھنے آئیں۔

وہاں پہنچ کر جب مسلم لیگ کے اجلاس میں داخل ہوئے اور علامہ اقبال علی برادران سے بغل گیر ہوئے، تو جلسے میں جوش و خروش کا عجیب عالم تھا اکثر لوگ اشکبار تھے علامہ نے دونوں بھائیوں کی طرف اشارہ کر کے یہ اشعار آبدار فرمائے جو اسی دن موٹر کے سفر میں موزوں ہو گئے تھے!

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند　　قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے　　مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر　　کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
کیں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

(ذکر اقبال سے)

مولانا محمد علی جوہر کی شاعری خود ان کی نظر میں

اقتباس از مکتوب مورخہ ۱۶ راگست ۱۹۱۶ء بمقام چھندواڑہ بحالت نظر بندی؛ بنام مولانا عبدالماجد دریابادی۔

آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں ذوق دامن کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رامپور میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمان سے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچازاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب اور ان کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق شامل تھے۔ گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا۔ پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے، جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی، ازراہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ مقرر کر دیا تھا تاکہ وظیفہ محض کار بے کاراں کی نذر نہ ہو۔ یہ میرے مکان کے عقب میں تھا اس لیے ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا اور مصرعہ سے تاریخ بھی نکلتی ہوں کہ سے

آیا دہلی سے ایک مشکی خر
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کی غزل یاد کیجئے سے

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا
خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا مجھے لے جاتے تھے۔ داغ نے پہلے دن پوچھا کچھ شعر بھی یاد ہیں؟ میری عمر بہت کم تھی مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کروائے تھے جنہیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے داغ ہی کے چند شعر انہیں سنائے۔ سن کر پھڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ سنئے، میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں، اسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔

میری پیدائش ۱۸۷۸ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو اور فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری official Biography (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے "میری امت" کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتشدان کی نذر کیا جائے یا سیرتِ پیشوائے قوم و ملک میں جگہ دی جائے۔ ہمدرد کے سنسر نے (جن کا چند ماہ کے بعد ہی انتقال یکایک ہو گیا) تو ہمدرد میں سے ایک بار چڑیا چڑے کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ بھائی یہ تو چڑیا چڑے کی کہانی اور مطلب بھی صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمدرد والوں سے ٹکر ہی لگتا ہے لندن والی کا معاملہ ہے نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو اور جواب دہی ہمارے سر آ پڑے۔ آپ نفسیات کے ماہر ہیں۔ کیا ممکن نہیں کہ میرا لکھنے والا سیرت نگار باوجود نقادِ فن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس لغو اور لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں اور آنے والی نسلیں ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر نکلیں اور ان اسرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئے نئے معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالا مال کر دیں [illegible] بہتر ہے کہ انہیں ابھی کر دوں۔ اور اس طرح

ہمیشہ کے لیے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سنیئے کہ گیارہ برس کی عمر میں علی گڑھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظہ کی تعریف کی کہ المامون منبر پسند کیا تھا اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اور ایک دن میں نے ابن یمین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا۔ حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے۔ مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے۔ پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی پھر اس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعۂ طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اسی وقت تیار ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر جو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی اور مولانا حکم ٹھہرے۔ انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا مگر ہماری لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم تین شعرائے باکمال نے حاجی محمد اسماعیل خاں صاحب (تربیت الدجاج اور یونین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی۔ ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب آنریبل و آنریری سکریٹری مسلم لیگ کے برادر اصغر۔ خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گزر گیا اور وہ مشاعرہ جسے بعد کو حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو ہوا کرتا تھا اور شمع پیش نہیں کی جاتی تھی کرکٹ کا لان ہی جائے مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودھویں کو بارش ہو گئی تو تین چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا۔

فرشِ زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں
لطفِ مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

علی گڑھ کالج میں شاعری تو کچھ کی مگر وہی فرضی عشق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور "سبزۂ خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا یہاں البتہ شاہدانِ اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوقِ نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم طبیعت کا میلان خلافِ دستورِ عام زہد و ورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس کسی اور کے خیال نے۔ مگر یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا، اور محض حالاتِ گرد و پیش اس کے محرک تھے۔ جب ان سب تجربوں کے بعد "کپڑے پھاڑے گھر کو آئے" تو تاہل کی زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل کر دیا۔ گذشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر رسمی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشقِ حقیقی رنگ لایا ہے اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنگ آئی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانے میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لیے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بنہایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکینِ قلب کا رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ بھیجو اس لیے یہ لکھے بھیجتا ہوں TOUCHSTONE کی معشوقہ سے زیادہ قابلِ قدر نہیں:

A POOR THING BUT MINE OWN

اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں — —

(غزلیں درج ہیں)۔ یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ بقول آپ کے "میری امت" ان سے کچھ تسکین پائے۔ بہرحال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق۔ یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لیے ہیں۔

---

(۱) خط خطوط مشاہیر مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی میں موجود ہے)

رشید حسن خاں
ڈاکٹر، ادبیات دہلی یونیورسٹی دہلی

جوہر کی شاعری

ملک کی تقسیم سے پہلے کا زمانہ تھا جب آئے دن سیاسی جلسے ہوتے رہتے تھے جن میں بڑی جوشیلی تقریریں کی جاتی تھیں، میں نے ایسے ہی جلسوں میں سب سے پہلے محمد علی جوہر مرحوم کے شعر سُنے تھے۔ شاہ جہاں پور میں اس زمانے میں سب سے اچھے مقرر تھے۔ کریم الرضا خاں مرحوم علی گڑھ کے پرانے طالب علم وکالت کا امتحان بھی پاس کیا تھا لیکن مزاج قلندرانہ پایا تھا بلکہ یوں کہوں کہ صحیح معنی میں پٹھان تھے اس لیے وکالت کا حق کیا ادا ہوتا۔ کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں تھی، زمینداری موجود تھی۔ بہت اچھے مقرر تھے اور اپنے مزاج اور اس زمانے کی عام سیاسی صورتِ حال کے مطابق بڑی جذباتی تقریریں کیا کرتے تھے۔ اقبالؔ، انیسؔ اور مولانا شبلی کے سیکڑوں شعر یاد تھے اور تقریر میں اشعار کی مرصّع کاری کے فن سے اچھی طرح واقف تھے محفل کو گرمانے اور جذبات کو بھڑکانے کے لیے مناسب اور برمحل شعر اس طرح پڑھتے تھے کہ سُننے والوں کے چہروں پر جذباتیت کی آتشیں روشنی پھیل جایا کرتی تھی۔ مسلم سیاست اس زمانے میں جذباتی خیال آرائی اور پرشور نعروں کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی۔ [اور اس زمانے کی قید کیوں لگا ئیں سے پہلے بھی یہی احوال تھا۔ پوری خلافت تحریک اسی اندازِ فکر کا مجموعہ تھی

جذباتیت اور محض جذباتیت اور آج بھی وہی (حال ہے) مجھے آج تک یاد ہے کہ ایک سیاسی جلسے میں رنگ محفل دیکھکر انھوں نے جب یہ شعر پڑھے۔

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

اور آخری مصرع پڑھتے وقت جس طرح ڈرامائی انداز پیدا کیا تھا اور آواز جس طرح بجلی کی عدوں کو چھونے لگی تھی اس کے اثر سے لوگ جذبات سے سرشار ہو کر نعرے لگانے لگے تھے۔ جلسے کے بعد کئی دن تک یہ اشعار لوگوں کی زبان پر رہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ شعر رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کے ہیں۔ اسی طرح ایک اور جلسے میں جب انھوں نے اپنے خاص انداز میں جوہر کا یہ شعر پڑھا۔

یہ نور خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا
کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ تو بھی بجھا دے

تو لوگ جھومنے لگے تھے۔

اس زمانے میں ہم لوگوں کے نزدیک سیاست کا مطلب تھا جذباتی تقریریں اور پرشور نعرے، اس لیے ایسے اشعار خاص طور پر پسند آیا کرتے تھے جو عوام پسند سیاسی تقریروں کی طرح دلوں کو گرما سکتے ہوں۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر "ہم لوگوں کے نزدیک بہت بڑے شاعر تھے ہاں ضمنی طور پر یہ بھی عرض کر دوں کہ" مولانا شوکت علی" کا بس نام سن لیا کرتے تھے۔ اُن کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ البتہ مولانا محمد علی"

کا نام احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا اور اُن کو قومی مجاہد اور شہید کا درجہ دیا تھا
دن گزرتے گئے صورت حال بدلتی رہی اور پھر وہ زمانہ آیا جب پچھلی
بہت سی باتیں پوری طرح بدلی ہوئی نظر آئیں۔ پسند اور ناپسند کا انداز بھی
بدلا اور اب جوہر کی شاعری کے متعلق وہ انتہاپسندانہ رائے بھی بدل گئی
۱۹۶۲ء میں پاکستان سے جوہر کا مکمل مجموعۂ کلام شائع ہوا اور اس کے
مطالعے کے بعد صحیح صورتِ حال سامنے آئی۔

جن لوگوں نے جوہر کے سوانح کا ... مطالعہ کیا ہے اُن کو اچھی
طرح یہ بات معلوم ہوگی کہ وہ بے حد جذباتی رہنما تھے۔ جلدی غصے میں
آجانے والے بہت مشتعل طبیعت پائی تھی۔ انھوں نے اُن کے مزاج کو اس صبر و
ضبط اور تحمل سے علاقہ ہی نہیں تھا جس کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ سیاسی زندگی
میں وہ کھرے اور سچے تھے، قومی درد سے اس کا دل لبریز تھا۔ وہ انگریزوں کے دشمن
تھے۔ ان سے نفرت کرتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ سارے ہندوستانی اور مسلمان خاص
طور پر انگریز سے نفرت کریں۔ وہ ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے، یہ سب کچھ اپنی جگہ
پر مگر فکر اور تحمل اور لمبی مدت کے لیے سیاسی منصوبہ بندی سے اُن کی طبیعت کو اور
ان کے مزاج کو دور کی نسبت تھی۔ [اور کامیاب قومی رہنما میں ان صفات اور خصوصیات
کا پایا جانا لازم ہے۔ ان کے بغیر آدمی مخلص تو رہتا ہے۔ قوم کی رہنمائی کامیابی کے
ساتھ نہیں کرتا اور اپنے پیچھے چلنے والوں کو معاشرے کا فعال اور قابلِ ذکر حصہ
نہیں بنا پاتا۔ مسلم سیاست کی یہ کمزوری شروع سے ہی رہی ہے اور آج تک برقرار
ہے] آخر میں مذہبیت ان کے مزاج پر بے طرح غالب آگئی تھی۔ اور اس طرح اُن کی
جذباتی طبیعت کو شدت پسندی کا ایک اور سہارا مل گیا تھا۔ شاعر کو شدتِ
جذبات بہت راس آتی ہے مگر اعلا شاعری کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ

فکر کا وہ توازن بھی شریک کار ہو جس کی مدد سے جذبے کو اظہار کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ اس کے بغیر نری جذباتیت اور مطلق صداقت۔ دونوں کا حال سیلاب کے اس پانی جیسا ہوگا جو بہت جلد اتر جایا کرتا ہے۔ جوہر کے یہاں جذبے کی شدت اور صداقت دونوں موجود تھیں۔ وہ جو کچھ زبان سے کہتے تھے وہی اُن کے دل میں ہوتا تھا؛ مگر شعری اظہار کے لیے جس ضبط و نظم کی ضرورت ہے اس کی کمی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض شعر تو آج بھی شعلوں کی حرارت سے معمور محسوس ہوتے ہیں، مگر اُن کی شاعری کا زیادہ حصہ ایسا ہے جو آج پہلے کی طرح متاثر نہیں کر پاتا۔ حالات بدلنے کے ساتھ ایسے اشعار کا آب و رنگ بھی بدل گیا۔ جذبہ سچا ہے اور احساس شدید ہے۔ مگر بیان کا ایسا پیرایہ نہیں مل پایا ہے جو جذبے اور احساس کو محفوظ رکھ سکے اور دیرپا بنا سکے۔

جوہر کے بہت سے خطوط چھپ چکے ہیں۔ ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ یہ خط ان کے مزاج کی سیمابیت اور طبیعت کی اشتعال پذیری کی بہت اچھی طرح ترجمانی کرتے ہیں لیکن خاص بات یہ ہے کہ ٹھہراؤ اور ارتکاز مفقود ہے۔ لمبے لمبے خط ہیں جن میں جن میں تلخ و تند جملے ہیں غصے کا اُبال ہے۔ کھری کھری سنانے کا شدید جذبہ ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر فکر اور اظہار کی زیریں لہریں نہیں پائی جاتیں۔ خیالات میں بکھراؤ ہے۔ غور و فکر اور ضبط و تحمل کی مدد سے جس طرح مفہوم و مدعا کو ضروری قطع و برید کے بعد مناسب لفظوں میں ادا کیا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے مفہوم میں بکھراؤ نہیں آپاتا اور تحریر منتشر خیالی سے محفوظ رہا کرتی ہے، وہ بات نہیں پائی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے قاری کو اس طرح متاثر نہیں کر پاتے جس طرح خط کو متاثر کرنا چاہیے۔ خط کا ہے کو ہیں تقریریں ہیں اور تقریریں بھی عطاء اللہ شاہ بخاری کی ــــ ان کی شاعری بھی ان

اثرات سے پوری طرح محفوظ نہیں رہ سکی ۔ اس لیے وہاں بھی ارتکاز کا وہ عالم نہیں جو اعلا غزلیہ شاعری کے لیے از بس ضروری ہے ۔ جس طرح وہ خط لکھتے چلے گئے ہیں اسی طرح بہت سی غزلیں کہتے چلے گئے ہیں ۔ احساس کی شدّت ۔ جذبے کی صداقت اور غزل کی روایت اور اس کے مانوس انداز بیان کے واسطے سے ایسے کچھ شعر بھی نکل گئے ہیں جن پر اُس بکھراؤ اور رواں دواں ہلکے پن کی پرچھائیں نہیں پڑ سکی ۔ ایسے اشعار بھی پڑھے جاسکتے ہیں اور اُن سے لطف اٹھایا جاسکتا ہے مگر ان کی تعداد کم ہے ۔

جوہر زمانۂ طالب علمی ہی سے شعر کہنے لگے اس زمانے کے اشعار اس پر گواہی دیتے ہیں کہ فطرت نے شعر کہنے کا سلیقہ ودیعت کیا تھا ۔ غزل کے عام مضامین ہیں مگر بندش کی چستی اور بیان کی قدرت اشعار سے نمایاں ہے یہ شعر اسی زمانے کا ہے

مجھے انکار وصلِ غیر پر کیونکر نہ شک گزرے
زباں کچھ اور بوئے پیرہن کچھ اور کہتی ہے

ایک غزل ۱۸۹۷ء کی ہے یعنی علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی کی ۔ اس کا یہ شعر ۔

خوش قسمتی کے آگے جھکایا نہ سر کبھی
اس خانماں خراب کو کتنا غرور تھا

شاعر کی طبیعت میں دبے اور چھپے ہوئے جذبۂ سرکشی کی جھلک دکھا رہا ہے مختصر یہ کہ وہ شروع ہی سے غزل کے انداز و اسلوب سے آشنا تھے ۔ اور بیان کا چستی و پرکاری اُن کے اشعار کا جوہر ہوا کرتی تھی ۔ یہ صورت حال آخر تک اس طرح برقرار رہی کہ جہاں جہاں بے محابا طرزِ گفتگو ۔ اور غیر متوازن جوش و خروش کا اثر غالب نہیں آیا ہے ۔ وہاں وہاں شعری حسن

برقرار رہا ہے مثلاً ان اشعار سے اُن کے اسی سنبھلے ہوئے طرز کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

آئی نہ ہو زنداں میں خبر موسمِ گُل کی
سُنتا تو ذرا، شورِ عنادل تو نہیں ہے!

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خُم کے خُم بھرے ہیں مے سے اور مے خانہ خالی ہے

نہ سہی تیغ، تجلی تو ہی سہی
آنکھ جھپکے نہ تماشائی کی

مجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

جنسِ گراں تو تھی نہیں کوئی، مگر یہاں
لائے ہیں ہم بھی رونقِ بازار دیکھ کر

اور کس وضع کی جویا ہیں عروسانِ بہشت
ہیں کفن سُرخ شہیدوں کا سنورنا ہے یہی

جس نے ہنگامہ عدالت کا ترے دیکھا ہے
اُس گنہگار کو اک روزِ جزا اور سہی

اشعار کا ایک حصہ وہ ہے جہاں جذبے کی تڑپ کچھ زیادہ نمایاں ہے ایسے اشعار شدتِ احساس کی براہِ راست و بے کم و کاست ترجمانی کرتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ آج بھی ان میں وہ شدت و حرارت ایک حد تک محفوظ ہے جو دلوں پر اثر انداز ہوا کرتی ہے۔ جوشِ بیان اور زورِ کلام ان اشعار کے ایک ایک مصرعے سے چھلکا پڑتا ہے۔ جس زمانے میں یہ کہے گئے تھے اس زمانے میں

حالات کی ہنگامہ آفرینی اور کہنے والے کی صداقت بیانی نے ایسے اشعار کو زبان زدِ خاص و عام کر دیا تھا لوگ پڑھتے تھے اور وجد کرتے تھے۔ تغزل کے ذرا سنبھلے ہوئے انداز کے مقابلے میں ایسے اشعار میں عام لوگوں کو متاثر کرنے کی زیادہ اور بہت زیادہ صلاحیت تھی۔ ان کی اپیل کا دائرہ وسیع اور بہت وسیع تھا۔ ہمدرد اور کامریڈ کے لیے لکھے گئے محمد علی جوہر کے پُرجوش سیاسی مضامین کی طرح سیاسی اور قومی حوادث کے ترجمان اُن کے اشعار بھی جوش و خروش سے لبریز ہوا کرتے تھے اور قبول عام کی سند پاتے تھے۔ لوگ پڑھتے تھے اور وجد کرتے تھے۔ مثلاً

دورِ حیات آئے گا قاتل! قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری، تری انتہا کے بعد
قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا
اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی

۱۔ یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

۲۔ اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم
معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے

۳۔ اب ہوا ہے ماسوا کا پردہ فاش
معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے

فیض ہے تیرے ہی اے قید فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے دیکھے
عالم میں آج دھوم ہے رنج حسین کی
سن لی خدا نے قیدی گوشہ نشین کی

بلاخوف تردید اور شائبۂ شک یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو میں احتجاجی اور انقلابی ادب کا اگر کوئی تذکرہ مرتب کیا جائے گا تو اس میں جوہر کے ایسے کلام کا ایک حصہ ضرور شامل ہوگا۔ اردو شاعری کو سیاسی اور قومی مسائل کی ترجمانی کا وسیلہ جن لوگوں نے بنایا ان میں محمد علی جوہر کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ گویا شاعری کے دائرے کی توسیع تھی۔ اس شاعری کی اپنی اہمیت اور قیمت ہوتی ہے۔ یہ واقعہ اپنی جگہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے کہ جوہر اور ظفر علی خاں جیسے شاعروں نے شاعری کے دائرے کو وسعت عطا کی۔ آج اس سرمائے کی وہ حیثیت برقرار نہ رہی ہو مگر اس شاعری نے جو رول ادا کیا اس کی تاریخی اہمیت ہے اور جس طرح زبان اور شاعری کو طاقت ور عناصر سے معمور کیا اور اسے حالات کا آئینہ خانہ بنایا۔ اس سے شاعری کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا۔ عصری حقائق کے بیان سے شاعری اگر یکسر محروم رہے تو پھر وہ خیالات کا برف خانہ بن کر رہ جائے گی۔ عصری حقائق اور سیاسی جد و جہد کا بیان اور جد و جہد کے تحت روز مرہ کے اہم واقعات کا بیان اعلا ادبی حیثیت خواہ نہ رکھتا ہو اور خواہ کچھ دنوں کے بعد اس کی چمک دمک ماند پڑ جائے یا کم ہو جائے۔ مگر اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ عصری حقائق، سیاسی جد و جہد اور مقامی تحریکوں کی پرجوش ترجمانی، زبان اور شاعری دونوں کو طاقت اور صلابت کے نہایت ضروری عناصر سے معمور کرتی

رہتی ہے۔ اس پُر جوش ترجمانی کے بغیر اُس زبان اور اُس شاعری میں انفعالیت اور مجہولیت کا عمل دخل بڑھ جائے گا، اور اس کا احوال اُس لکھنوی تہذیب جیسا ہو کر رہ جائے گا، جس میں کلاسیکیت کا آب و رنگ، تراش خراش اور رکھ رکھاؤ کی صناعی تو بہت تھی مگر وہ ان طاقتور عناصر سے محروم تھی جن کو زیادہ تراش خراش راس نہیں آتی اور جن کے بغیر سماجی زندگی میں یک پن پیدا ہو جایا کرتا ہے۔

جوہر کی شاعری کا سرمایہ غزلیں ہیں۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بلند آہنگی پائی جاتی ہے جو شاعر کے مزاج کا تقاضا تھا۔ یہ ٹھیک ہے، کہ آج اُن کی غزلوں میں عمدہ اور منتخب اشعار کم نظر آتے ہیں مگر اس کے مقابلہ میں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اُن کی غزل گوئی نے اُردو غزل گوئی کو آہنگِ بلند اور جوشِ بیان سے معمور کیا، اور اس طرح غزل کے اس انداز و اسلوب کے دائرے کو وسعت بخشی اور اس روایت کو آگے بڑھایا۔ یہ واضح کر دیا جائے کہ ان کے یہاں لہجے کی جو جھنکار اور آہنگ کی جو بلندی ہے وہ محض انداز بیان کا کرشمہ نہیں اور نہ صرف لفظوں کا کھیل ہے، جذبے کی شدت نے اس آہنگ اور جھنکار کو پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاثیر کی حرارت کسی نہ کسی حد تک اشعار میں محفوظ رہ گئی ہے۔

اس بات کی ایک اور طرح بھی وضاحت کی جاسکتی ہے کہ یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ محمد علی کے سیاسی نصب العین سے آج اختلاف کیا جائے (اور یہ اختلاف بے جا بھی نہیں ہوگا۔) اور ان کی جذباتیت پر آج گرفت کی جائے (اور یہ گرفت بھی بے محل نہیں ہوگی) مگر اس نہایت اہم پہلو سے کون انکار کر سکتا ہے کہ

انھوں نے عام ہندوستانیوں، خاص کر مسلمانوں کو انگریزوں سے نفرت کرنے کی تلقین کی تھی اور اپنی تحریر و تقریر کو اس کے لیے وقف کر دیا تھا۔ خلافت تحریک کے متعلق آج اور جو کچھ بھی کہا جائے مگر اس بات سے کوئی بھی صاحب نظر انکار نہیں کر سکتا کہ اس تحریک کے واسطے سے انھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں انگریز کے خلاف بے پناہ نفرت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اس تحریک کا یہ پہلو بہت اہمیت رکھتا ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ اس زمانے میں مسلم معاشرے پر قدامت پسندی کے پہرے بیٹھے ہوئے تھے۔ زمینداروں، جاگیرداروں، نوابوں اور تعلقہ داروں کے ہاتھوں میں لیڈرشپ آگئی تھی اور سرسید تحریک کے اثرات بھی کم نہیں ہو پائے تھے اور مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے میں اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو ان اثرات سے پوری طرح متاثر تھے۔

اسی طرح اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ گاندھی جی کو مسلمانوں سے قریب تر لانے میں محمد علی جوہر کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ کہنا یہ ہے کہ ان کی سیاسی جد و جہد پر آج کتنی ہی بحث کی جائے۔ مگر اُن کے یہ پہلو ساری بحث کے باوجود تاریخی اہمیت سے محروم نہیں ہو جائیں گے اسی طرح ان کی شاعری کے متعلق آج جو بھی رائے قائم کی جائے مگر اس ادبی اور تاریخی اہمیت سے کوئی ذمے دار شخص انکار نہیں کر سکتا کہ انھوں نے اردو کی غزلیہ شاعری میں جوش بیان اور صداقت جذبات کے طاقتور عناصر کا اضافہ کیا اور اس طرح غزل کے لہجے کو نئی بلند آہنگی سے روشناس کیا۔ اس کے مزاج کو تب و تاب سے محروم نہیں ہونے دیا اور اور عصری حقائق کی ترجمانی کا وسیلہ بنا کر اس کی وسعت اور تہہ داری کو زیادہ نمایاں کیا اور اس طرح مجموعی طور پر اُردو شاعری میں بے رحم صداقتوں اور کھردری حقیقتوں کے لیے مزید جگہ پیدا کی۔

محمد علی جوہر باغی کا ذہن اور قلندر کا مزاج لے کر اس دنیا میں آئے

تھے۔ ایسے لوگ اس ضبط و نظم سے قطعی طور پر محروم ہوتے ہیں جو مصلحت پسند طبیعتوں کا خاصّہ ہوا کرتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ سیاست ہو یا ادب، دونوں میں اپنے اپنے انداز سے مصلحت بینی اور مآل اندیشی کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے۔ یہاں سوال صحیح اور غلط ہونے کا نہیں۔ سوال ہے ضرورت اور تقاضے کا۔ مگر یہ بات بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے کہ زندگی اگر قلندری سے یکسر خالی ہو جائے تو پھر وہ کاروبارِ بقالی کے مرادف بن کر رہ جائے گا۔ زندگی کو ضرورت رہتی ہے مختلف عناصر کی اور رہے گی۔ اور ایسے مصلحت بیزار، بے ہمہ خام اور روایت شکن لوگ زندگی اور ادب کے لیے وہ عناصر فراہم کرتے رہتے ہیں جن کی مدد سے ان دونوں میں توازن برقرار رہتا ہے سچائی کی حرارت سے اُن کی زندگی کو مدد ملتی ہے۔ اور رواں دواں عصری حقائق سے ان کا رشتہ ٹوٹنے نہیں پاتا ـــــ ایسے لوگ حال کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور اپنے مزاج کے تقاضوں کے زیرِ اثر مستقبل سے بڑی حد تک بے نیاز رہتے ہیں۔ طویل عرصہ کی منصوبہ بندی ان کے مزاج سے میل ہی نہیں کھاتی۔ قومی اور سیاسی زندگی کو اس کی ضرورت ہوتی ہے تو ہوا کرے۔ اس کے باوجود سیاست ہو یا ادب، ہر میدان میں اُن کے کارنامے اپنے خاص دائرے میں آب و تاب سے محروم نہیں ہو پائیں گے اور مستقبل احترام کے ساتھ ان کا نام لینے پر ہمیشہ مجبور رہے گا۔ یہ لوگ زندگی بھر نافرمانی اور جدّ و جہد کے شعلے بھڑکاتے رہے اور اس طرح اپنے زمانے میں قومی مزاج کو مشتعل کرتے رہے۔ اس لحاظ سے اور اس خاص (لیکن محدود) دائرے کے اندر ان کا درجہ ان لوگوں سے یقیناً بلند ہے۔ جو درمیانہ روی کے قائل تھے۔ جوہر نے ایک مقطعے میں اسی بات کو غزل کے انداز میں اس طرح کہا ہے۔

بے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر ــ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

خواجہ حسن نظامی مرحوم

مولانا محمد علی اور صحافت

اخبار نویسی میں ان کی نظر بہت بلند تھی، ورنہ اردو کے ایک روزانہ اخبار کے لیے انھوں نے جو شاہانہ اہتمام رکھا تھا وہ اردو اخباروں کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا ان کی شاہانہ طبیعت کے سبب بہت سے بیکار لوگ بھی ان کے آس پاس جمع ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے ان کو روزگار دینے کے لیے اخبار کا دفتر وائسرائے کے دفتر سے مشابہ بنا دیا تھا۔ "ہمدرد" جاری ہوا اور خرچ آمدنی سے بہت بڑھ گیا اور ناواقف لوگوں کی بھیڑ سے کام نہ چلا اور شکایتیں بڑھنے لگیں تو مرحوم نے مجھے بلایا، کیونکہ میں ان کے قریب ملا واحدی صاحب کے مکان میں رہتا تھا اور اسی جگہ میرا دفتر تھا۔

میں واحدی صاحب کو لے کر ان کے مکان پر گیا اور مرحوم نے مجھے اور واحدی صاحب کو سارا دفتر دکھایا اور مشکلات کو بیان کیا۔ میں نے اور واحدی صاحب نے کہا کہ یہ مشکلات ایک گھنٹے میں دور ہو سکتی ہیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان سب فضول آدمیوں کو علیحدہ کر دیجیے انتظامی عملے میں دو تین آدمی کافی ہیں۔ ان بیسیوں کی کیا ضرورت ہے؟ مرحوم نے ہنس کر کہا کہ آپ تجارتی رائے دیتے ہیں اور میں یہ کام تجارت کے لیے نہیں کرتا بلکہ قومی خدمت کے لیے کرتا ہوں۔ میں نے کہا لیکن جب تک اخبار کا نظم درست نہ ہو تو قومی خدمت کیا ہو سکے گی۔ مرحوم نے کہا میں نے ہر کام ایک ایک آدمی کے سپرد کر دیا ہے اور ہر ایک کام کا اس کو ذمہ دار بنا دیا ہے، لہٰذا اس عملے میں سے ایک آدمی بھی کم نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا کہ ان میں سے ایک آدمی بھی ذمہ داری سے واقف نہیں ہے اور کسی کو بھی جواب دہی کا خوف نہیں ہے۔ جانتے ہیں، آپ کو غصہ آئے گا، آپ ناراض ہوں گے گردن جھکا کر آپ کی ناراضگی سن لیں گے، کیونکہ تھوڑی دیر کے بعد آپ کی شاہانہ شان ان کو معاف کر دے گی اور ان کی پرورش کا جذبہ آپ کو مغلوب کر لے گا۔ (تلخیص)

قاضی عبدالغفار مرحوم

مولانا محمد علی بہ حیثیت صحافی

میرا پہلا اداریہ "ہمدرد" کی پہلی جلد کے آٹھویں پرچے میں ۱۰ر جون کو شائع ہوا تھا لیکن میں بتاؤں کہ وہ کیسے لکھا، کس طرح لکھا گیا تھا تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ فن صحافت میں محمد علی کے شاگرد کس طرح تربیت حاصل کرتے تھے۔ دس بارہ کتابیں مجھے دی گئی تھیں تاکہ میں ان سب کو پڑھ لوں کچھ نوٹ محمد علی نے لکھوائے تھے، آٹھ دس دن تک میں لکھنے کی تیاری کرتا رہا پھر جب ایک حصہ لکھ لیا تو مسودہ ان کے پاس لایا مجھے یہ یاد ہے کہ چند ہی سطریں پڑھنے کے بعد انہوں نے منہ بنایا اور یہ کہہ کر مسودہ پھینک دیا کہ "یہ کیا فضولیات گھسیٹ کر لائے ہو؟"

میں کیا کہوں کہ اس دن ایک خام کار نوجوان کی کس قدر دل شکنی ہوئی جس کو اپنے خیال میں بڑا ناز تھا اس بات پر کہ وہ "ہمدرد" کے ادارتی شعبہ جات میں اپنی خواہش کے اصرار پر شریک کیا گیا حالانکہ عمر اور تجربے میں وہ محمد علی کے تمام دوسرے شاگردوں سے کم نہیں تھا مگر چیف ایڈیٹر کی رائے میں اس کے پہلے ہی مضمون کا مسودہ فضولیات قرار پایا تو ظاہر ہے کہ اس نوجوان کی خود بینی کو جس قدر بھی صدمہ پہنچا ہو وہ کم ہے۔ بڑی ذلت اور شرمندگی محسوس ہوئی کچھ غصہ بھی آیا مگر اتنی جرأت نہ تھی کہ اس غصے کا ذرا بھی اظہار کیا جاتا۔ پھر ایک گھنٹے تک ان کا لکچر پیا، پھر بہت کوشش کر کے ان کے خیالات کے مطابق تازہ سرا مضمون لکھا پھر بھی وہ ناپسند ہوا مگر اتنا زیادہ نہیں جتنا کہ پہلی دفعہ۔ ہدایت ہوئی کہ ایک دفعہ پھر لکھو، رات بھر بیٹھ کر پھر لکھا اور صبح کو پیش کیا تب دوبارہ مضمون پڑھ کر گلے سے لگا لیا۔

تعریفوں کے پل باندھ گئے۔ پہلے جس قدر ان کی تنقید سے شرمندہ ہوا تھا اب اپنی تعریف سے شرمندہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس تنقید کی تلخی میں شہد اور دودھ کی نہریں بھی بہا کرتی ہیں۔ ہفتوں میرے ان مضامین کی تعریف ہوتی رہی، چنانچہ حوصلہ بڑھا اور خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ اب ان کی بات سمجھ میں آنے لگی۔ ان کا سا حافظہ یا ان کی سی ذہانت تو نصیب نہ ہوئی تھی اس لیے بلامبالغہ سینکڑوں اور ہزاروں کتابیں اس طرح پڑھی پڑی ہیں کہ پنسل اور نوٹ بک پاس رکھی ہے، کام کی باتیں نوٹ کرتا جاتا ہوں، ہر مسئلے کے متعلق حاصل کردہ معلومات کو ایک علیحدہ فائل میں محفوظ کر دیتا ہوں اور ضرورت کے وقت ان سے کام لیتا ہوں۔ مضمون لکھتا ہوں تو زیادہ کوشش اس بات کی کرتا ہوں کہ وہ معلومات سے پُر ہو اور معلومات بھی ایسی جو صحیح ہوں۔ خود محمد علی کو جب مضمون لکھنا ہوتا تھا تو وہ راتوں کو اس طرح جاگتے تھے کہ ان کے بستر پر کتابوں، اخباروں، رسالوں اور تراشوں کا ایک انبار ہوتا تھا اور سرخ پنسل ہاتھ میں ہوتی تھی۔ ان تیاریوں کے بعد وہ لکھنے بیٹھتے تھے تو اپنی طرز نگارش کے ساتھ اپنی بیش بہا معلومات اور دلائل کی قوت میں اضافہ کرتے تھے۔ ان کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ ہر مسئلے کی تفصیلات پر گہری نظر ڈالتے تھے اور بعض اوقات تو میں سمجھتا تھا کہ وہ بال کی کھال نکال رہے ہیں لیکن بعد کو معلوم ہوتا تھا کہ نہیں، چھوٹی چھوٹی تفصیلات ہی سے بڑے بڑے دلائل مستحکم کیے جاتے ہیں۔

(تلخیص)

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم

مولانا محمد علی مرحوم

ہندوستان جدید میں جو انگریزی تعلیم اور مغربی خیالات کا مولود ہے، مولانا محمد علی مرحوم عجیب و غریب شخص ہوئے ہیں۔ وہ مختلف متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی موجود ہے۔

وہ انگریزی کا بہت بڑا ادیب، زبردست انشا پرداز اور اعلیٰ درجے کا مقرر تھا، لیکن جب لکھنے اور بولنے پر آجاتا تھا تو اعتدال اور تناسب دونوں نظروں سے اوجھل ہوجاتے تھے اور انمول جواہر پاروں کے ساتھ کنکر اور روڑے بھی بے تکلف چلے آتے تھے۔ وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا، لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہوجاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اس کے جاں نثار اور فدائی تھے، لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔ وہ اپنے رفیقوں اور ہمکاروں کے ساتھ بڑی شفقت اور عنایت سے پیش آتا تھا اور طرح طرح کے سلوک کرتا تھا لیکن جب بگڑتا تو آپے سے باہر ہوجاتا تھا، اس وقت اسے نہ کسی کی عزت آبرو کا خیال رہتا تھا نہ اپنے کام کا۔ اسی لیے وہ اپنے ہم کاروں سے نباہ نہ سکا اور وہ لوگ جنھیں وہ چن چن کر لایا تھا آخر کار ایک ایک کر کے الگ ہوگئے۔ یوں تو ایک مدت تک وہ مذہب سے

بھگا نہ سکا۔ جب ادھر جھکا تو ایسا کہ بڑے بڑے جگادھری مولوی اور کٹر ملا بھی اس کے سامنے ہیچ تھے۔ وہ جب کبھی کسی کام کو اٹھاتا تو بڑی شان و شکوہ سے اٹھاتا اور بڑی بڑی تیاریاں کرتا تھا لیکن تکمیل کو پہنچانا اس کی طبیعت میں ہی نہ تھا کامریڈ کس شان سے نکلا قدر بھی اس کی وہ ہوئی جو شاید ہی کسی اخبار کی ہوئی ہو، اپنے پرائے سب اسے سر آنکھوں پر رکھتے تھے لیکن جو اس کا حشر ہوا۔ وہ بھی معلوم ہے۔ مسلم نیشنل یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی بنیاد جس زور و شور اور شد و مد کے ساتھ ڈالی گئی۔ اس کا حیرت انگیز منظر اب تک ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ اس وقت قومیت اور آزادی کی کھولن انتہائی نقطے تک پہنچ گئی تھی۔ اسی ہفتے جب یونیورسٹی کے نصاب تعلیم و نظم و نسق پر غور کرنے کے لیے ان کے رفقار کی کمیٹی ہوئی ہے تو وہ سماں ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ "مجذوب کی بڑ" بولتے اور سنتے آتے تھے لیکن اس روز اپنے کانوں سنی اور بڑی عبرت ہوئی۔ ان کے بعض سنجیدہ اور صاحب نظر رفیق جو اس مجلس میں شریک تھے ششدر و حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے اور بے بسی کے ساتھ ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے۔ وہ اس وقت اس خیال میں مست تھے (اور انھیں اس کا پورا یقین تھا) کہ کوئی دن جاتا ہے کہ ہندوستان ان کے قدموں کے تلے ہوگا اور اس کے حکومت کی باگ ان کے قوی ہاتھوں میں ہوگی۔ اس خیال سے ان کا اور ان سے زیادہ ان کے برادر بزرگ کا دماغ بہک سا گیا تھا اور جو بات اس وقت ان کے منہ سے نکلتی تھی اس میں ایک عجیب مستانہ ادا اور بے تکا پن ہوتا تھا۔ خلافت کا ذکر جتنا کم کیا جائے بہتر ہے۔ اس کا غلغلہ صور اسرافیل کی طرح ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گیا اور وضیع و شریف عالم و عامی ہندو اور مسلمان سب ہی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی وجہ سے حمیت و جوش قومی کی لہر سارے ملک میں پھیل گئی تھی۔ لیکن جو انجام ہوا وہ بھی سب کو معلوم ہے اب یہ ایک اسم بے مسمیٰ سانپ نکل گیا۔ مگر ہم ابھی تک لکیر پیٹے جا رہے ہیں۔ محمد علی مرحوم اس شخصیت اور قابلیت کے آدمی تھے کہ وہ اپنے کاموں کے لئے گھر

بیٹھے ہزاروں لاکھوں روپے جمع کر سکتے تھے۔ لیکن وہ اس بے دردی، بے پروائی اور غیر ذمہ دارانہ طور پر اسے صرف کرتے تھے کہ ان کے کام بھی برباد ہو جاتے تھے اور خود بھی قلاش ہو جاتے تھے۔ ہم میں (خاص کر یوپی والوں اور خصوصاً مسلمانوں میں) اب تک زمیندار کی شان قائم ہے جو بادشاہوں کی شان کی نقل ہے ہم انتظام کرنا اور اعتدال کو ملحوظ رکھنا بالکل نہیں جانتے ہم صرف ایک ہی بات جانتے ہیں لوٹنا اور لٹانا۔

محمد علی مرحوم ہر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھا اس کے رفقا اور اس کے ہم عصر اس کے سامنے بونے تھے مگر افسوس اسے اپنے اوپر قابو نہ تھا اور یہی اس کی ناکامی کی اصل تھی۔ اس کے ایک دوست جو اسے بچپن سے جانتے تھے اور جنھوں نے زندگی کی ہر منزل میں اسے دیکھا اور اس کا ساتھ دیا تھا فرماتے تھے کہ محمد علی کو لیڈری نے تباہ کیا۔ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ وہ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ لیڈری کے قابل تھا بشرطیکہ اسے اپنے نفس پر قابو ہوتا۔ وہ جس طرح بیماری میں پرہیز پر قابو نہیں رکھتا تھا اسی طرح ہر معاملے میں جوش کے وقت اپنے اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر اور اُن کے متعلقین

(روزنامہ زمیندار کے آئینے میں)

[زعمائے قوم اور رہنمایانِ حُریت نے قیدِ فرنگ میں جو صعوبتیں برداشت کیں وہ ہماری جد و جہد آزادی کی تاریخ کا ایک باب بن چکی ہیں۔ اس زمانے کے اُردو اخبارات میں لاہور کا روزنامۂ زمیندار غالباً تنہا اخبار تھا جس میں زعمائے قوم کی سرگرمیوں کا تفصیل سے ذکر کیا جاتا تھا۔ اس اخبار پر حکومت کا عتاب نازل ہوتا رہتا تھا۔ اس کے ادارۂ تحریر کے اراکین ایک کے بعد ایک گرفتار ہوتے جاتے تھے مگر اس کی حق گوئی اور بے باکی کو کوئی قید نہیں کر سکا۔

یہاں مولانا محمد علی جوہر، اُن کے رفقا اور متعلقین کے بارے میں بعض خبروں کے اقتباسات شایع کیے جا رہے ہیں جنھیں روزنامۂ "زمیندار" کے ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء کے شماروں سے اخذ کیا گیا ہے خبروں کی سرخیوں میں کہیں کہیں حذف و اضافے سے کام لیا گیا ہے۔

محمود الٰہی]

کراچی جیل میں مہذب حکومت کے کارنامے

علی برادران اور اُن کے رفقا سے کراچی کے قید خانے میں جو ناجائز و ناروا برتاؤ کیا جارہا ہے اس کے متعلق حسب ذیل قابل وثوق اطلاع موصول ہوئی ہے :-

مولانا شوکت علی ، ڈاکٹر کچلو اور پیر غلام مجدد کو ۲۰ جنوری کی شام سے اور مولانا محمد علی جوہر کو ۳۱ جنوری کی شام سے علاحدہ علاحدہ کوٹھریوں میں بند کردیا گیا ہے۔ دن کے وقت انھیں بستر کی قسم سے کوئی چیز رکھنے کی اجازت نہیں ہے اس لیے انھیں تمام دن یا تو زمین پر کھڑا رہنا پڑتا ہے یا زمین ہی پر بیٹھنا پڑتا ہے. جو اکثر نم ہوتی ہے اور سرد تو ہمیشہ ہی ہوتی رہتی ہے۔

قید تنہائی کے اول شب میں مولانا محمد علی کو نیند نہ آسکی ۔ ڈھائی بجے کے بعد انھیں سخت سردی معلوم ہوئی کیونکہ ایک کمبل اور ایک چادر بھی چھین لی گئی تھی ... قیدیوں کو عموماً دو کمبل دیے جاتے ہیں اور اگر ڈاکٹر مشورہ دے تو ایک کمبل اور دے دیا جاتا ہے لیکن قید خانے کے کمبل کافی گرم نہیں ہوتے

. . . . مولانا محمد علی کو سرد زمین کی سردی سے نجات حاصل کرنے کے لیے صرف دو کمبل دیے گئے ہیں وہ تمام دن ٹہل کر یا کھڑے رہ کر گزار دیتے ہیں اور محض چند لمحوں کے لیے بیٹھتے ہیں کیوں کہ زمین ایسی سرد اور نم رہتی ہے کہ اس پر بیٹھنا غیر ممکن ہے ۔

——— ۱۲ فروری سنہ ۱۹۲۲ء)

کراچی جیل میں حشر انگیزیاں

کراچی جیل میں قیدیوں کی ہڑتال کے متعلق حسب ذیل کوائف ایک باوثوق ذریعے سے موصول ہوئے ہیں۔

مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر کچلو اور دیگر اسیران محترم کو قید تنہائی کی سزا دی گئی اور ان سے ذلت آمیز سلوک کیا گیا۔ کراچی جیل کے قیدیوں نے اپنے رہنماؤں سے اس سلوک پر برافروختہ ہو کر، فروری کو صبح ساڑھے سات بجے کام بند کر دیا۔ اللہ اکبر، مہاتما گاندھی کی جے، مولانا محمد علی کی جے، مولانا شوکت علی کی جے اور قومی نعرے فضائے آسمانی میں گونجنے لگے۔ ادھر تو کراچی جیل کے قیدیوں نے رہنمایان ملک و ملت سے اظہار عقیدت کے لیے یہ طرز عمل اختیار کیا۔ ادھر دفتری حکومت کے ملازموں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جیل میں گجر بجنے لگا گھڑیال نے حکام جیل کو دعوت عمل دی سب بھاگتے دوڑتے پہنچے اور مشورہ کرنے لگے، قرار پایا کہ قیدیوں کو کھانا نہ دیا جائے۔ پانی سے بھی محروم رکھا جائے۔ بھوکے پیاسے رہیں گے ہیں گے خود درست ہو جائیں گے۔

داروغۂ جیل نے قیدیوں سے کہا کہ اگر وہ قسم کھائیں، کلمہ پڑھیں اور یقین دلائیں کہ کام کرنا شروع کر دیں گے تو انھیں کھانا دیا جائے گا لیکن قیدیوں نے جواب دیا کہ اطاعت قبول کرنے سے بھوکوں مرجانا بہتر ہے۔

رہنمایان محترم کو خیال تھا کہ داروغہ صاحب قیدیوں کو بھوکا ماریں گے اس لیے انھوں نے داروغہ کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ قیدیوں کو کھانے

کے لیے کچھ دیا گیا یا نہیں لیکن دارو غہ صاحب نے صاف جواب دے دیا اور کہہ دیا کہ میں تو کچھ نہیں بتاؤں گا کہ دیا گیا کہ نہیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رہنمایانِ محترم کو صبح کا کھانا ترک کرنا پڑا ۔ کیونکہ جب تک انھیں اس بات کا اطمینان نہ ہو جاتا کہ باقی قیدیوں کو کھانا ملا ہے یا نہیں وہ کھانا کھانا نہیں چاہتے تھے ۔

وہ تو مسٹر لوکس سپرنٹنڈنٹ جیل کی معیت میں جیل خانہ کا ڈاکٹر حسب معمول آٹھویں دن گشت کرنے آ گیا کہ رہنمایانِ محترم نے پہلی مرتبہ مسٹر لوکس کو دیکھا انھوں نے اس سے بھی وہی سوال کیا جو مسٹر ڈمری سے کیا تھا سپرنٹنڈنٹ نے مولانا محمد علی سے کہا کہ میں نے تمام قیدیوں کو کھانا دیا ہے لیکن بعض نے خود بخود کھانا کھانے سے انکار کر دیا ہے جب مولانا محمد علی نے یہ بات سنی تو آپ نے فرمایا کہ قیدیوں سے کہہ دیجئے کہ ہم سب کھانا کھا لیں گے اور ہماری خواہش ہے کہ سب قیدی کھانا کھا لیں شاید یہ بات سنکر ہی قیدی کھانا کھا لیں ۔ مسٹر لوکس نے یہ بات مان لی اور کہا کہ میں داروغہ کے ہاتھ کھانا بھیجتا ہوں اور یہ پیغام ہڑتال کرنے والوں کے پاس پہنچا دیتا ہوں ۔ داروغہ صاحب تو نہیں پھٹکے البتہ کھانا پہنچ گیا ۔ ایک حولدار اس دوران گفتگو میں موجود تھا ۔ اس نے رہنمایانِ محترم کا پیغام قیدیوں تک پہنچا دیا لیکن اس پر یقین کون کرتا ؟ یہ تو قدرتی بات تھی کہ حولدار کی بات تسلیم نہ کی جاتی ۔

آخر حکام جیل نے رہنمایان محترم سے استدعا کی کہ کوئی نشانی بھیجئے چنانچہ مولانا محمد علی اور حضرت پیر غلام مجدد کے قرآن شریف کے جزدان قیدیوں کے اطمینان کے لیے بھیجے گئے ، اس کے بعد رہنمایان محترم کو یقین

دلایا گیا کہ تین بارکوں کے قیدیوں کے سوا جن کی تعداد ڈیڑھ سو ہے باقی سب نے کھانا کھا لیا ہے۔ چنانچہ پانچ بجے مولانا محمد علی اور دیگر رہنمایان محترم نے کھانا کھایا۔

(۱۷ فروری ۱۹۲۲ء)

اسیرانِ محترم کی زیارت کا مطالبہ

کراچی ۱۰ فروری۔ آج ساڑھے بارہ بجے دس اور پندرہ ہزار کے درمیان آدمی کراچی جیل کے باہر جمع ہو گئے اور جیل سے سولجر بازار تک کی سڑک پر صف باندھ لی کیونکہ یہ غلط افواہ پھیل گئی تھی کہ جیل میں کشت و خون ہو گیا ہے چنانچہ انبوہ عوام نے مطالبہ کیا کہ علی برادران۔ ڈاکٹر کچلو کی صورتیں انہیں دکھائی جائیں۔ علی برادران اور ڈاکٹر کچلو دریچہ کے پاس لائے گئے جو جیل کے دروازے کے اوپر سے مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے (انسپکٹر جنرل محابس کی طرف اشارہ کر کے) کہا کہ اب ہم جیل میں بالکل خوش و خرم ہیں۔ اور ہم سب سے وعدہ کیا گیا ہے کہ عمدہ غذا دی جائے گی اور کتابیں بھی پڑھنے کو ملا کریں گی۔ ہمیں اپنے دیگر تین رفقا کا حال معلوم نہیں۔ یہ تینوں نہایت بشاش نظر آتے تھے اس کے بعد لوگوں کا جم غفیر وہاں سے مطمئن ہو کر چلا گیا۔

(۱۳ فروری ۱۹۲۲ء)

علی برادران کے متعلق خبریں شایع کرنے کے بے شمار الزام

ہفتۂ سابقہ میں کراچی کے کئی قوم پرست حضرات کی گرفتاریاں عمل میں آئی ہیں ان محترم اسیروں پر حسب ذیل الزامات لگائے لگائے گئے ہیں۔

ان لوگوں نے عامۃ الناس کو اشتعال دلانے کے لیے اس قسم کی خبریں مشتہر کیں کہ علی برادران اور ان کے رفقاء کے ساتھ کراچی جیل میں تشدد آمیز سلوک کیا جاتا ہے کئی اخبارات میں تار بھیجے جن میں بالتفصیل علی برادران کے ساتھ بدسلوکی کے حالات لکھے گئے ..... تین فروری کو ایک شخص شہر میں منادی کرتا پھرا کہ مسلمان قیدیوں نے مقاطعہ جوعی کر رکھا ہے اور انھیں بزور ... کیا جاتا ہے ......

(۲۲ فروری سنہ ۱۹۲۲ء)

صبحِ محشر

(زمیندار کا اداریہ)

ہم کس طرح اپنے دل کے خون چکاں ٹکڑوں کو دنیا کے سامنے رکھدیں کہ ایک ایک آنکھ میں اشک ہائے غم کے دریا موجزن ہو جائیں۔ ہم کس طرح اپنے زخم ہائے جگر کے ٹانکے کھول دیں کہ ایک ایک قلب جذباتِ درد و الم کے طوفانوں سے معمور ہو جائے۔ ہم کس طرح اپنے سینے کو چیر کر اس کے داغوں کی قیامت خیز بہار کو وقفِ تماشا کر دیں کہ ایک ایک زبان آہ و فغاں کی شورشوں کا محشرستان بن جائے ...... ظلم و جور کے شیطانوں کی زنجیریں اتار دی گئیں۔ غضب و انتقام کا جہنم بھڑک اٹھا اور ستم و تعدی کا سمندر سخت سے سخت تلاطم پر اتر آیا۔ محبس کراچی کی مظلوم زندانی انسانی ابتلا و آزمائش کی کٹھن منزلوں میں پہنچ گئے...

.... وہ مقدس بندے وہ پاک انسان، وہ آزادی کے فرشتے، وہ حریت کے قدوس، وہ ایمان کے نورانی چشمے۔ وہ حق و صداقت کے مواج آج اس سرزمین کے ایک گوشے میں کائناتِ انسانی کے انتہائی مصائب و مظالم برداشت کر رہے ہیں۔ قیامت خیز دکھ اور درد سہتے ہیں۔ پھر کیا اس کوہستان میں کوئی حساس قلب ہے جو تڑپے؟ کوئی بینا آنکھ ہے جس سے خون کے دریا بہیں۔ اور کوئی گویا زبان ہے جو نالہ سنجی و فغاں پاشی کے لیے مضطرب ہو؟

وہ واقعۂ ہائلہ کی اشاعت کو آج تیسرا دن ہے لیکن دنیا اسی طرح

سرگزشتۂ سکون و آرام ہے جس طرح کہ اس سے پہلے تھی۔ ... کیا مولانا شوکت علی اور ان کے رفقائے نامدار کا پنج روزہ فاقہ ان کے گرد روں شکم سیروں نے نہیں سنا جنھیں ایک گھنٹے کی تاخیر و تعویق سے غذا ملے تو تلملا اٹھتے ہیں؟ کیا مولانا محمد علی کے وہ روح فرسا مصائب اور جگر پاش آلام ان بندگان راحت و آسائش کے کانوں تک نہیں پہنچے جن کے جسموں پر اس قسم کی باتوں کے تصور سے بھی لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

حکومت کے پاس جنرل ڈائر اور سر او ڈوائر جیسے سنگ دل جلادوں کے لیے گرانقدر وظائف ہیں جنھوں نے اس سرزمین کے ایک غیر مسلح اور بے گناہ مجمع کو خاک و خون میں تڑپایا لیکن کراچی کی مقدس جماعت جماعت کے لیے موزوں قوت لا یموت کا سامان نہیں ہے۔ حکومت ولی عہد سلطنت کے استقبال کی غرض سے لاکھوں روپے بلا تامل منظور کر سکتی ہے۔ لیکن حریت کے سرتاج مولانا محمد علی کے حجرے میں ایک دیے کا انتظام نہیں کر سکتی۔ اللہ اللہ ع۔

رنگ یہ بھی دیکھنے تھے گردش ایام میں

حکومت ذلیل چوروں اور ڈاکوؤں کو دعدہ معافی دے کر ان پر ان پر اعتماد کر سکتی ہے لیکن جن پاک ہستیوں کا وجود ہی دنیا میں حق و صداقت کی روشنی اور راستی و راست گفتاری کا نور ہو انھیں برہنہ کر کے تلاشی لیے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتی۔ ع۔

مدارِ روزگارِ ظلم پہ ور را تماشا کن

ہم جانتے ہیں کہ جیل خانے راحت کدے نہیں ہیں .... اور نہ ہمارے مقدس مظلوموں نے راحت کدوں کی طلب و جستجو میں جیل خانہ

قبول کیا.... لیکن جیل خانوں کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وقت کے عظیم ترین انسانوں کو ایسی ذلیل غذائیں دی جائیں جنھیں بے نوا و گرسنہ فقیر بھی کھانا پسند نہ کرے یا انھیں یا انھیں ایسی جاں سوز تلاشیوں پر مجبور کیا جائے جنھیں ایک ایمان و اخلاق سے قطعاً بے بہرہ انسان صورت حیوان نفرت و حقارت سے دیکھے۔

پرستاران حق پر مصائب و نوازل کا ہجوم کوئی نئی بات نہیں۔ اس شہادت گاہ تو ایک ایک ذرہ اپنے اندر قیامت کے سامان چھپائے ہوئے ہے اور مصائب و نوازل تو اس بازار کی سب سے عام اور قدیم ترین جنس ہے۔ سقراط کو زہر کا جام پینا پڑا، بنی اسرائیل کے ایک مقدس پیغمبر کو کانٹوں کا تاج پہنایا گیا۔ اس کائنات کے بزرگ ترین انسان نے جس کا وجود اقدس ہدایت و سعادت عالم کی آخری اور اکمل بخشش و نعمت تھا، شعب ابو طالب میں ایک مدت بحالت مجبوری بسر کر دی اور طائف کی سرزمین میں پتھر کھائے۔ حضرت سید الشہدا علیہ السلام نے اعزا و اقارب کی ایک نہایت ہی مختصر سی جماعت کے ساتھ کامل بے سروسامانی کی حالت میں ۱۰ محرم کی ایک تپتی ہوئی دوپہر کے وقت کربلا کے میدان میں شہادت کبریٰ کی خلعت خونیں حاصل کی۔ آج بھی اس بزرگ قافلے کے چند متبعین اپنے اللہ کے نام، اس کے دین کی حرمت، اس کی شریعت کی عزت، اس کی نیابت کی بقا اور اس کے ناموس کی حفاظت کے خاطر کراچی جیل میں فاقہ کش اور مورد آلام و مصائب گوناگوں ہیں...

ہم یہ بھی بتلا دینا چاہتے ہیں کہ حکومت خود اس وقت کو کھینچ کھینچ کر قریب لا رہی ہے جس میں حق و باطل اور خیر و شر کا آخری فیصلہ ہوگا۔ اور

وہ خاموش آگ التہاب و اشتعال کے تمام اسباب و عوامل اپنے اندر جمع کر چکی ہے جس کی قیامت خیز لپیٹ نہیں معلوم کس کس کے رخت ہستی کو اپنے شورش احتراق کی تماشا گاہ بنائے گی۔

بہ لوح مشہد پروانہ ایں رقم دیدم
کہ آتشے کہ مرا سوخت خویش را ہم سوخت

(۷ر فروری ۱۹۲۲ء)

مولانا محمد علی بیجاپور جیل میں

بمبئی۔ ۲۰ر فروری۔ مولانا محمد علی کراچی جیل سے منتقل کر دیے گئے آج وہ بیجاپور میں پہنچ گئے ہیں۔

(۲۴ر فروری ۱۹۲۲ء)

ام الاحرار کا دورہ

بمبئی ۱۹ر جنوری۔ ام الاحرار خدمات قومی میں اس طرح مصروف ہیں کہ اعلان کردہ دورہ کے مطابق کہیں تشریف نہیں لے جا سکیں، ۲۰ر جنوری کے دن بمبئی میں آپ کی موجودگی ازبس ضروری ہے۔ کیونکہ تمام ملک میں اسی دن انگورہ منایا جائے گا۔ آپ ۲۰ر جنوری کی شب کو ڈاکٹر سید محمود کی معیت میں بمبئی سے روانہ ہونگی اور ۲۲ر جنوری کو آگرہ پہنچیں گی۔ آپ کے دورہ کا نظام نامہ حسب ذیل ہے۔

۲۲ر جنوری آگرہ۔ ۲۳ر جنوری علی گڑھ ۲۴ر جنوری لکھنؤ۔ ۲۵ر جنوری

اعظم گڑھ۔ پھر آپ بانکی پور تشریف لے جائیں گی اور اس صوبہ کا دورہ کریں گی۔ دورہ کا انتظام ناظم مجلس خلافت صوبہ مرتب کرے گی۔ مراجعت پر آپ گورکھپور اور الہ آباد بھی قیام فرمائیں گی۔

(۱۹ر جنوری ۱۹۲۲ء)

فخر پنجاب آغا محمد صفدر خاں صاحب کی گرفتاری پر ام الاحرار کا مکتوب صفدر بیگم کے نام

عزیزہ! ——————

میں ۹ر تاریخ سے بمبئی میں مقیم ہوں، خلافت کے دفتر میں رہتی ہوں اور اس عمر میں جس قدر کوشش ہو سکتی ہے، کرتی ہوں۔ کیوں کہ اس وقت ہر مسلمان مرد عورت کا یہی فرض ہیں اور ذریعۂ نجات ہے۔ آج عزیزم صفدر کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی خدمات خدا وند عالم کی بارگاہ میں مقبول ہوئیں۔ میں اس زمانے کو بہار سے تعبیر کرتی ہوں۔ اس موسم کے میٹھے پھل کو وہی کھائے گا جو خوش نصیب جیل میں جائے گا۔

میں نے شوکت اور محمدؐ کی سزا کی خبر سنکر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی تھی تم بھی ہمت سے کام لینا اور ہمت نہ ہارنا۔ مسلمان کی شان یہی ہے کہ وہ ہر حالت میں راضی برضا رہے۔

بچوں کو پیار

تمہاری دعاگو —— آباد بانو

(۲۳ر دسمبر ۱۹۲۱ء)

بی اماں کے لیے کانگریس کی کرسئ صدارت

مرادآباد ۔ ۱۸ رجون ۔ جناب منظم علی نے بی اماں کی جانب سے حسب ذیل پیام برقی روانہ کیا ہے ۔

جناب راج گوپال اچاریہ، جناب جمنالال بزاز اور جناب ومیشی پانڈے نے آیندہ کانگریس کی صدارت کے لیے مجھے منتخب کرنا چاہا ہے ۔ یہ سب سے بڑی عزت ہے جو قوم اور ملک مجھے عطا کر سکتا ہے ۔ لیکن ایسے بڑھاپے کے عالم میں میرے لیے سخت دقت طلب امر ہے کہ میں کانگریس کی صدارت کے اہم فرائض باحسن الوجوہ انجام دوں ۔ میرا کام یہی ختم نہیں ہوجائے گا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے فرائض انجام دینے کے بعد مجھے مہلت ہے بلکہ برخلاف اس کے مجھے ہر ایک ماتحت مجلس اور ہر ایک مجلس عاملہ میں شریک ہونا پڑے گا مجھے سال بھر تک ہر جگہ کے جلسوں اور ہر مقام کی کانفرنسوں میں شرکت کرنی لابدی ہوگی ۔

لہذا مجھے افسوس ہے کہ باوجود تحریک میں نمایاں حصہ لینے کی آرزو اور ارمان کے " میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتی ہوں کہ آج کل صدارت کے فرائض انجام دے سکوں ۔ میرے لیے یہی بات کہ ازراہ مودت وعقیدت میرے عزیزان وطن نے صدارت کے لیے میرا نام پیش کیا ۔

میری ناچیز رائے یہ ہے کہ آل انڈیا کانگریس کی کرسئ صدارت مہاتما گاندھی اور دیگر وطن پرستوں کے لیے وقف کردی جائے ۔ اور اگر آیندہ سال یہ اصحاب آزاد ہوکر ہم میں نہیں آئے تو اس صورت میں کرسی صدارت خالی رکھی جائے اور انڈین نیشنل کانگریس کی کارروائی

کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک نائب صدر مقرر کر دیا جائے۔ میری رائے میں مسٹر سی آر داس سے بڑھ کر کوئی شخص نائب صدر بننے کا مستحق نہیں ہے۔ یہ میری آرزو ہے اور مجھے امید ہے کہ ملک اس کی تائید کرے گا۔

(۲۱ر جون ۱۹۲۲ء)

بیگم صاحبہ محمد علی کی سرگرمیاں

فراہمی سرمایہ انگورہ میں مصروف ہیں

بمبئی ۱۱ر جنوری۔ محترمہ بیگم صاحبہ محمد علی جناب زاہد علی خلف الرشید مولانا شوکت علی کی رفاقت میں بمبئی پہنچ گئی ہیں۔ اور اہلیہ حاجی محمد عباس بمبئی کے ساتھ فراہمی سرمایہ انگورہ کام شروع کر دیا ہے۔ نہایت یقین و اعتماد کے ساتھ یہ اُمید کی جاتی ہے کہ بمبئی کی کلمہ گو خواتین بیگم صاحبہ کی صدا پر لبیک کہیں گی اور شہر کے مختلف حلقوں میں خواتین کے جلسے منعقد ہوں گے۔ خواتین بمبئی کو موقع کی نزاکت و اہمیت کا اندازہ لگا کر بیدار ہونا چاہیئے۔ اور اسلام اور خلافت سے ارادت عقیدت اور محبت کا ثبوت دینا چاہیئے۔

(۲۵ر جنوری ۱۹۲۲ء)

بیگم صاحبہ محمد علی کا دورہ

بھڑاچ ۲۳ر فروری۔ بیگم صاحبہ محمد علی اور زاہد علی جو علاقہ گجرات میں دورہ کر رہے ہیں کل شام سورت سے یہاں تشریف لائے۔ ان کا تہ دل سے خیر مقدم کیا گیا۔ ایک مجمع عظیم استقبال کے لیے جمع ہو گیا۔ شہر میں جلوس نکالا

گیا۔ رضاکار قومی گیت گاتے ہوئے جلوس کے ہمراہ تھے۔ گلی کوچے اور بازار عمدہ طور پر آراستہ کیے گئے تھے معلوم ہوتا تھا کہ شہر میں پھر وہی روح پیدا ہو گئی۔ ہزارہا اشخاص جلوس کے ہمراہ تھے۔ خواتین کے اجتماع کا کئی مقامات پر خاص اہتمام کیا گیا تھا جہاں سینکڑوں ہندو مسلم خواتین جمع ہو گئیں۔ آپ کی آمد سے مسلمان خواتین میں خاص طور پر نئی روح پیدا ہو گئی ہے۔ آپ نے ایک مجمع کے سامنے تقریر کی جس میں پانچ چھ ہزار حاضرین شامل ہوئے۔ اور عدم تشدد، ہندو مسلم اتحاد اور قومی تعلیم پر زور دیا۔ زاہد علی نے حاضرین کے سامنے کانگریس کے مطالبات کی تشریح کی اور کہا کہ ان سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹنا چاہیئے۔

(۲۴ فروری ۱۹۲۲ء)

حسرت موہانی کے اخبار "مستقل" کے آئینے میں

مولانا حسرت موہانی کے "اردوئے معلیٰ" سے کون واقف نہیں نہیں ہے۔ انھوں نے "مستقل" نامی ایک سیاسی اخبار بھی کانپور سے نکالا تھا جو پہلے روزنامے کی شکل میں اور بعد میں سہ روزہ اور ہفتہ وار کی صورت میں شائع ہوا۔ جب علٰحدہ طور پر اس کی اشاعت کی صورت باقی نہیں رہ گئی تو حسرت موہانی نے اسے "اردوئے معلیٰ" کے ضمیمے کا درجہ دیدیا۔

یہ اخبار سیاسی تھا اس لئے اس کے اداریے اور خبریں زیادہ تر اسی موضوع سے متعلق ہوتی تھیں۔ اس میں کبھی کبھی مولانا محمد علی جوہر کی سرگرمیوں پر بھی اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ اب اس کے شمارے نایاب ہیں۔ موقع و محل کی مناسبت سے اس کا انتخاب پیش کیا جارہا ہے۔ "مستقل" کی فائلیں ہمیں آل انڈیا حسرت اکادمی، گورکھپور کے صدر جناب محمد حامد علی کی عنایات سے ملیں، ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

—— محمود الٰہی

مولانا محمد علی کی پریشانیاں

مولانا محمد علی کی عدم موجودگی میں بمقام سوری ان کی صاحبزادی کے انتقال کا حال معلوم کرکے ہم کو بہت افسوس ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

واقعی آج بقول اخبار خلافت مولانا محمد علی صاحب سے زیادہ پریشان شخص ملنا مشکل ہے۔ ملکی معاملات ہوں یا ذاتی دونوں میں انھیں الجھن اور دشواریوں سے سروکار ہے۔ ملکی معاملات کو لیجئے تو نہرو رپورٹ کی بدولت پرانے ساتھی اور رفقائے کار اغیار سے بڑھ کر دشمن ہو رہے ہیں۔ کلکتہ میں مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی انھیں گالیاں دیں اور یہ صبر کریں۔ الہ آباد اور دہلی میں دوسرے احباب قدیم حکومت پرستی کا ان پر الزام اور بہتان لگائیں اور یہ ضبط کریں، ڈاکٹر انصاری ایسا رفیق جدا ہو کر مخالف بن جائے اور ان سب پر مستزاد یہ کہ جس تحریک وطنی کی ترقی کے لئے انھوں نے طرح طرح کی مصیبتیں جھیلیں، اسی تحریک کو خود اپنے پرانے ساتھیوں کے ہاتھوں خراب ہوتے دیکھیں اور کچھ ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکیں!

ابنائے وطن کی ناقدری سے ہمدرد ایسا اخبار بند کرنا پڑا، اپنی علالت کے باعث اور اچھا نگران کار نہ ملنے کے سبب کامریڈ مرحوم کا از سر نو فاتحہ پڑھنا پڑا اسی خرابی کے باعث پریس کو بھی بند کر دینا لازمی ہوا، ظاہر ہے کہ یہی پریس ان کا آمدنی کا ذریعہ تھا، اس کی عدم موجودگی میں جو مالی پریشانی لاحق ہوگی اسے کچھ محمد علی ہی کا دل جانتا ہوگا۔ اب ان سب بالا اولاد کا صدمہ اور داغ جگر خدا معلوم مولانا آسی نے کس وقت اپنا مشہور شعر لکھا تھا جس کا اثر آج تک اہل

لو مین نہیں لینے دیتا ۔

آزمائش ہے نشانِ بندگانِ محترم!
جانچ ہوتی ہے اسی کی جس پہ ہوتا ہے کرم

خدا کرے مولانا محمد علی کی آزمائش اب ختم ہو چکی ہو اور اب خدائے پاک کا کرم شاملِ حال ہو۔

(۱۸ اگست ۱۹۲۹ء)

گلنار بیگم بنت مولانا محمد علی کے ساتھ
مسٹر شعیب قریشی کی نسبت

آج ہم خوش قسمتی سے اس قابل ہوئے ہیں کہ مسٹر شعیب قریشی کے احباب اور اپنے ناظرین کو یہ مژدۂ جانفزا سنا دیں کہ مسٹر شعیب شادی کرنے پر راضی ہو گئے ہیں اور آپ کی منگنی جناب رئیس الاحرار مولانا محمد علی صاحب کی چھوٹی صاحبزادی گلنار بیگم سلمہا سے ہو گئی ہے، شعیب ثانی مسٹر صدیقی کے انگلینڈ سے مراجعت کا انتظار ہے۔ توقع ہے کہ مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی اسی فروری میں لندن سے واپس تشریف لائیں گے اور اسی ماہ کے آخری ہفتہ یا مارچ کے اول ہفتہ میں اس مبارک تقریب کی تکمیل ہو جائے گی۔

(۱۸ جنوری ۱۹۳۰ء)

گول میز کانفرنس

از مولانا محمد شوکت علی

"...... ۴ر اکتوبر کے جہاز میں انشاء اللہ مولانا محمد علی سوار ہوں گے اور ان کی دیکھ بھال کے لئے بیگم محمد علی بھی ہمراہ ہوں گی، میں اور زاہد علی بحیثیت سکریٹری کے جائیں گے......"

(۲۳ر ستمبر ۱۹۳۰ء)

مکتوب مولانا محمد علی
(بنام)
مولانا عبد الماجد دریابادی

" (گول میز) کانفرنس کے روزانہ اجلاس میں نہ صرف ہندوؤں اور انگریزوں سے بلکہ سب سے زیادہ خود اپنے مسلمان بھائیوں سے ایک ایک لفظ پر جنگ کرنی پڑیگی ان تین محاذوں پر جنگ کرنے میں ہر وقت دل کی حرکت یکایک بند ہو جانے اور موت کا اندیشہ ہے ......"

(۱۰ر اکتوبر ۱۹۳۰ء)

رئیس الاحرار مولانا محمد علی کا سانحۂ ارتحال

(ہفتہ وار مستقل کانپور کا اداریہ)

دنیا کے بعض بڑے ادیبوں کے متعلق مصلحتِ الٰہی کا یہ کرشمہ دیکھا گیا ہے کہ عین اس وقت جبکہ اہل دنیا کو ان قائدین اعظم کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس ہوتی ہے اور ان کی موجودگی لازمی نظر آتی ہے، دفعتاً وہ ہستیاں ہماری نظروں سے روپوش ہو جاتی ہیں، مصر میں مصطفےٰ کامل کی وفات، ہندوستان میں لوک مانیہ تلک کے انتقال اور اب لندن میں مولانا محمد علی کے سانحۂ ارتحال میں ہم کو یہ بات مشترک معلوم ہوتی ہے کہ قدرت نے ان لیڈروں کو ان کے متبعین سے جدا کر کے جمہور کو اس بات کا سبق دیا کہ حصول مقصد کے لئے اتنے زبردست رہنماؤں کی زبردست شخصیتوں اور ان کے کارناموں پر بھروسہ کر کے مطمئن ہو جانے کے بجائے، اب ضرورت اس کی ہے کہ ہر شخص اپنی ذاتی ذمہ داری کو پہلے سے کئی گونہ زیادہ محسوس کرلے اور دل میں طے کرلے کہ جو کام ہمارے مرحوم لیڈر کو انجام دینا تھا، اب اس کی کامیابی زیادہ تر ہم سب کی ذاتی اور انفرادی جدوجہد پر منحصر ہے۔

مولانا محمد علی نے عین شب برات کے روز لندن کے ½ ۹ بجے صبح اور ہندوستان کے تقریباً تین بجے سہ پہر کے وقت اس عالم فانی سے عالم باودانی کی جانب رحلت فرمائی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا شوکت علی نے مرحوم کی نسبت بالکل صحیح کہا کہ میرا بھائی اسلام کا سپاہی تھا اور سپاہی کے لئے اس سے بہتر انجام اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس نے میدان جنگ میں لڑتے ہوئے اپنی جان دی!

مرحوم نے اپنی گول میز کانفرنس والی تقریر میں جو اعلان کیا تھا کہ اب میں آزادی حاصل کروں گا یا موت۔ نیز یہ کہ بلا حصول آزادی اب میں غلام کدۂ ہند کو واپس نہ جاؤں گا۔ اس اعلان کا پہلا جز تو ان کی وفات پر صحیح

ثابت ہو چکا تھا، اب اس خبر کے معلوم ہونے پر کہ ان کی تدفین بیت المقدس میں ہوگی، اس کا دوسرا جز بھی پورا ہوتا نظر آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور انھیں کی طرح ہم سب کا خاتمہ بخیر کرے۔

(۱۳ر جنوری ۱۹۳۱ء)

مولانا محمد علی کے مراسمِ تدفین کی تفصیل

دہلی ۱۳ر جنوری مولانا محمد علی کا جنازہ حکومت کے خرچ پر جہاز "ترکنڈ" میں ۱۹ر جنوری کو روانہ ہو کر ۲۱ر جنوری کو پورٹ سعید پر جہاز سے اتار کر بیت المقدس بھیجا جائے گا جہاں مسجدِ اقصیٰ میں آپ ۲۳ر کو دفن ہوں گے۔

(دوشنبہ، ۲۰ر جنوری ۱۹۳۱ء)

بیت المقدس میں
مولانا محمد علی کی تجہیز و تکفین

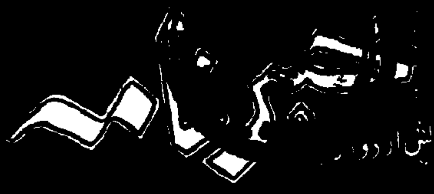
مولانا محمد علی مرحوم کا جنازہ ۲۱ر (جنوری) کو پورٹ سعید میں جہاز سے اترا اور ۲۲ر کی شام کو براہ قنطار بذریعہ ریل فلسطین روانہ ہوا، ۲۳ر کو بیت المقدس میں ہجومِ شہر کے ساتھ بہ سرکردگی مولانا شوکت علی جلوس نکلا اور اسی دن تدفین عمل میں آئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۲۷ر جنوری ۱۹۳۱ء)

U. P. URDU ACADEMI
KHABARNAMA Jan. 83
Regd. No. LW/NP/126

Cover printed at . ANUJ PRINTERS, MAHANGAAR LUCKNOW

اتر پردیش اردو اکادمی



اترپردیش اردو اکادمی

خبر نامہ

جلد ۱۱ شمارہ ۹

مارچ ۱۹۸۳ء

نگراں
پروفیسر محمود الٰہی

سالانہ چندہ :۔ پانچ روپے
فی شمارہ :۔ ۵۰ پیسے

سرورق کی تصویر
منشی دیا نرائن نگم

ستیش چندر سریواستوا ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے دفتر اترپردیش اردو اکادمی قیصر باغ لکھنؤ سے شائع کیا اور نامی پریس نخاس لکھنؤ نے طبع کیا۔

ترتیب

اداریہ ۔

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات!

جمہوریت میں اقلیتوں کے ساتھ حسن سلوک کی پرکھ کا بڑا آسان طریقہ بتایا گیا ہے اور وہ یہ کہ جب تک اقلیتیں خود نہ یہ محسوس کریں کہ ان کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کیا جاتا ہے، اس وقت تک حکومت کے ہزار وعدوں اور اعلانات کے باوجود حسن سلوک بے معنی رہتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے دستور نے لسانی اقلیتوں کے تحفظ کا معقول بند وبست کیا ہے، اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ حکومت اتر پردیش نے ریاست کی سب سے بڑی لسانی اقلیت یعنی اردو والوں کے لئے بعض گراں قدر مثبت اقدامات کئے ہیں لیکن یہ امر بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اردو والوں کو یہ محسوس کرنے کا موقع نہیں ملا کہ حکومت ان کے ساتھ منصفانہ سلوک کر رہی ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے، اس سوال کا جواب بڑا آسان ہے، حکومت نے اردو والوں کو جو کچھ دیا ہے، وہ اس سے استفادہ نہیں کر پاتے جس کی ایک چھوٹی سی مثال محکمہ تعلیمات ہے۔ حکومت تو یہ چاہتی ہے کہ ہر سطح پر اردو کی تعلیم کو فروغ حاصل ہو مگر بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن نے حال ہی میں جو نیا نصاب تعلیم مرتب کیا، وہ اردو کے حق میں زہر قاتل ثابت ہو رہا ہے اور محبان اردو مایوسی و محرومی کے نقطۂ کمال تک پہنچ گئے ہیں۔ اسی طرح حکومت کا یہ واضح موقف ہے کہ ڈگری کالجوں میں اردو بھی پڑھائی جائے مگر گزشتہ دس برسوں میں خود حکومت نے جو ڈگری کالج کھولے، ان میں اردو کو کوئی جگہ نہیں ملی۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ حکومت اپنے اردو

دوستی کے موقف پر اٹل ہے اور اس کی پالیسیوں پر عمل درآمد کا کام جن کے سپرد ہے وہ اپنا تحریری نقطۂ نظر نہیں بدلتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو والوں کی شکایات بڑھتی جاتی ہیں۔

حکومت کو اپنے عملے پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اسے اس امر کا فوری جائزہ لینا چاہئے کہ اردو کے نام پر جو سہولتیں وہ فراہم کر رہی ہے ان سے اردو والے کیوں محروم رکھے جاتے ہیں۔

کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ حکومت بہار اردو کی شکایات رفع کرنے کے لئے سول سکریٹریٹ میں ایک با اختیار افسر کی سربراہی میں ایک چھوٹا سا محکمہ قائم کرے۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ اس تجویز پر کس طرح عمل درآمد کیا جائے، ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اگر اس تجویز پر عمل کیا گیا تو اردو والے خود یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ حکومت اردو کے ساتھ منصفانہ سلوک کر رہی ہے۔

—— محمود الٰہی

۴

مقطع میں آپڑی ہے.....

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

بعض امتحانات میں ایک پرچہ مضمون نگاری کا ہوتا ہے جس میں امیدواروں سے کسی ایک موضوع پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ موضوعات اتنے دل چسپ اور متنوع ہوتے ہیں کہ ذہین مگر شریر طلبہ کو دل کا غبار نکالنے کا بھی موقع مل جاتا ہے اور اپنی فطری صلاحیتوں کے مظاہرے کا بھی۔

زمانے کی تبدیلی کے ساتھ سوال کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ اب کچھ اس قسم کے موضوعات پر مضمون لکھنے کے لیے کہا جاتا ہے۔

- اردو شاعری اور خلائی پرواز،
- اردو تنقید۔ اقلیدس کا فرضی نقطہ یا محبوب کی موہوم کمر؟
- افسانہ نگار۔ جسے میں نے ٹوٹ کر چاہا ہے،
- نثر میں سرقہ اور توارد کی روایت،

اس سال کے پرچے میں ایک عنوان یہ تھا:

- اردو کی انجمنیں۔ جمہوری حقوق کی بحالی کے بعد،

جس طرح بعض شعرا سنگلاخ زمینوں کو پانی کر کے رکھ دیتے ہیں، اسی طرح ایک طالب علم نے اس عنوان کو آئینہ کر دیا۔ اس نے لکھا کہ جہاں ایک طرف بعض حلقے حقوق کی بازیابی اور بحالی پر جشن منا رہے تھے، وہاں دوسری طرف کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے۔ یہ وہ لوگ تھے [illegible]

۵

کس مپرسی اور حق تلفی پر اپنی روزی روٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ اردو کی محبت میں کبھی محفل شعر منعقد کرتے تھے کبھی نثر نگاروں کا مقابلہ برپا کرتے تھے اور کبھی تعزیتی اور تہنیتی قراردادیں منظور کرتے تھے۔ تحریک سازی اور انجمن آرائی ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ان میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو دس انجمنوں سے کم کا بانی صدر نہ ہو۔ ہر ایک کے گھر میں چھوٹے بڑے مجموعے اور ہرے، گلابی، لال بیسیوں قسم کے چھپے ہوئے رنگین پیڈ رکھے ہوئے تھے جن سے وہ بوقت ضرورت اور چندہ دینے والوں کی فرمائش کے مطابق کام لیتے تھے۔ غرض ان کے گھر کی رونق ایک بنگلے پر موقوف تھی۔ اب اردو کے حقوق کی بحالی میں انھیں اپنے حقوق کی ضبطی نظر آئی۔ لیکن طالب علم نے مضمون کے آخر میں بڑی حوصلہ افزا بات بھی کہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جو لوگ اردو کے دورِ زوال میں عیش کوشی کر سکتے ہیں وہ اس کے دورِ ترقی میں تو اور بھی زیادہ دادِ عیش دے سکتے ہیں کیونکہ

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

• ——— نیاز حق

غزلیں

رباب رشیدی

نہ ڈھونڈ پائے کبھی اپنا گھر کتابوں میں
گزر گئے یوں ہی شام و سحر کتابوں میں

تمہارے عکس نے لفظوں کو بے زباں رکھا
تمہیں کو پڑھتے رہے عمر بھر کتابوں میں

وہ ایک حرف فقط شرحِ کائناتِ جمال
وہ ایک نام ہی بس معتبر کتابوں میں

وہ ایک جذبہ جو تقسیم سارے رشتوں میں
کہ رنگ رنگ وہی جلوہ گر کتابوں میں

بہت سی باتیں مرے تجربوں نے رد کر دیں
جو لکھ کے چھوڑ گئے خوش نظر کتابوں میں

مسافتِ غمِ ہستی نفس نفس کو محیط
ورق ورق وہی گردِ سفر کتابوں میں

ضرور اب کسی احساس کو چھپانے کو
جو غرق رہنے لگے رات بھر کتابوں میں

پیاسا پیاسا چہرہ بھیگا ساون کس کا ہے
ہجر کا موسم بھیگا دامن کس کا ہے

پانی پہ تم پتھر مار کے دیکھو تو
پھر سوچو یہ ٹوٹا درپن کس کا ہے

پھولوں تک جب زہر کی لائی پہونچے گی
زخم بتا دیں گے یہ گلشن کس کا ہے

تیرے ہی سب رنگ ترنگ ہیں الفت کے
فٹ پاتھوں پہ بھوکا بچپن کس کا ہے

محفل میں سب ہنستے گھر و تیرے تھے
تنہائی میں چھوٹا کنگن کس کا ہے

اونچے اونچے محلوں سے یہ پوچھے کون
پھوس کا چھپر کچا آنگن کس کا ہے

قلب الٰہی نور کرنوں سے رات ڈھلے
پوچھ رہے ہیں اب سنگھاسن کس کا ہے

اپنے اندر جھانک کے تھوڑا سوچو ذرا
تو ہے سب کا دوست تو دشمن کس کا ہے

شکیل [illegible]

اترپردیش اردو اکادمی کے نئے سکریٹری

ستیش چندر سریواستو

★ ـــــــــــــــــــــــــــــ خود نوشت

ضلع اناؤ میں [illegible] کی صنعت کے لیے مشہور عالم [illegible] سے تقریباً ۸ میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ گیان پور ہے۔ اسی قصبہ میں یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جس کی فضا علمی اور ادبی تھی۔ گیان پور کے اس خاندان میں سنسکرت، فارسی، اردو اور ہندی کو بڑا وقار حاصل تھا۔ میرے دادا اپنے وقت کے بہت بڑے نجومی تھے۔ نجوم کے ساتھ ساتھ فارسی اور سنسکرت ادب میں بھی انہیں دلچسپی تھی۔ گھر کے ماحول اور محترم دادا کی تربیت کا اثر یہ ہوا کہ مجھے محترم والد کو اردو اور ہندی کے علاوہ فارسی ادب میں بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔



مجھے والد مرحوم بچپن میں مجھے گلستاں بوستاں کی حکایتیں سنایا کرتے تھے اور ان کا مطلب بھی سمجھاتے تھے۔ علم نجوم میں ان کو بھی کافی دلچسپی تھی۔ [illegible] مشہور علم نجوم [illegible] ہمارے گھر میں آتی تھی۔ اساتذہ کے دیوان [illegible] کی چیز تھے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ گھر کی ادبی فضا میں میری ابتدائی تعلیم [illegible]

میری تعلیمی عمارت کی خشت اول اردو زبان سے رکھی گئی۔ اردو کی ابتدائی تعلیم [illegible]
اور فارسی کی تعلیم ہوئی۔ مجھے فارسی بھی پڑھائی گئی۔ ۱۹۴۵ء میں [illegible] ہائی اسکول گلبرگہ سے
اردو، فارسی اور انگریزی کے [illegible] کے ساتھ سائنس اور ریاضی میں ہائی اسکول کا امتحان پاس
کرکے مجھے تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے لیے الہ آباد بھیجا گیا۔ یہاں کا مشہور [illegible] کالج سے انٹرمیڈیٹ
کا امتحان پاس کیا اور سنہ ۱۹۵۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کرکے
ہندی اور اردو کی [illegible] اس طرح [illegible] تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

یونیورسٹی کی تعلیم ختم ہونے کے بعد میری عملی زندگی کا آغاز [illegible]
کے [illegible] کالج میں ایک سال سائنس پڑھائی۔ اس کے بعد پبلک سروس کمیشن
سے [illegible] کا امتحان پاس کرکے تقریباً ۲ سال تک محکمہ لوکل فنڈ اکاؤنٹ میں آڈیٹر کے
فرائض انجام دیے۔ ۲۲ جنوری ۱۹۵۵ء کو ریاست کے سکریٹریٹ میں [illegible] کا امتحان
پاس کرکے داخل ہوا۔ سکریٹریٹ کے محکمہ تعلیم میں ۸ سال تک خدمت کرنے کے بعد
۱۹۶۳ء میں ترقی پاکر محکمہ صحت میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہوا اور ۱۹۶۷ء میں سیکشن افسر کی
اسامی پر ترقی ملنے پر محکمہ منصوبہ بندی میں تعینات کیا گیا۔ محکمہ منصوبہ بندی میں ہی ۱۹۷۲ء میں
ترقی پاکر انڈر سکریٹری ہوا۔ اس طرح تقریباً ۱۱ سال تک محکمہ منصوبہ بندی میں کام کرنے کے
بعد ۱۸ فروری ۱۹۸۳ء کو آندھرا پردیش اردو اکادمی کی خدمت کرنے کے لیے ریاستی حکومت نے مجھے
منتخب کیا۔

سکریٹریٹ کی کئی ادبی، ثقافتی اور سروس تنظیموں میں مجھے خدمت کرنے کا موقع
ملتا رہا ہے۔ پچھلے دو سال سے سکریٹریٹ سروس [illegible]
مجھے اردو اکادمی میں [illegible] فرائض انجام دینے میں جہاں ایک طرف [illegible]
[illegible] حاصل ہوگی، وہاں دوسری طرف [illegible]
کے ساتھ [illegible] اور خلوص کا [illegible] رہے گا۔

اترپردیش اردو اکادمی کے تعلیمی وظائف

تعلیمی سال ۸۳-۱۹۸۲ء کے لیے درجہ گیارہ کی موصولہ درخواستوں پر غور کرتے ہوئے حسب ذیل طلبہ و طالبات کو ۲۵/- پچیس روپے ماہانہ وظیفہ یکم جولائی ۱۹۸۲ء سے ۳۰ جون ۱۹۸۳ء تک دیا جانا منظور کیا گیا۔

طلبہ کے لیے:-

۱۔	سراج احمد	نیشنل انٹر کالج محمد آباد، گہنہ اعظم گڑھ	منظور
۲۔	اشرف حسین	رادھارمن انٹر کالج دارا گنج الہ آباد	مشروط "
۳۔	محمد ظہیر الدین	ڈی اے وی انٹر کالج۔ باندہ	"
۴۔	وسیم احمد	گاندھی انٹر کالج۔ سکندر پور، بلیا	"
۵۔	مجیب احمد مسعود	راجکیہ انٹر کالج۔ بدایوں	"
۶۔	شکیل احمد خاں	شیوپتی انٹر کالج۔ شہرت گڑھ بستی	"
۷۔	عرفان احمد خاں	راجکیہ انٹر کالج، نجیب آباد، بجنور	" "
۸۔	عمار علی	شری جگت نرائن برہم دت تیواری انٹر کالج بھدہ دیوریا	
۹۔	حسن خالد	اے ایچ ایم ایس اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ	"
۱۰۔	محمد اسلم	آزاد گاندھی انٹر کالج۔ کاس گنج، ایٹہ	" "
۱۱۔	سید آصف علی	مسلم انٹر کالج۔ فتح پور	" "
۱۲۔	محمد سعید	اسلامیہ انٹر کالج اندی پور فیض آباد	
۱۳۔	فخر الدین خاں	ایل ایم ٹی انٹر کالج چھپیڑوا گونڈہ	"
۱۴۔	محمد ذوالفقار	آزاد میموریل انٹر کالج گداسنا غازی آباد	"
۱۵۔	[illegible]	ہارٹ من انٹر کالج ہارٹ من پور غازی پور	

۱۶ ۔ حسن آب خاں — دی ایم ایچ ایس رحمانیہ کالج ۔ ہمیرپور — ششم
۱۷ ۔ سید محمد اسلم اشرف — راجکیہ جبلی کالج لکھنؤ — مشرفہ "
۱۸ ۔ محمد یا عظیم — جواہر لال میموریل انٹر کالج سرسی مرادآباد " "

طالبات کے لیے :۔

۱ ۔ رضوانہ خاتون — سو فی دو معاپر کھنڈیل وال بالیکا انٹر کالج اعظم گڑھ "
۲ ۔ عذرا پروین — راجکیہ کنیا انٹر کالج بارہ بنکی "
۳ ۔ فاطمہ پروین — راجکیہ کنیا انٹر کالج باندہ "
۴ ۔ ساجدہ بیگم — راجکیہ کنیا انٹر کالج بستی "
۵ ۔ فوزانہ خاتون — راجکیہ کنیا انٹر کالج فیض آباد " "
۶ ۔ تقیہ بیگم — راجکیہ کنیا انٹر کالج فتح پور "
۷ ۔ روبی بیگم — جنتا آدرش انٹر کالج مبارک پور غازی پور " "
۸ ۔ طلعت افروز یوسف نعمانی — امامباڑہ مسلم گرلس انٹر کالج گورکھپور " "
۹ ۔ عظمیٰ فاطمہ — راجکیہ بالیکا انٹر کالج سندیلہ ہردوئی "
۱۰ ۔ بشریٰ اسلام — راجکیہ بالیکا انٹر کالج ہمیرپور "
۱۱ ۔ افشاں پروین — مسلم جبلی گرلس انٹر کالج کانپور "
۱۲ ۔ رشیدہ بانو — ناری شکشا نکیتن انٹر کالج لکھنؤ "
۱۳ ۔ رومانہ شمیم — گورنمنٹ گرلس انٹر کالج امروہہ مرادآباد " "
۱۴ ۔ سعیدہ بیگم — اسمٰعیل گرلس نیشنل انٹر کالج ٹھاکر گیٹ میرٹھ "
۱۵ ۔ شائستہ جبیں — راجکیہ بالیکا انٹر کالج پرتاپ گڑھ " "
۱۶ ۔ کہکشاں بانو — راجکیہ بالیکا انٹر کالج رائے بریلی "
۱۷ ۔ خالدہ خانم — کیشی کماری راجکیہ بالیکا انٹر کالج [illegible] "
۱۸ ۔ سہیلی تمنا — نیشنل گرلس انٹر کالج [illegible] "

(د) مد نمبر (۹) کے لیے موصولہ درخواستوں پر غور کرتے ہوئے سب کمیٹی نے حسب ذیل طلبا و طالبات کو -/۲۰ (بیس روپے) ماہانہ وظیفہ یکم جولائی ۸۲ سے جون ۸۳ تک دیا جانا منظور کیا۔

طلبا کے لیے :-

۱۔	محمد جمال مصطفیٰ	نیشنل انٹر کالج محمد آباد گوہنہ اعظم گڑھ	مشروط	منظور
۲۔	سید محمد زبیر حنیف	سٹی اے وی انٹر کالج الہ آباد	"	"
۳۔	منصور عالم صدیقی	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سٹی ہائی اسکول علی گڑھ	"	"
۴۔	عطا اللہ خان	سعادت انٹر کالج نانپارہ بہرائچ	"	"
۵۔	جمشید احمد	شیو پتی انٹر کالج شہرت گڑھ بستی	"	"
۶۔	محمد امین	اینگلو انٹر کالج نواب گنج بازار علی آباد بارہ بنکی	"	"
۷۔	سید امین محمد	پرمود انٹر کالج سسواں بدایوں		"
۸۔	سجاد عالم	انٹرمیڈیٹ کالج پنڈی دیوریا	"	"
۹۔	گل محمد	ایس این انٹر کالج اندئی پور فیض آباد		"
۱۰۔	یامین خان	راجکیہ انٹر کالج ہردوئی	ـــ	"
۱۱۔	آصف علی	ایچ ایس نیشنل ایچ ایس اسکول جھانسی		"
۱۲۔	ریاض احمد	محمد حسن انٹر کالج جون پور	"	"
۱۳۔	محمد موسیٰ سلیمان	اسلامیہ انٹر کالج لکھنؤ		"
۱۴۔	سید منتظر حسین	ہند انٹرمیڈیٹ کالج سنبھل مراد آباد	"	"
۱۵۔	عثمان علی	ایس بی آر ایم انٹر کالج جیل پور پیلی بھیت		"
۱۶۔	عبد السلام	[illegible] انٹر کالج [illegible] سیتا پور		"
۱۷۔	[illegible]	[illegible] انٹر کالج سلطان پور	"	"

۱۸ -	شہزاد احمد	اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول دیوبند سہارنپور		منظور
۱۹ -	سید محمد خرم	نگر پالیکا انٹر کالج مغل سرائے وارانسی		منظور

طالبات کے لیے :-

۱ -	افشاں ناہید	نیشنل انٹر کالج محمد آباد گوہنہ اعظم گڑھ		منظور
۲ -	سیدہ نسرین	مادھوک بالیکا ودیالیہ انٹر کالج آگرہ		مشروط منظور
۳ -	صبیحہ انجم	نگر پالیکا اچیتر مادھوک ودیالیہ گنگرالہ بدایوں	"	"
۴ -	نجمہ خاتون	رتسر انٹر کالج رتسر بلیا		"
۵ -	فوزیہ احتشام	راجکیہ بالیکا انٹر کالج بہرائچ		"
۶ -	فہمیدہ خاتون	رتن سین انٹر کالج بانسی بستی	"	"
۷ -	تسنیم عصمت رضوی	ارم ماڈل نسواں اسکول بارہ بنکی	"	"
۸ -	شاکرہ نصیر	گورنمنٹ گرلس انٹر کالج اٹاوہ	"	"
۹ -	ناز بانو	بابا برواداس انٹرمیڈیٹ کالج فیض آباد	"	"
۱۰ -	شگفتہ بیگم	امام باڑہ مسلم گرلس انٹر کالج گورکھپور	"	"
۱۱ -	زیبا اسلام	راجکیہ بالیکا انٹر کالج ہمیرپور		"
۱۲ -	شوکت آرا	راجکیہ بالیکا انٹر کالج اورئی جالون	"	"
۱۳	غزالہ یاسمین	کستوربہ کنیا ہائر سکنڈری اسکول لکھنؤ	"	"
۱۴ -	سارہ بی خانم	راجکیہ کنیا مادھوک ودیالیہ سنبھل مرادآباد	"	"
۱۵ -	حنا شہزاد	ڈاکٹر خورشید گرلس انٹر کالج رامپور		"
۱۶ -	رئیس فاطمہ	راجکیہ بالیکا انٹر کالج محمود آباد سیتاپور	"	"
۱۷ -	شگفتہ پروین	سی ایل انٹر کالج چھاپٹی سلطانپور		"
۱۸ -	افسانہ بانو	راجکیہ بالیکا انٹر کالج [illegible]	"	"

۱۹۔ نرجس فاطمہ   مادھا کشوری راجکیہ بالیکا انٹر کالج وارانسی   منظور
درجہ ۹ کے وہ طلبہ وطالبات جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔
۱۔ بھرت پرشاد   شری جگت نرائن برہم دیوتیواری انٹر کالج دیوریا   منظور
۲۔ رام کبیر   ایس این انٹر کالج اندل پور فیض آباد   "
۳۔ نیرج کمار   سنٹرل ہندو اسکول کچھا وارانسی   مشروط منظور

تعلیمی سال ۸۳-۱۹۸۲ کے لیے درجہ ۶ کے طلبہ وطالبات (جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے) کی موصولہ درخواستوں پر غور کرتے ہوئے مندرجہ ذیل طلبہ وطالبات کو -/۱۲ (بارہ روپے) ماہانہ وظیفہ یکم جولائی ۸۲ سے ۳۰ جون ۸۳ تک دئے جانے کی سفارش کی۔

۱۔ نہال چند   بابا اودھو داس گھاسودے جونیر ہائی اسکول فیض آباد
۲۔ نراجندر پرشاد   جونیر ہائی اسکول دہرادون سلطان پور۔

تعلیمی سال ۸۳-۱۹۸۲ کے لیے مندرجہ ذیل طلبہ وطالبات کے وظائف کی تجدید کی گئی۔

درجہ سات:۔

۱۔ محمد وسیم   جونیر ہائی اسکول سرائے میونسپل بورڈ سنبھل مراد آباد
۲۔ محمد علاء الدین   فرقانیہ جونیر ہائی اسکول شاہی تالاب جون پور
۳۔ حکمت اللہ خاں۔ ذاکر حسین نیشنل اسلامیہ ہائی اسکول پھپھوند اٹاوہ
۴۔ ثاقب جمال انصاری مرزا غالب جونیر ہائی اسکول جلال پور فیض آباد
۵۔ محمد محبوب خاں۔ راجکیہ ممتاز انٹر کالج کدورہ جالون
۶۔ اوم پرکاش   سینیر بیسک ودیالیہ تادی چھنا وارانسی

۷ ۔ ارشد جمال — دار العلوم مئو ناتھ بھنجن اعظم گڑھ
۸ ۔ محمد خالد معروف چغتائی کرسچن ہائر سکنڈری اسکول بدایوں
۹ ۔ محمد رفیع خاں — فضل رحمانیہ ہائر سکنڈری اسکول پچپڑوا گونڈہ
۱۰ ۔ محمد قمر قریشی — میونسپل بورڈ جونیر ہائی اسکول، بسیل پور پیلی بھیت
۱۱ ۔ کماری کنیز منتظر — نگر پالیکا کنیا جونیر ہائی اسکول چوبے ٹولہ سیتا پور
۱۲ ۔ کہکشاں افروز — گورنمنٹ کنیا انٹر کالج کاس گنج ایٹہ
۱۳ ۔ رخسانہ سلطانہ — راجکیہ بالیکا انٹر کالج سندیلہ ہردوئی
۱۴ ۔ عظمیٰ بیگم — راجکیہ ممتاز انٹر کالج کدورہ باؤنی جالون

درجہ آٹھ:۔

۱ ۔ تسلیمہ بیگم — ذاکر حسین نیشنل اسلامیہ جونیر ہائی اسکول پھپھوند اٹاوہ
۲ ۔ تسنیم فاطمہ — فریدی گرلز جونیر ہائی اسکول بلوچ پورا لکھنؤ
۳ ۔ حسن بانو — جعفریہ نیشنل جونیر ہائی اسکول جعفرآباد جلال پور فیض آباد
۴ ۔ کماری نوتنیت — انٹی بائیوٹکس پلانٹ انٹر کالج ویر بھدر دہرہ دون
۵ ۔ چندر پال — جونیر ہائی اسکول لوہاگڑھ جھانسی
۶ ۔ سوشیل کمار تیواری — " " " تکسی پور سلطان پور
۷ ۔ آشا رانی — بختاور لعل نسواں جونیر ہائی اسکول ۔ پیلی بھیت
۸ ۔ سشیل چندر مصرا — میونسپل بورڈ جونیر ہائی اسکول بسیل پور " "
۹ ۔ زینت رضوی — رادھا کشور گرلس انٹر کالج رام نگر وارانسی
۱۰ ۔ کشور جہاں — شیراز ہند ہائر سکنڈری اسکول مورگی جون پور
۱۱ ۔ طیبہ خاتون — خیر گرلز انٹر کالج بستی
۱۲ ۔ اسمیٰ بدر — راجکیہ بالیکا [illegible]

۱۳۔ معراج فاطمہ — بدیع الدین جونیر ہائی اسکول بش پور شنشتا گونڈہ
۱۴۔ یاسمین بانو — راجکیہ بالیکا انٹر کالج ہمیر پور
۱۵۔ نجمہ خاتون — اللیہ گرلس اسکول رائے بریلی
۱۶۔ آمنہ خاتون — اسلامیہ اسکول گھاٹم پور رکان پور

درجہ دس

۱۔ سید شمس الاسلام ہاشمی — اسلامیہ انٹر کالج ہمیر پور
۲۔ خالد پرویز — اینگلو انڈین کالج نواب گنج بازار آباد بارہ بنکی
۳۔ سید محمد کوثر رضوی — گورنمنٹ حسین آباد انٹر کالج لکھنؤ
۴۔ سید تقی رضا زیدی — راجہ شنکر سہائے انٹر کالج اناؤ
۵۔ ضیاء الحق — ایس این انٹر کالج آندلی پور فیض آباد
۶۔ محمد غلام غوث — آدرش انٹر کالج منیر پور غازی پور
۔ اشفاق احمد — میتل ایچ ایس اسکول جھانسی
۔ صبیحہ وسیم — راجکیہ کنیا اچتر مادھمک ودیالیہ سیتاپور
۔ عطیہ بیگم — راجکیہ بالیکا انٹر کالج غازی پور
۔ ریحانہ سلطانہ — راجکیہ بالیکا انٹر کالج سندیلہ ہردوئی
۔ یاسمین — کنیا اچتر مادھمک ودیالیہ کاری کنواں رام پور
۔ عفت فاطمہ صدیقی — راجکیہ بالیکا انٹر کالج پرتاپ گڑھ
۔ تسنیم بانو — ایس ایس ہائر سکنڈری اسکول روپہ ڈیہا بہرائچ
۔ سوریہ بھان سنگھ — ایس این انٹر کالج اندلی پور فیض آباد

درجہ بارہ :۔

محمد احمد خاں — گاندھی انٹر کالج سکندر پور بلیا

۲۔ عثمان خاں راجکیہ ممتاز انٹر کالج کدورہ جالون
۳۔ محمد رفیق خاں لوک مانیہ تلک انٹر کالج بچھپڑوا گونڈہ

بی۔ اے۔ سال دوم:۔

۱۔ انیس فاطمہ صدیقی راجکیہ مہلا ودیالیہ غازی پور
۲۔ عبدالرحمان پی جی پوسٹ گریجویٹ کالج غازی پور
۳۔ محمد شاہد الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد
۴۔ ثناء اللہ تلک دھاری کالج جون پور
۵۔ اعجاز احمد خاں سرسوتی ودیا پیٹھ ودیالیہ غازی پور
۶۔ نغمہ فاروقی راج موہن گرلس ڈگری کالج فیض آباد
۷۔ رضی الحسن حیدری شیعہ ڈگری کالج لکھنؤ
۸۔ شبانہ پروین جے این ایم پوسٹ گریجویٹ کالج بارہ بنکی
۹۔ رئیس فاطمہ ممتاز ڈگری کالج لکھنؤ
۱۰۔ پروین فاطمہ ترلوک ناتھ ڈگری کالج ٹانڈہ فیض آباد
۱۱۔ چمن آرا فیروز گاندھی کالج رائے بریلی
۱۲۔ نجیب احمد بنارس ہندو یونیورسٹی
۱۳۔ فاطمہ تنویر گنپت سہائے ڈگری کالج سلطان پور
۱۴۔ یاسمین اظہر کمن کمن جی ڈگری کالج لکھنؤ
۱۵۔ خورشید احمد خاں مرلی منوہر ٹاؤن مہاودیالیہ بلیا
۱۶۔ محمد اسمٰعیل خاں رتن سین ڈگری کالج بانسی بستی
۱۷۔ مسرت بانو مہاتما گاندھی ڈگری کالج فیروز آباد آگرہ

ایم۔ اے۔ سال دوم:۔

۱۔ مختار احمد گنپت سہائے ڈگری کالج سلطان پور

عوامی کتب خانوں کو اکادمی کی امداد

اتر پردیش اردو اکادمی کی مجلس انتظامیہ نے مندرجۂ ذیل کتب خانوں کو ۸۳-۱۹۸۲ء کے لیے مالی امداد دینا منظور کیا ہے۔ امداد کی رقم متعلقہ کتب خانوں کے نام کے آگے درج ہے۔

(الف) مندرجہ ذیل کتب خانوں کے کاغذات مکمل تھے:

۱۔ قومی لائبریری، ۴۲ چوک، الہ آباد — ۱۰۰۰/- روپے
۲۔ شمیم ادب اردو لائبریری، کریان، اعظم گڑھ — ۷۵۰/- روپے
۳۔ جعفر لائبریری (رجسٹرڈ) مبارک پور۔ اعظم گڑھ — ۱۰۰۰/- روپے
۴۔ اقبالستان لائبریری، 〃 〃 〃 〃 — ۷۵۰/- روپے
۵۔ قومی ایکتا لائبریری، قصبہ متی، بارہ بنکی — ۷۵۰/- روپے
۶۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اردو لائبریری، سول لائن بارہ بنکی — ۱۰۰۰/- روپے
۷۔ جمیل الرحمٰن اردو لائبریری، بیگم گنج۔ بارہ بنکی — ۷۵۰/- روپے
۸۔ سرسوتی پستکالیہ، نجیب آباد، بجنور — ۱۰۰۰/- روپے
۹۔ قریشیہ اردو لائبریری، کٹرہ شہاب خاں اٹاوہ — ۷۵۰/- روپے
۱۰۔ دار المطالعہ نسواں، مدرسہ نسواں کٹرہ شہاب خاں اٹاوہ — ۷۵۰/- روپے
۱۱۔ آزاد میموریل اردو لائبریری، پرانا بازار، بچھڑوا، گونڈہ — ۷۵۰/- روپے
۱۲۔ قومی اردو لائبریری [illegible] گونڈہ — ۷۵۰/- روپے
۱۳۔ اردو لائبریری [illegible] گونڈہ — ۷۵۰/- روپے

۱۴۔ عثمانی دارالمطالعہ، مالدہ گونڈہ ۷۵۰/- ماہانہ

۱۵۔ انوار اردو لائبریری، پرتاپ پور جروا، گونڈہ ۷۵۰/- 〃

۱۶۔ نعیمی اردو لائبریری، چین پور خاص، بھگوان پور گونڈہ ۷۵۰/- 〃

۱۷۔ پبلک لائبریری، سانڈی ہردوئی ۷۵۰/- 〃

۱۸۔ آل انڈیا شفیق میموریل سوسائٹی لائبریری، جونپور ۱۰۰۰/- 〃

۱۹۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد پستکالیہ ایوم واچنالیہ [illegible] نگر کانپور ۱۰۰۰/- 〃

۲۰۔ کتب خانہ انجمن دارالتعلیم جامع مئو کان پور ۷۵۰/- 〃

۲۱۔ فریدی پبلک لائبریری، نخاس، لکھنؤ ۷۵۰/- 〃

۲۲۔ وجے پستکالیہ ایوم واچنالیہ ۸۸ شیام نگر، عالم باغ لکھنؤ ۷۵۰/- 〃

۲۳۔ جامعہ فروغ اردو لائبریری، محلہ مروا۔ بھم گاؤں مین پوری ۷۵۰/- 〃

۲۴۔ سراج العلوم اردو لائبریری، سدھولی، سیتاپور ۷۵۰/- 〃

۲۵۔ محمد حسین لائبریری، بسواں، سیتاپور ۷۵۰/- 〃

۲۶۔ غوثیہ پبلک لائبریری، بجرڈیہہ، وارانسی ۷۵۰/- 〃

۲۷۔ غوثیہ دارالمطالعہ، بجرڈیہہ، وارانسی ۷۵۰/- 〃

۲۸۔ شمع لائبریری، انجمن ترقی اردو، کریا پور بجگین، اناؤ ۷۵۰/- 〃

درج ذیل لائبریریوں کی امداد مشروط منظور کی گئی

۱۔ بھارتی بھون لائبریری سرائے میر الہ آباد ۱۰۰۰/-

۲۔ دانش کدہ اردو لائبریری، مئو ناتھ بھنجن، اعظم گڑھ ۱۰۰۰/-

۳۔ مدنی دارالمطالعہ دارالعلوم حسین آباد انجان شہید، اعظم گڑھ ۱۰۰۰/-

۴۔ اردو لائبریری، خیر آباد، اعظم گڑھ ۱۰۰۰/-

۵۔ انصاری لائبریری، خیر آباد، اعظم گڑھ ۱۰۰۰/-

۶- ... لائبریری ... تسم ایجوکیشنل سوسائٹی ... اعظم گڑھ — ۷۵۰/-

۷- دارالعلوم لائبریری، ناصر پورہ، مئوناتھ بھنجن، اعظم گڑھ — ۷۵۰/-

۸- شری نہرو اسمارک پبلک لائبریری، روپیڈیہا، بہرائچ — ۱۰۰۰/-

۹- ... پستکالیہ، بہرائچ — ۷۵۰/-

۱۰- غالب لائبریری، درگاہ ... ہال، ناظم پارہ، بہرائچ — ۱۰۰۰/-

۱۱- سید محمود حسن میموریل لائبریری، قاضی پورہ، بہرائچ — ۷۵۰/-

۱۲- سلیم مبشر اردو سوسائٹی لائبریری، گلی وحید بخش سوتھہ، بدایوں — ۱۰۰۰/-

۱۳- بدایوں لائبریری اینڈ ریڈنگ روم، سیدوں ٹولہ، بدایوں — ۱۰۰۰/-

۱۴- مولانا حسرت موہانی میموریل اردو لائبریری، کمپیئر اباغ، بارہ بنکی — ۷۵۰/-

۱۵- مختار احمد قدوائی میموریل لائبریری، وادیہ ہاؤس، رسولپور، بارہ بنکی — ۱۰۰۰/-

۱۶- اقبال لائبریری، ۵۲ بخار پورہ، بریلی — ۷۵۰/-

۱۷- دارالمطالعہ ارشادیہ نیشنل لائبریری، سرائے خام، بریلی — ۱۰۰۰/-

۱۸- پریم پستکالیہ، نگینہ، بجنور — ۱۰۰۰/-

۱۹- دارالمطالعہ، ثابت گنج، اٹاوہ — ۱۰۰۰/-

۲۰- جامعہ پبلک لائبریری، نیا بازار، جہانگیر گنج، فیض آباد — ۷۵۰/-

۲۱- ندائے حق لائبریری، جلال پور، فیض آباد — ۱۰۰۰/-

۲۲- تنویر لائبریری، بھولے پور، ... فیض آباد — ۴۵۰/-

۲۳- علامہ اقبال پبلک لائبریری، جلال پور، فیض آباد — ۱۲۵۰/-

۲۴- قومی لائبریری، ... شاہدہ، فیض آباد — ۷۵۰/-

۲۵- انجمن یادگار ... لائبریری، مغل پورہ، فیض آباد — ۱۵۰۰/-

۲۶- مولانا ابوالکلام آزاد ... دارالمطالعہ، ... فرخ آباد — ۷۵۰/-

۲۷۔ احباب لائبریری ۔ ۔ ۔ فرخ آباد ۷۵/-

۲۸۔ انجمن ترقی اردو آزاد لائبریری سیان ۔ ۔ ۔ آباد فتح پور [illegible]

۲۹۔ انجمن ترقی اردو لائبریری ۔ اسول، فتح پور ۷۵/-

۳۰۔ انجمن ترقی اردو لائبریری ۔ مرزا پور کا پل، فتح پور ۷۵/-

۳۱۔ جناح لائبریری ۔ فتح پور ۱۰۰/-

۳۲۔ کائستری گیان مندر پستکالیہ ایوم واچنالیہ چک غازی پور ۷۵/-

۳۳۔ مظہر سید ریلی اردو لائبریری ۔ بجری آباد ۔ ۔ ۔ پور ۷۵/-

۳۴۔ عوامی فلاحی لائبریری ۔ اسلام نگر، بچپڑوا گونڈہ ۷۵/-

۳۵۔ فضل رحمانیہ اردو لائبریری ۔ بچپڑوا، گونڈہ ۷۵/-

۳۶۔ سلفیہ اردو لائبریری، تلوک پور، گونڈہ ۷۵/-

۳۷۔ عوامی لائبریری ۔ گلشن نگر ۷۵/-

۳۸۔ فاروقی دارالمطالعہ ۔ مدو نگر، گونڈہ ۷۵/-

۳۹۔ اقبال مسلم دارالمطالعہ ۔ جامع مسجد روڈ، شاہ آباد ۷۵۰

۴۰۔ قدوائی میونسپل پبلک لائبریری ۔ سندیلہ، ہردوئی ۱۵۰/-

۴۱۔ اردو لائبریری و انجمن فروغ اردو ۔ کدورہ، ہادی جالون ۷۵/-

۴۲۔ مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن لائبریری ۔ اردئی، جالون ۷۵/-

۴۳۔ شیراز ہند اردو کتب خانہ ۔ مچھوکی، جون پور ۷۵/-

۴۴۔ سجاد ظہیر لائبریری ۔ نئی پھاٹک، جون پور ۷۵/-

۴۵۔ عاشق پبلک لائبریری ۔ عاشق باغ، ۔ ۔ ۔ کانپور ۷۵/-

۴۶۔ میر انیس لائبریری ۔ قصبہ ۔ ۔ ۔ کانپور ۷۵/-

۴۷۔ [illegible] ۔ کانپور ۷۵/-

۴۸۔ محمد علی فاروقی لائبریری۔ ۱۲۴/۵۸ بیکن گنج، کان پور	۷۵۰/-
۴۹۔ انجمن اصلاح ملت لائبریری۔ کرنیل گنج، کان پور	۱۰۰۰/-
۵۰۔ اردو کتاب گھر حلقہ بزم ادب۔ محلہ ندی الت پور	۱۰۰۰/-
۵۱۔ چاچا نہرو لائبریری (انجمن ادب اطفال) امین آباد، لکھنؤ	۱۰۰۰/-
۵۲۔ امیر الدولہ پبلک لائبریری۔ قیصر باغ، لکھنؤ	۲۰۰۰/-
۵۳۔ گاندھی میموریل لائبریری۔ ۱۲ ناظر باغ، لکھنؤ	۱۰۰۰/-
۵۴۔ جلسہ تہذیب لائبریری۔ ۱۲ گولہ گنج، لکھنؤ	۲۰۰۰/-
۵۵۔ آچاریہ نریندر دیو پستکالیہ، موتی محل، لکھنؤ	۱۰۰۰/-
۵۶۔ نور اللغات لائبریری نور اللغات آفس، کاکوری، لکھنؤ	۱۰۰۰/-
۵۷۔ اتر پردیش مانوسیوا اسوسائٹی لائبریری۔ باغ قاضی لکھنؤ	۱۰۰۰/-
۵۸۔ صفی پبلک لائبریری و دار المطالعہ۔ قومی گھر، لکھنؤ	۱۵۰۰/-
۵۹۔ دار المطالعہ دار دو لائبریری۔ ہاپڑ، غازی آباد	۷۵۰/-
۶۰۔ انجمن حامی تعلیم مسلمانان مسلم لائبریری و ریڈنگ روم، میرٹھ	۱۰۰۰/-
۶۱۔ مولانا محمد علی جوہر لائبریری و ریڈنگ روم۔ خشت نگر، میرٹھ	۱۰۰۰/-
۶۲۔ عاشق پبلک لائبریری۔ سنبھل، مراد آباد	۲۰۰۰/-
۶۳۔ آزاد پبلک لائبریری۔ ٹھاکر دروازہ، مراد آباد	۷۵۰/-
۶۴۔ قومی لائبریری۔ شرقی تحگر خاص، مراد آباد	۱۰۰۰/-
۶۵۔ مسلم پبلک لائبریری بازار شاہی مسجد مراد آباد	۱۵۰۰/-
۶۶۔ محمد علی لائبریری۔ خانی باغ، سہارن پور	۱۰۰۰/-
۶۷۔ شہید چندر شیکھر آزاد اسمارک پستکالیہ۔ راجپور، سیتاپور	۷۵۰/-
۶۸۔ پبلک لائبریری۔ پہاسو، بلند شہر	۱۰۰۰/-

کتب خانہ جامعہ عربیہ مطالعۃ العلوم - وارانسی ۷۵۰/-

۷۰ - پستکالیہ ڈی ۴۵/۱۹۴ گرد باغ، وارانسی ۷۵۰/-

۷۱ - شبنم لائبریری - ماکور، اناؤ ۷۵۰/-

۷۲ نایاب اردو لائبریری انجمن ترقی اردو - سول لائن، اناؤ ۷۵۰/-

۷۳ - زینت الاسلام لائبریری - تالاب ملا ارم، رام پور ۷۵۰/-

۷۴ - صولت پبلک لائبریری - رام پور ۲۰۰۰/-

مومن لائبریری انجمن شیدائے مصطفےؐ - ٹانڈہ، فیض آباد ۱۰۰۰/- منظور

پبلک لائبریری کوپا گنج اعظم گڑھ ۱۵۰۰/- منظور

کہکشاں لائبریری مدرسہ شمس العلوم پوسٹ گھوسی اعظم گڑھ ۱۰۰۰/- ″

مقصودیہ پبلک لائبریری مہراج گنج پوسٹ ہوٹ چاند پارہ بہرائچ ۲۰۰۰/- ″

شری رام سرنا سمارک سارو جنک پستکالیہ محلہ مٹی بدایوں ۱۰۰۰/- ″

کتب خانہ دینی سروس ہوم مسولی بارہ بنکی ۲۵۰۰/- ″

امید کر پستکالیہ دل شاہ پور ایٹہ ۱۰۰۰/- ″

حبیبی دارالمطالعہ ۵۰۵ قندھاری بازار فیض آباد ۱۰۰۰/- ″

مدینہ پستکالیہ ٹانڈہ فیض آباد ۱۰۰۰/- ″

تعلیم الاسلام لائبریری بینچہ پروا فرخ آباد ۱۰۰۰/- ″

سنجے گاندھی پستکالیہ ایوم واچ نالیہ کرشنا نگر کانپور روڈ لکھنؤ ۱۰۰۰/- ″

اتر پردیش سیوا الیہ سیوا ادھیکاری سنگھ پستکالیہ وودھان بھون لکھنؤ ″

نوری اردو لائبریری سیتا پور ۱۰۰۰/ ″

پبلک لائبریری مدنا پور چاند پور چھبلائی اناؤ ۱۰۰۰/- ″

کریمیہ لائبریری رسول پور تجری بازار وارانسی	150/-	〃
سنہاجی سبھا شی چندر بوس پستکالیہ دواچنالیہ فرست گنج رائے بریلی	100/-	〃
آدرش پستکالیہ گرام اینڈ پوسٹ اگروبلیا	100/-	〃
آزاد لائبریری بستی	100/-	〃
مہاتما گاندھی پستکالیہ واچنالیہ نگر پالیکا لہرپور سیتاپور	100/-	〃
سعید مسلم لائبریری خورجہ بلند شہر	100/-	〃
مہاتما گاندھی پستکالیہ کملاجون اناؤ	100/-	〃
علامہ اقبال لائبریری بھگت سنگھ نگر کونچ جالون	100/-	منظور
کسان اردو پبلک لائبریری انہور دھوائی گونڈہ	100/-	〃
عزیزیہ پبلک لائبریری مابند غازی پور	100/-	〃

بی۔ اے میں پہلی بار اردو مضمون کھولنے پر خریداری کتب کی غرض سے
درج ذیل ڈگری کالجوں کو امداد منظور کی گئی۔

مہیلا ودیالیہ ڈگری کالج لکھنؤ	100/-	منظور
بندیل کھنڈ ڈگری کالج جھانسی	100/-	〃

الوداعیہ تقریر :- ص۳

پیشتر کہیں نہیں ملی" اس کے بعد جناب علی باقر زیدی صاحب نے عزیز الجبار
خاں صاحب کو اسٹاف کی جانب سے ایک تحفہ پیش کیا۔
آخر میں ... مسعود صاحب کے شکریے کے کلمات کے بعد پر تکلف
چائے کے ساتھ ... ختم ہوا۔

اکادمی کی ۳۴ کتابوں کی رسمِ اجرا

"اُردو میں ادبی اور علمی اہمیت کی طبع زاد تصانیف یا مقبولِ عام اور بچوں کی کتابوں کی ہمت افزائی کرنا اور شائع کرنا"

"ادبی اور سائنسی تصانیف نیز دوسرے موضوعات سے متعلق تصانیف کے اُردو ترجمے کا اہتمام کرنا جن کا اب تک اُردو میں ترجمہ نہ ہوا ہو"

"اُردو میں حوالے کی کتابیں تیار اور شائع کرنا"

"سائنسی ڈھنگ سے تدوین کئے گئے قدیم اُردو ادب کے متن کا شائع کرنا"

"اب تک کی غیر مطبوعہ اہم اردو تصانیف کا شائع کرنا"

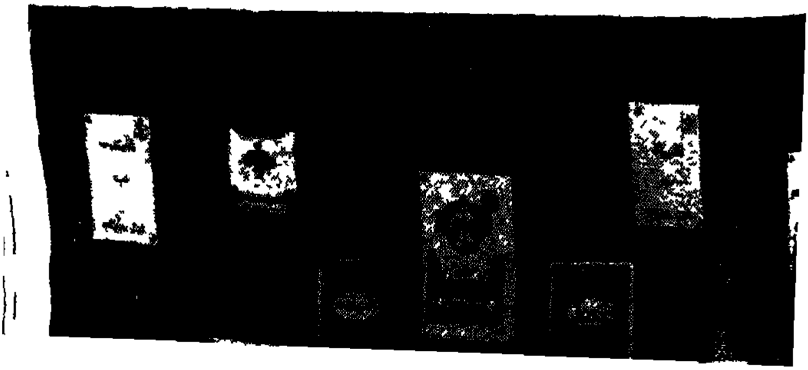
"رسالے، جریدے، میگزین یا ایسی ہی اعلا معیار کی دوسری اُردو مطبوعات شائع کرنا"

"قواعد ہٰذا کے تحت شائع کی گئی مطبوعات کی فروخت کا اہتمام کرنا۔"

اُردو اکادمی کے دستور میں [illegible]



اتر پردیش اردو اکادمی کی ۴۴ مطبوعات کی تقریب کا اجرا
منعقدہ ۱۶ر فروری ۱۹۸۳ء
کے کچھ مناظر





نیچے بائیں جانب سے، وزیر قومی یکجہتی و پارلیمانی امور ڈاکٹر عمار رضوی تقریر کر رہے



نیچے داهنی جانب سے تقریر کرتے هوئے : جناب محمود ال





بائیں طرف، جناب عبدالرحمٰن
نشتر وزیر اوقاف وحیل
تقریر کرتے ہوئے
داھنی طرف: حاضرین

ر بہادر سنگھ وزیر آب پاشی، ۴۳ کتابوں کا اجرا کرتے ہوئے اور تقریر کرتے ہوئے۔



لس انتظامیہ) جناب علی جواد زیدی (صدر)، جناب حکم چند نیر (وائس چیرمین)







اردو اکادمی اسٹاف کی طرف سے سابق سکریٹری کو الوداعیہ

اوپر داہنی جانب: جناب علی باقر زیدی صدر اکادمی ملازمین یونین سابق سکریٹری عزیز الجبار خاں کو اسٹاف
ا جانب سے تحفہ پیش کرتے ہوئے۔ بائیں طرف۔ ملازمین یونین کے سکریٹری جناب محمد درویش نئے سکریٹری
ناب ستیش چندر سریواستو کا ہار پہنا کر استقبال کرتے ہوئے۔ نیچے اکادمی کے ایک سپرنٹنڈنٹ جناب
ولیس حسن قدوائی اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ان کے بائیں طرف دوسرے
سپرنٹنڈنٹ جناب مرزا محمد کاظم



گئے ہیں وہ ۱۶۰ دفعات پر مشتمل ہیں جن میں سے مندرجۂ بالا سات دفعات کا تعلق تصنیف و تالیف، تدوین و ترتیب اور طباعت و اشاعت سے ہے یعنی جب یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اکادمی کے دستور نے دفعات کی تقریباً نصف تعداد صرف طباعت و اشاعت کے لئے وقف کر دی ہے تو اکادمی کا چند مہینوں میں ۴۳ کتابیں شائع کر دینا نہ تو کوئی تعجب کی بات ہے اور نہ کوئی قابل فخر کارنامہ ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی ایک مخلصانہ کوشش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ——— لیکن اس کے باوصف جب اکادمی نے اعلان کیا کہ ۱۶ر فروری ۱۹۸۳ء کو ۴۳ نئی مطبوعات کی رسم اجرا ادا کی جائے گی تو ہر ایک نے برجستہ یہی سوال کیا کہ

"ایک ساتھ ۴۳ کتابوں کا اجرا؟"

اکادمی نے جب اپنی رفتار اشاعت تیز کی تو اس نے مناسب یہ سمجھا کہ ملک کے ۳۴ ویں یوم جمہوریہ کے موقع پر ۴۳ نئی مطبوعات کی رسم اجرا ادا کر دی جائے۔ یہ تقریب ۲۶ر جنوری ۱۹۸۳ء کو منعقد ہونے والی تھی مگر بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس کا انعقاد ۱۶ر فروری ۱۹۸۳ء کو بوقت پانچ بجے شام ہوا۔

رسم اجرا کی تقریب کے دعوت نامے بڑی تعداد میں جاری کئے گئے تھے۔ اس تقریب کے افتتاح کے لئے وزیر قومی یکجہتی ڈاکٹر عابد رضوی کو مدعو کیا گیا تھا۔ صدارت کی ذمہ داری وزیر اوقاف جناب عبدالرحمٰن خاں نشتر نے قبول کی تھی اور مصروفیات کے باوجود جناب دیر بہادر سنگھ وزیر صنعت و آبپاشی نے مطبوعات کی رسم اجرا ادا کرنا منظور کر لیا تھا۔

[illegible] دانشوروں، شاعروں، ادیبوں اور محبانِ اردو

کی وجہ سے اکادمی ہال مرکز شعر و ادب کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ ٹھیک پانچ بجے جناب عبدالرحمٰن خاں نشتر تشریف لائے اور معاً بعد جناب دیر بہادر سنگھ بھی آگئے۔ چونکہ ڈاکٹر عمار رضوی کو تقریب کا افتتاح کرنا تھا اس لئے ان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ انتظار کی مدت کو لوگوں نے اکادمی کی مطبوعات کے سرسری مطالعے میں گزارا جن کی نمائش کا پہلے سے انتظام تھا۔ اس موقع پر اکادمی نے اپنی بعض مطبوعات کو نصف قیمت پر فراہم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لوگوں نے اپنی پسند کی کتابیں خریدیں۔ اسی اثنا میں یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر عمار رضوی قدرے تاخیر سے تشریف لائیں گے کیوں کہ یو، پی اسمبلی کا اجلاس شام کو دیر تک چلتا رہے گا اور اس میں رضوی صاحب کی موجودگی ضروری ہے۔ رضوی صاحب کا یہ پیغام بھی موصول ہوا کہ تقریب کا آغاز کر دیا جائے، انھیں جیسے ہی فرصت ملے گی، وہ آجائیں گے۔

جناب عبدالرحمٰن خاں نشتر نے مسند صدارت سنبھالی اور اکادمی کے صدر جناب علی جواد زیدی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے اکادمی کے اشاعتی منصوبوں پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی اور اعلان کیا کہ ہماری یہ پیش رفت جاری رہے گی اور اکادمی محبان اردو کو کم قیمت پر معیاری کتابیں فراہم کرتی رہے گی۔

اس کے بعد اصل تقریب کا آغاز ہوا۔ اکادمی نے ۲۴ مطبوعات کو موضوعات کے لحاظ سے پانچ پیکٹوں میں تقسیم کیا تھا۔

پہلا پیکٹ آزادی کے ادب سے متعلق ہے۔

• "اردو میں قومی شاعری کے سو سال"

- "انقلاب ۱۸۵۷ء : تصویر کا دوسرا رُخ"
- "مشاعرۂ زنداں"

یہ پیکٹ زمانۂ حال کے تخلیقی ادب پر مشتمل ہے :۔

- "زرد پتوں کی بہار"

جو ہے تو سفرنامہ لیکن رام لعل نے اسے افسانہ بنا دیا

- "زندگی اے زندگی"

خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم کا آخری مجموعۂ کلام وغیرہ وغیرہ

اس پیکٹ میں شعرا کے نایاب تذکرے ہیں :۔

شیفتہ کا

- "گلشن بے خار"

باطن کا

- "گلستانِ بے خزاں"

ناسخ کا

- "سخنِ شعرا"

امیر مینائی کا

- "انتخاب یادگار"

وغیرہ وغیرہ

اس پیکٹ میں کلاسیکی شعرا کے انتخابات ہیں :۔

نظیر اکبر آبادی

حالی

آغا حشر

صہبا

مرزا شوق

مصحفی

اس پیکٹ میں صاحب طرز نثر نگاروں کے
انتخابات ہیں :-

رشید احمد صدیقی

صلائے عام والے میر ناصر علی

رسم اجرا کیا تھی، کسی یونی ورسٹی کا نوو کیشن تھا جہاں ایک کے بعد ایک اسکالر آتے ہیں اور انھیں اسناد دی جاتی ہیں۔

رسم اجرا ختم ہوئی تو مہمان خصوصی جناب ویر بہادر سنگھ نے تقریر شروع کی۔ انھوں نے اردو اکادمی کے اکتسابات و خدمات کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ خوشی کی بات یہ ہے کہ اکادمی کسی ایک موضوع کی پابند ہو کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس نے بچوں کے ادب سے لے کر آزادی کے ادب تک اور سنسکرت کے ترجمے سے لیکر انگریزی کے ترجمے تک کو اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کیا ہے انھوں نے یقین دلایا کہ میں اردو کے تحفظ اور اس کی ترویج و ترقی کیلئے برابر کوشش کرتا رہوں گا۔

پھر صدر جلسہ جناب عبدالرحمن خاں نشتر مائکروفون پر آئے۔ انھوں نے کہا کہ آج ملک میں قومی یکجہتی کی سخت ضرورت ہے، اردو قومی یکجہتی کی پیداوار ہے، اردو کو نظر انداز کر کے قومی یکجہتی حاصل نہیں کی جا سکتی اس

لئے جو لوگ قومی یکجہتی کے حصول کے لئے کوشش کر رہے ہیں انھیں چاہیے کہ اردو کو گلے سے لگائیں اور اس کے حقوق کی بازیافت کریں۔ نشتر صاحب نے اردو زبان و ادب کے ارتقا کا جائزہ لیا اور کہا کہ یہ ہر لحاظ سے ہندستانی زبان ہے اور اس کی ترویج و ترقی میں ملک کے ہر خطے اور ہر طبقے نے حصہ لیا ہے۔

نشتر صاحب تقریر کر رہے تھے کہ وزیر قومی یکجہتی ڈاکٹر عابد رضوی تشریف لے آئے۔ رضوی صاحب نے محبان اردو سے اپیل کی کہ اب اردو کی خدمت تبلیغی اور مشنری جذبے سے کرنی چاہئے اور ایسا لٹریچر فراہم کرنا چاہئے جو ہر طبقے کے لئے کشش رکھتا ہو۔

جلسے کے آخر میں اکادمی کے چیرمین پروفیسر محمود الٰہی نے شرکائے تقریب اور مہمانان خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ رسم اجرا کی یہ تقریب محض ایک رسم نہیں تھی بلکہ اسے تعمیری کاموں کا تمہیدی ذریعۂ اظہار کہنا چاہئے۔ انھوں نے کہا اکادمی اپنی یہ کوشش جاری رکھے گی کہ وہ محبانِ اردو کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکے۔

تقریب کی نظامت اکادمی کے وائس چیرمین پروفیسر نظم چند نیر نے

انجام ...

اختر کاشی پوری

رباعیات

یہ زلف کہ گھنگھرالی گھٹا شرمائے
یہ روئے درخشاں کہ کرن گہنائے
رفتار کا یہ لوچ کہ اکتارے پر
جیسے کوئی رس کھان کا پد لہرائے

پت جھڑ ہے کہیں وسنت یہ مایا کیا ہے
یہ ابر یہ لو یہ دھوپ چھایا کیا ہے
اثبات و نفی کی مملکت کہنہ میں
سازش کا ہنڈولا ہے یہ کایا کیا ہے

چھلکے ہوئے ساغر ہیں کہ شب کی گھڑیاں
سانسیں ہیں کہ جوہی کے گلوں کی لڑیاں
افکار سے جھڑ رہی ہے دریا کی پھوار
یادیں ہیں کہ ملہار کی بکھری کڑیاں

مسودات کی طباعت کے لئے جزوی مالی امداد

اتر پردیش اردو اکادمی ہر سال اہم مسودات کی طباعت کیلئے ان کے مصنفین / مرتبین کو جزوی مالی امداد دیتی ہے۔ پہلے یہ امداد ساٹھ فی صد اخراجات کا احاطہ کرتی تھی، موجودہ مالی سال سے یہ امداد پچہتر فی صد تک بڑھا دی گئی ہے۔

۱۹۸۲-۸۳ء کے مالی سال کے دوران جو مسودات جزوی امداد کیلئے منظور کیے گئے ہیں، ان کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

نمبر شمار	مسودات کے نام	مصنف / مرتب
(۱)	اجالوں کے سفیر	حیات وارثی
(۲)	آخری دہلیز	ڈاکٹر قمر جہاں
(۳)	ادبی آئینے	سعادت علی صدیقی
(۴)	اردو ادب کا تہذیبی سماجی پس منظر	ڈاکٹر قاضی جمال حسین
(۵)	اردو کی بین الاقوامی حیثیت	محمد نعیم اللہ خیالی
(۶)	اردو ادب میں مسیحیوں کا حصہ	ڈی ہرسین قربان
(۷)	اردو میں خطوط نگاری کا ارتقا	ڈاکٹر رشیدہ خاتون
(۸)	از بر	بلراج حیرت
(۹)	ایک افسانے	احسان آوارہ
(۱۰)	اسلام و افکار	سبط محمد نقوی
(۱۱)	انیسویں صدی کے اردو [illegible]	ڈاکٹر شاہد حسین

(۱۱) آئینۂ خیال - نظیر الحسن خیال
(۱۳) برگ آوارہ - برگ بانڈوی
(۱۴) بکھلا ہوا درد ہاشم بریلوی
(۱۵) پیاسے جام نفعت بہرائچی
(۱۶) پیمان وفا احمد علی خاں وفا
(۱۷) تاریخ رئیسلاس مرتبہ ڈاکٹر اشفاق اعظمی
(۱۸) تاریخ و تحقیق الطاف حسین خاں
(۱۹) تحقیق و جستجو عبرت بہرائچی
(۲۰) تنظیم مدارس کے بنیادی محمد شریف خاں و
اصول آفاق احمد
(۲۱) تنقیدات ڈاکٹر نسیم شبنوی
(۲۲) جمال ادب ڈاکٹر محمد اشرف خاں
(۲۳) چراغ اندر چراغ نثار عباسی
(۲۴) چٹختی کلیاں مجاد حسین شاستری
(۲۵) یادگار فہیم فہیم گورکھپوری
(۲۶) حکیم سید فخر الدین خیالی
حیات و کارنامہ ڈاکٹر ہارون رشید
(۲۷) خاکے اور لکیریں نازش پرتاب گڑھی
(۲۸) خواجہ نظام الدین
حیات اور کارنامے حنیف فوق

۲۹) دستاویز الفت — طلعت صدیقی

۳۰) دیوان غزلیات سودا — ڈاکٹر ہاجرہ ولی

۳۱) دیوان ہوش — ہوش مچھلی شہری

۳۲) زیتون کا پیڑ — ایم کوٹھیاوی راہی

۳۳) سرشک حیات — سید فرحت

۳۴) سمندر پھر بلاتا ہے — عرفی آفاقی

۳۵) سنگ میل — موسیٰ مجروح

۳۶) سولیوں سے پرے — انصر کریم قدوائی

۳۷) سیتاپور کے غیر مسلم شعرا — وصی سیتاپوری

۳۸) شام گل — قمر مرادآبادی

۳۹) شب چراغ — حسن نجمی سکندرپوری

۴۰) شعلۂ زار — نذیر الحسن انصاری

۴۱) شعلۂ گل — ہندی گورکھپوری

۴۲) شفیق جونپوری — ایس۔ ایم عباس

۴۳) شہر جنوں — ہوش باندوی

۴۴) صحیفہ — شاہد حالی

۴۵) صریر خامہ — پیام فتحپوری

۴۶) طبیب کی ڈائری — خالد شمسی

۴۷) طبی کلیات — ڈاکٹر احتشام الحق قریشی

۴۸) عبد الحلیم شرر شخصیت اور فن — ڈاکٹر شریف احمد

۴۹) عظمت گلستاں — فضل نقوی

(٥٠) فراق کی شاعری — ڈاکٹر افغان اللہ خاں
(٥١) فردوس آرزو — مرتبہ سید محمد حسین
(٥٢) فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات — ڈاکٹر عبیدہ خاتون
(٥٣) کانٹوں کی خوشبو — فیروز ظفر
(٥٤) کائنات روشن — روشن بنارسی
(٥٥) کتاب غزل — نذیر بنارسی
(٥٦) کیف غم — عزیز بارہ بنکوی
(٥٧) گلدستہ — جوہر رحمانی
(٥٨) گنگ و جمن — ماہر بریلوی
(٥٩) متاع ہنر — شاعر فتحپوری
(٦٠) مضامین ڈاکٹر عبدالودود — مرتبہ صفیہ ودود
(٦١) معالجات ضعف تولید — علی حیدر جعفری
(٦٢) معراج غزل — معراج وارثی
(٦٣) مواہب یزدانی — مرتبہ فیضان احمد
(٦٤) موج تبسم — عطا حسین عطا مرحوم
(٦٥) موم کا پتھر — جلیس سہسوانی
(٦٦) مہدی افادی — ڈاکٹر فیروز احمد
(٦٧) میر کی شعری لسانیات — ڈاکٹر قاضی افضال حسین
(٦٨) ناگزیر — اصغر مہدی ہوش
(٦٩) نبض — حکیم خلیل احمد
(٧٠) نظم معرا اور آزاد نظم — ڈاکٹر حنیف کیفی
(٧١) نقش دوام — عمر انصاری

مارچ میں ۵۰ کتابوں کی اشاعت

اردو اکادمی کا پروگرام

اترپردیش اردو اکادمی نے موجودہ مالی سال کیلئے اشاعت کتب کا جو نشانہ مقرر کیا تھا۔ وہ مالی سال کے اختتام سے پہلے پورا ہو جائے گا۔ اسی مارچ کے مہینے میں وہ پچاس کتابیں شائع کر رہی ہے۔ جن میں سے ۳۴ کتابیں پریس کے سپرد کی جا چکی ہیں۔

زیر اشاعت کتب میں فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، حضرت آسی غازی پوری، حسرت موہانی اور صفی لکھنوی کے کلام کا الگ الگ انتخاب بھی شامل ہے۔ جن کتابوں کا عکس شائع کیا جا رہا ہے۔ ان میں دیوان غالب کا "نسخہ حمیدیہ" اور مولوی کریم الدین کا تذکرہ "طبقات شعرائے ہند" بھی شامل ہے یہ دونوں کتابیں کمیاب نہیں بلکہ نایاب ہیں

۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۶ء تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سالانہ جلسوں میں جو صدارتی خطبات تحریر کیے گئے تھے ان کا اردو متن "خطبات آزادی" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اکادمی کے مقاصد میں یہ امر بھی شامل ہے۔ کہ مجاہدین آزادی کے کارناموں سے نئی نسل کو روشناس کرایا جائے۔ اس سلسلے میں مولانا حسرت موہانی کو اولیت دی گئی ہے ان کے نایاب اخبار "مستقل" کانپور کا انتخاب اکادمی شائع کر چکی ہے۔

مولانا حسرت موہانی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے چھ جلدوں میں انتخاب سخن کے نام سے کوئی دو سو کلاسیکی اور جدید شاعروں کے کلام کا انتخاب شائع کیا تھا۔ اس انتخاب میں اگر ایک طرف شاہ حاتم اور ولی کو جگہ دی گئی ہے۔ تو دوسری طرف اسرار الحق مجاز کی بھی ترجمانی کی گئی ہے۔ انتخاب سخن اب نایاب ہے۔ اکادمی اب اسے بھی شائع کر رہی ہے۔

اکادمی حوالے کی جو کتابیں شائع کر رہی ہے، ان میں لالتا پرشاد شفق لکھنوی کی سات سو سے زائد صفحات پر مشتمل نایاب "فرہنگ شفق" بھی شامل ہے۔

اس فرہنگ کی خصوصیت یہ ہے کہ روزمرہ اور محاورے کی سند ناسخ۔ آتش۔ غالب اور ذوق کے کلام سے پیش کی گئی ہے۔

قیمتوں کا تعین کرتے وقت اکادمی کے پیش نظر کاروباری منافع نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ بعض اہم بنیادی کتابیں لاگت سے کم قیمت پر فروخت کرتی ہے تاکہ اردو زبان و ادب کے ان شہ پاروں سے استفادے کی راہیں وسیع ہو سکیں۔

اردو اکادمی کے زیر اہتمام

منشی دیا نرائن نگم پر سیمینار

اتر پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام مشہور رسالے زمانہ کانپور کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم پر ۲۲ مارچ ۱۹۸۳ء کو ایک سیمینار منعقد ہو رہا ہے۔

اس سیمینار میں ملک کے مقتدر اہل قلم مقالات پیش کریں گے۔

اس موقع پر اکادمی منشی دیا نرائن نگم پر ایک کتاب بھی شائع کر رہی ہے۔

فراق گورکھپوری پر دو روزہ سیمینار

اتر پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام دو اور تین اپریل کو فراق گورکھپوری پر دو روزہ سیمینار منعقد ہو رہا ہے۔ جس میں ملک کے مشہور اہل قلم شرکت کریں گے۔ اور فراق کے فکر و فن کے مختلف گوشوں پر مقالے پیش کریں گے۔

پرویز شاہدی اور ملیح آبادی ایوارڈ ــــــ ظ۔ انصاری اور اعزاز افضل کو اعزاز

مغربی بنگال اردو اکادمی نے سال ۱۹۸۲ء کے لیے کل ہند پیمانے پر دس ہزار روپے کا پرویز شاہدی ایوارڈ اور [illegible] نے پر دس ہزار روپے کا مولانا ملیح آبادی ایوارڈ بالترتیب جناب ظ۔ انصاری [illegible] اور جناب اعزاز افضل (کلکتہ) کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اکادمی کے مسلمہ [illegible] علمی شخصیتوں کو بھیجے گئے [illegible] [illegible] کی بنیاد پر [illegible]

مدراس میں ترقی اردو بیورو کا تربیتی مرکز خوشنویسی

ترقی اردو بورڈ کی سفارش کے مطابق شہر مدراس میں اس کی علمی [illegible] صحافتی اہمیت اور ضروریات کے پیش نظر ترقی اردو بیورو نے کتابت کا ایک تربیتی مرکز ریجنل اینڈ کلچرل فاؤنڈیشن آف ساؤتھ انڈیا کے تعاون سے قائم کیا گیا ہے۔ جہاں ہر سال [illegible] طالب علم اردو کتابت کی تربیت حاصل کریں گے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو نے ۱۱، ۱۲ دسمبر کو مدراس کا دورہ کرکے طالب علموں کے انتخاب اور استادوں کے تقرر کو بھی قطعیت دے دی ہے۔

اتر پردیش اردو اکادمی ملازمین یونین کا سالانہ انتخاب

نتائج مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ جناب علی باقر زیدی صدر بلا مقابلہ
۲۔ جناب حسین احمد نائب صدر بلا مقابلہ
۳۔ جناب علیم اللہ صدیقی سکریٹری
۴۔ جناب فدا حسین حسینی جوائنٹ سکریٹری
۵۔ کماری شان الاسلام جوائنٹ سکریٹری
۶۔ جناب عقیل احمد خزانچی بلا مقابلہ

اردو اکادمی اسٹاف کلب کے نئے صدر و سکریٹری

اردو اکادمی اسٹاف کلب کا ایک جلسہ [illegible]
کلب کے صدر جناب علی باقر [illegible] سکریٹری [illegible]

اکادمی میں استقبالیہ اور الوداعیہ تقریب

اترپردیش اردو اکادمی میں فروری کی ۱۹ تاریخ نہ صرف ایک ملے جلے جذبات کا دن تھا بلکہ اس دن ایک ایسی فضا بھی محسوس ہو رہی تھی جو عموماً کسی سیلاب کے گزر جانے یا آنے سے پہلے ہوتی ہے۔

ایک طرف تو اکادمی کے سابق سکریٹری جناب عزیز الجبار خاں تقریباً ڈیڑھ سال تک اپنے فرائض انجام دینے کے بعد ڈیولپمنٹ اتھارٹی میں سکریٹری ہو کر آگرہ جا رہے تھے، تو دوسری جانب جناب ستیش چندر سریواستو جو اب تک سول سکریٹریٹ کے محکمہ منصوبہ بندی میں انڈر سکریٹری تھے، اردو اکادمی کو اپنے طویل تجربے اور منصوبہ بندی کی بے پناہ صلاحیتوں سے مستفیض کرنے کے لیے سکریٹری کی حیثیت سے آ رہے تھے۔ چنانچہ اس موقع پر اردو اکادمی ملازمین یونین کی جانب سے الوداعیہ/استقبالیہ کی مشترکہ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔

تقریب میں اسٹاف کے علاوہ جناب علی جواد زیدی، جناب رام لعل، جناب صباح الدین عمر، اور جناب عمر انصاری صاحب موجود تھے۔

جلسہ کی نظامت کے فرائض جناب اطہر مسعود صاحب (پبلیکیشن آفیسر) نے انجام دئے۔ اپنے ابتدائی کلمات میں اطہر مسعود صاحب نے کہا کہ جناب عزیز الجبار خاں کے تقرر کے بعد اکادمی میں حرکت و عمل کی فضا اکادمی کے اندر اور باہر بھی بن گئی تھی۔ اور اب جبکہ ایک نئی فضا پیدا ہو رہی ہے ہم نئے سکریٹری صاحب کو اکادمی کے اسٹاف کی جانب سے پورے تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔ اکادمی کے سپرنٹنڈنٹ جناب اویس [illegible] اور محترمہ شان اسلام نے عزیز الجبار خاں کی رفاقت کے سلسلے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ جناب علی جواد زیدی (صدر اکادمی) جناب رام لعل اور جناب صباح الدین عمر صاحب جناب عزیز الجبار خاں صاحب کی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے

جذبات کا اظہار کیا۔ جناب ستیش چند رسر یواستوا نے اپنی تقریر کے آغاز میں بتایا کہ وہ نہ صرف اردو اور فارسی کے طالب علم رہے ہیں بلکہ خاندانی طور پر بھی ان کی رگوں میں اردو کا خون دوڑ رہا ہے۔ انھوں نے اس کا یقین دلایا کہ اکادمی کے اسٹاف کے تعاون سے وہ اردو اکادمی کے قیام کے بنیادی مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو کے عوام کی امنگوں کے مطابق اپنے فرائض کو انجام دینے کی پوری کوشش کریں گے۔

اکادمی ملازمین یونین کے صدر جناب علی باقر زیدی نے اپنی تاثراتی اور جامع تقریر میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ آج کی یہ تقریب ہماری قومی تہذیب کی ایک کڑی ہے جو محبت، انسان دوستی اور رواداری کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اکادمی کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ یہاں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باصلاحیت ملازمین جس تندہی سے رضاکارانہ انداز میں کام کرتے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے اکادمی کے ارباب اختیار کو بھی ان کی مشکلات و مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے ہمدردی سے غور کرنا چاہیے۔ انھوں نے عزیز الجبار خاں صاحب کے دور کے آخری ایام میں ملازمین کے حق میں کیے جانے والے کچھ فیصلوں کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ ہم عزیز الجبار خاں صاحب کو عزت و احترام کے ساتھ رخصت کرتے ہیں اور نئے سکریٹری جناب ستیش چندر سریواستوا کا اس امید کے ساتھ کھلے دل کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں کہ وہ ملازمین کے مفاد کا بھی خیال رکھیں گے۔ جہاں تک تعاون کا سوال ہے اکادمی کے جملہ ملازمین کے تعاون کا ہم ان کو یقین دلاتے ہیں۔"

جناب عزیز الجبار خاں صاحب نے اپنی تقریر میں اکادمی کے اسٹاف اور مجلس انتظامیہ و کونسل کے معزز ممبران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میرے بارے میں جن تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے اس سے میں بہت متاثر ہوں اور اس ادارہ میں جو تعاون اور محبت مجھے حاصل ہوئی وہ میری پوری سروس میں کبھی اس سے

باقی صفحہ

۱۹۸۲ء میں طبع شدہ کتابوں پر اتر پردیش اردو اکادمی کے انعامات

پانچ پانچ ہزار روپے کے تین انعامات:- (خصوصی)

۱- محترمہ قرۃ العین حیدر

۲- جناب غلام ربانی تاباں

۳- جناب راجندر سنگھ بیدی

تین تین ہزار روپے کے انعامات:-

۱- جناب مالک رام (دہلی) تذکرہ معاصرین (حصہ چہارم)

۲- جناب پروفیسر نبی ہادی (علی گڑھ) مرزا بیدل

دو دو ہزار روپے کے انعامات:-

۱- خواجہ احمد عباس (بمبئی) نیلی ساڑی

۲- ڈاکٹر محمد حسن (دہلی) معاصر ادب کے پیش رو

۳- جناب مسعود اختر جمال (ریسرچ [illegible] الہ آباد) کاروان آزادی

۴- جناب عمر انصاری (لکھنؤ) نقش دوام

۵- جناب نہال رضوی (لکھنؤ) شہر غزل

۶- ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی (لکھنؤ) علم و آگہی

۷- ڈاکٹر حامدی کاشمیری (سری نگر) کارگہ شیشہ گری

۸- ڈاکٹر حنیف کیفی (دہلی) اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم

۹- ڈاکٹر صبیحہ انور (لکھنؤ) اردو میں خود نوشت سوانح حیات

۱۰- ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں (لکھنؤ) اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء

۱۱- جناب [illegible] (دہلی) کتاب غزل

۱۲- جناب ضیاء الحسن فاروقی (دہلی) حضرت [illegible] نقادی
۱۳- پروفیسر [illegible] (جموں) لسانی [illegible]
۱۴- جناب ساحر ہوشیارپوری (دہلی) حرفِ سحر
۱۵- ستیش تبرا (فرید آباد) الٹے لمحے
۱۶- جناب محمد گل خاں شاہین (بدایوں) بہارِ سیرت

ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے کے انعامات:-

۱- ساغر مہدی (سپارنگر، بہرائچ) حرفِ جاں
۲- ڈاکٹر یعقوب عامر (دہلی) اردو کے ادبی معرکے
۳- حسن نجمی سکندرپوری (بلیا) شب چراغ
۴- جناب قاضی انیس الحق (گورکھپور) سب رس جدید اردو میں
۵- جناب تسنیم فاروقی (لکھنؤ) پیوند پیوند اجالے
۶- جناب کفایت سہائے بلگرامی (لکھنؤ) صبحِ چمن
۷- راجہ بہادر موریہ (فتح گڑھ) ساگر
۸- جناب سہیل احمد زیدی (الہ آباد) بولتی لکیریں
۹- جناب ساحر لکھنوی (لکھنؤ) ہم تم
۱۰- جناب بشیر فاروقی (لکھنؤ) سناٹوں کے درمیاں
۱۱- جناب خورشید افسر بسوانی (بسواں) دوپہر
۱۲- پروفیسر ولی الحق انصاری (لکھنؤ) فروغِ شعلۂ دل
۱۳- محترمہ عائشہ صدیقی (لکھنؤ) [illegible]
۱۴- محترمہ مسرور جہاں (لکھنؤ) بوڑھا [illegible]

ایک ایک ہزار روپے کے انعامات

۱۔ جناب ناصر عباس منظر (امرتسر) مقام فنا
۲۔ ڈاکٹر زبیدہ عقیل (الہ آباد) اردو ناولوں میں سوشلزم
۳۔ ڈاکٹر حبیب ہیجی (سرینگر) حرف جستجو
۴۔ ڈاکٹر منظر اعظمی (جموں) تلاش تعبیر
۵۔ ڈاکٹر صفیہ پروین (لکھنؤ) اصغر گونڈوی حیات اور شاعری
۶۔ ڈاکٹر سید حامد حسین (بھوپال) تحقیق اور حاصل تحقیق
۷۔ جناب زبیر اول فلک (دہلی) حرف صدا
۸۔ جناب سبط محمد نقوی (فیض آباد) اعلام و افکار
۹۔ جناب سلطان احمد نادم (لکھنؤ) کرنوں کے زاویے
۱۰۔ جناب اکرم دھولیوی (دھولیہ) نقوش جاوداں
۱۱۔ جناب شاداں بارہ بنکوی (لکھنؤ) لفظوں کے چراغ
۱۲۔ جناب فیروز سلطان اعجاز (کلکتہ) تنہائیاں
۱۳۔ جناب عبدالسمیع خان نکہت (شاہ جہاں پور) خضریات
۱۴۔ جناب اطہر نبی (لکھنؤ) مژگانِ تر
۱۵۔ جناب رئیس انصاری (لکھنؤ) تجربوں کی دھوپ
۱۶۔ جناب کرم چند مہاجن (پٹھان کوٹ) پرایا مرد
۱۷۔ " یعقوب یاور کوٹی (بھوپال) [illegible]
۱۸۔ محترمہ عفت موہانی (حیدرآباد) آخریا
۱۹۔ جناب کشمیری لال ذاکر (چنڈی گڑھ) لمحوں میں بکھری زندگی
۲۰۔ ڈاکٹر داود [illegible] (مرادآباد) [illegible] سر دور
۲۱۔ جناب اکرم [illegible] پتوں کا موسم

۲۲۔ جناب عطا اللہ پالوی (گیا) اسد کے ہندو مثنوی نگار

۲۳۔ ڈاکٹر شبیر احمد قادر آبادی (لکھنؤ) ہریانہ بانی صاحب عہد مغلیہ میں

۲۴۔ جناب کبیر احمد جائسی دسری نگر) علامہ اقبال (ترجمہ)

۲۵۔ ڈاکٹر نور الحسن انصاری (دہلی) مرقع دہلی

۲۶۔ جناب اطہر پرویز (علی گڑھ) محمد شفیع الدین نیر

۲۷۔ جناب ڈاکٹر شمیم حنفی (دہلی) بچوں کا جہاز

۲۸۔ جناب مجیب سہالوی (لکھنؤ) باتوں کے بادشاہ

۲۹۔ " فضل حسین (الہ آباد) رسوا سر بازار

۳۰۔ " محمد یوسف پاپا (دہلی) دیوار قہقہہ

۳۱۔ " قیوم خضر (پٹنہ) خضر راہ

۳۲۔ " شانتی رنجن بھٹاچاریہ (کلکتہ) اردو ادب اور بنگالی کلچر

۳۳ " افضال احمد (علی گڑھ) علم الجنین (طب)

۳۴۔ " غیاث الدین احمد (حیدر آباد) نفسیات

۳۵۔ ڈاکٹر اخلاق اثر (دہلی) نشریات اور آل انڈیا ریڈیو

۳۶۔ جناب انیل ٹھکر (دہلی) خالی خانے

۳۷۔ " باوا کرشن گوپال مغموم (امرتسر) درگا سبھائے سرور جہاں آبادی

ساڑھے سات ساڑھے سات سو کے انعامات :-

۱۔ جناب اخلاق حسین عارف (لکھنؤ) کشت فکر

۲۔ " ڈاکٹر صباح الحسن قیصر (لکھنؤ) رتن ناتھ سرشار

۳۔ مولانا عزیز الحق کوثر ندوی (دار المصنفین) اصول بلاغت

۴۔ ڈاکٹر ظفر رضوی (حق ویدک) نقد و سخن

۵۔ جناب بدیع الزماں خاور (رتناگری) اپھار اشتر کی تہذیبی اور ادبی قدریں

۶۔ " رئیس الدین فریدی (کلکتہ) سبزۂ و گل

۷۔ " حافظ عبدالشکور خاں حافظ (میرٹھ) معراج زندگی

۸۔ " ڈاکٹر شاہ عبدالسلام (لکھنؤ) کلیات شہزادہ سلیمان شکوہ

۹۔ " خورشید جنیدی (حیدرآباد) آتش گفتار

۱۰۔ " کاظم جردلی (لکھنؤ) کوچ اور قندیلیں

۱۱۔ " محمد علی زور آغائی (حیدرآباد) زور سخن

۱۲۔ " سعید سہروردی (حیدرآباد) آفتاب غزل

۱۳۔ " محمد صالح شاد قادری (بدایوں) آئینۂ جذبات

۱۴۔ " ہاشم عظیم آبادی (پٹنہ) انداز بیاں اور

۱۵۔ " دنکر راؤ دیش مکھ (حیدرآباد) یادش بخیر

۱۶۔ " نصرت گوالیاری (دہلی) سائبان

۱۷۔ " ایم کوٹھیاوی راہی (گورکھپور) زیتون کے پیڑ

۱۸۔ " شمیم امروہی (مرادآباد) انیس سو بیاسی عیسوی

۱۹۔ " غلام حسین راز بالاپوری (اکولہ) متاع احساس

۲۰۔ " جاوید اکرم (فتح گڑھ) نیم تراشیدہ صنم

۲۱۔ " ہارون شامی (فیض آباد) شرح آرزو

۲۲۔ " ابرار اعظمی (اعظم گڑھ) جوہر آئینہ

۲۳۔ " حبیب مغموم (کان پور) تیرا میرا غم

۲۴۔ " ابو ایوب انصاری [illegible] (جھانسی) فردصیاں

۲۵ " شفق سہسرام) کانچ کا بازیگر

۲۶۔ جناب بی ڈی کالیہ ہمدم (ہمیرپور) کس نام سے پکاروں

۲۷۔ 〃 ابواللیث جاوید (آرا) کایا کلپ

۲۸۔ 〃 اکرام جاوید (حیدرآباد) خاک گزیدہ

۲۹۔ 〃 ڈاکٹر دبیر احمد (فیض آباد) شہر اولیا

۳۰۔ 〃 محمد امین (دہلی) مغربی افریقہ کی کہانیاں

۳۱۔ 〃 سیفی پریمی (دہلی) پہیلیاں

۳۲۔ محترمہ آصفہ مجیب (دہلی) خرگوش کی چال

۳۳۔ 〃 سید عبدالباری (سلطان پور) عملی اردو

۳۴۔ 〃 جاوید دانش (کلکتہ) پردیس

۳۵۔ 〃 اشفاق محمد خاں (دہلی) عوامی ذرائع ترسیل

۳۶۔ محترمہ سعیدہ بہاء الدین (حیدرآباد) عبدالرحمٰن بجنوری

۳۷۔ 〃 ہمت رائے شرما (بمبئی) نکات زبان دانی

۳۸۔ 〃 نعیم اللہ خیالی (بہرائچ) اردو کی بین الاقوامی حیثیت

۳۹۔ 〃 حکیم النصر (مرادآباد) دانتوں اور مسوڑھوں کے امراض کا علاج (طب)

۴۰۔ 〃 طیب انصاری (گلبرگہ) گل برگ سے گل مرگ تک

۴۱۔ 〃 سلیم تمنائی (میسور) دانائے راز دیار دکن میں

۴۲۔ 〃 قیصر سرمست (حیدرآباد) جنگل کا سرمایہ

۴۳۔ 〃 قطب اللہ (لکھنؤ) گونگی توپ

۴۴۔ 〃 ڈاکٹر محمد انس (علی گڑھ) صابون کا محل

۴۵۔ 〃 یوسف کمال (حیدرآباد) زمین کی کہانی

۴۶۔ 〃 کیدارناتھ کومل (دہلی) اجنبی

۴۷۔ جناب مسعود الحسن عثمانی (لکھنؤ) طوفان سے ساحل تک

۴۸۔ " ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی (لکھنؤ) جوش کی انقلابی نظمیں

۴۹۔ محترمہ ڈاکٹر طلعت سلطانہ (علی گڑھ) شاد عظیم آبادی

۵۰۔ " ڈاکٹر خلیل اللہ خاں (لکھنؤ) انتخاب کلیات ریاض خیر آبادی

ناشر کے لیے انعام :۔

۱۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ — ایک ہزار روپے

بہترطباعت پر انعام :۔

۱۔ نامی پریس (لکھنؤ) — ایک ہزار روپے

۲۔ نشاط پریس — پانچ سو روپے

کتابت کے لیے انعام :۔

۱۔ جناب ایس ایم مظہر (الہ آباد) — ایک ہزار روپے

۲۔ " شفیق احمد فاروقی (لکھنؤ) — پانچ سو روپے

اکادمی ملازمین یونین کی مجلس انتظامیہ کی تشکیل

اکادمی ملازمین یونین کی جنرل کاؤنسل کی میٹنگ زیر صدارت جناب اے۔آر۔خاں سرپرست یونین، ۲۸ مارچ ۸۲ء منعقد ہوئی جس میں مجلس انتظامیہ کی تشکیل عمل میں آئی نام حسب ذیل ہیں:

(۱) جناب اظہر مسعود رضوی (۲) جناب اویس احسن قدوائی (۳) جناب احسن قدوائی (۴) جناب عبدالحبیب (۵) محترمہ نکہت رانی الفت (۶) جناب سید والجد حسین (۷) جناب محمد یونس رحمانی (۸) جناب ٹھاکر سنگھ (۹) جناب رضوان احمد

اتر پردیش اردو اکادمی خبر نامہ کے بارے میں تفصیلات

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ — ۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ کی دفعہ ۱۹۰۵ کے قاعدہ کے مطابق ماہنامہ اتر پردیش اردو اکادمی کی ملکیت سے متعلق تفصیلات

۱۔ مقام اشاعت:	لکھنؤ
۲۔ وقفۂ اشاعت:	ماہنامہ (ہر تیس دن کے بعد)
۳۔ پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ:	ستیش چندر سریواستو (ہندوستانی) سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ
۴۔ پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ:	ستیش چندر سریواستو (ہندوستانی) سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی لکھ
۵۔ ایڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ:	ستیش چندر سریواستو (ہندوستانی) سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ
۶۔ ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمائے کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں۔	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ اردو اکادمی خبر نامہ، اتر پردیش اردو ا لکھنؤ کا ماہانہ پرچہ ہے اس لیے اس کے میں ان اصحاب کے نام اور پتے جو ا پرچے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس پونجی کے ایک فی صدی سے زیادہ حصہ دار ہیں کا سوال ہی نہیں پیدا ہو

میں ستیش چندر سریواستو اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم ا کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط)

ستیش چندر سریواستو



سابق سکریٹری کو الوداعیہ اور نئے سکریٹری کا استقبالیہ

اردو اکادمی ملازمین یونین کی جانب سے ۱۹ر فروری ۱۹۸۳ء کو اکادمی ہال میں جناب عزیز الجبار خاں سکریٹری اکادمی کو (جن کا اب آگرہ ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے تبادلہ ہوگیا ہے) الوداعیہ دیا گیا اور اکادمی کے نئے سکریٹری جناب ستیش چندر سری واستو کا استقبال کیا گیا۔ تصویر میں (داہنی طرف سے) جناب علی جواد زیدی صدر اکادمی، جناب عزیز الجبار خاں اور جناب ستیش چندر سری واستو تقریر کر رہے ہیں (بالکل بائیں طرف) جناب اظہر مسعود جنھوں نے اس تقریب کی نظامت کی، تقریر کرتے ہوئے۔

خبرنامه



اتر پردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

جلد ۱۱ شمارہ ۱۱

مئی سنہ ۱۹۸۳ء

نگراں

پروفیسر محمود الٰہی

سالانہ چندہ: پانچ روپے
فی شمارہ: ۵۰ پیسے

تصویر سرورق: راجندر سنگھ بیدی، جن کی مجموعی ادبی خدمات پر اکادمی نے انھیں خصوصی انعام پیش کیا۔ (تصویر سنے بخشی)

ستیش چندر سریواستو، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے دفتر اتر پردیش اردو اکادمی قیصر باغ لکھنؤ سے شائع کیا اور نامی پریس لکھنؤ نے طبع کیا۔

ترتیب

اداریہ

اُردو کی تعلیم اور اکادمی

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اتر پردیش میں اردو تعلیم کے مسائل خاطر خواہ طور پر حل نہیں کیے جا رہے ہیں۔ اتر پردیش اردو اکادمی حکومت کو برابر ان دشواریوں سے باخبر کرتی آئی ہے جو اردو تعلیم کے راستے میں حائل ہیں۔ اب تک اکادمی کے بجٹ میں تعلیمی مسائل کے لیے الگ سے رقم مختص نہیں تھی۔ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ بجٹ کی عام مدوں کے سہارے کیا۔ ۸۴-۱۹۸۳ء کے مالی سال کے بجٹ میں اکادمی نے تعلیم کے لیے ایک مد قائم کی ہے۔ اس مد کی رقم میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا جلد ہی اکادمی منصوبہ مرتب کرے گی کہ تعلیم کے سیاق و سباق میں اسے کیا کرنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں اکادمی محبانِ اردو کے مشوروں کا خیر مقدم کرے گی۔

ہم نے بار بار ان کالموں میں لکھا ہے کہ حکومت کی طرف سے جو سہولتیں بھی مہیا ہیں، ان سے فائدہ اٹھانا چاہیئے اور زیادہ سے زیادہ طلبہ کو اردو کے درجات میں داخلہ دلانا چاہیے۔ نیا تعلیمی سال جلد ہی شروع ہوگا۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے اپنے علاقوں میں اردو پڑھنے والے طلباء اور طالبات کی تعداد بڑھانے کی کوشش کریں۔

محمود الٰہی

مقطع میں آ پڑی ہے.....

پیمانۂ ذوق تحسین

غالب نے کہا تھا،

نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرض صورت
سخن حق ہمہ پیمانۂ ذوق تحسین

اس شعر کا مفہوم تو اساتذہ بتائیں گے لیکن اس کے مظاہر کے جو نمونے سامنے آتے رہے ہیں، وہ بڑے دل چسپ ہیں.

ایک صاحب نے مرحوم شاعروں اور ادیبوں کی تعزیت کو پیمانۂ ذوق تحسین بنا لیا تھا۔ وہ کرتے یہ تھے کہ جیسے ہی کسی ادیب یا شاعر کے انتقال کی خبر سنتے تھے، فوراً اپنی صدارت میں ایک جلسہ منعقد کرتے تھے اور اس جلسے کی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ اس میں ان کے علاوہ اور کوئی شریک نہیں ہوتا تھا، دوسرے دن اخبارات میں اس تعزیتی جلسے کی روداد بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھی جس میں مرحوم کی ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ صاحب صدر کی ادب دوستی کا بھی ذکر ہوتا تھا۔

اس شعر کی تفسیر کا ایک اور نادر نمونہ دیکھتے چلیے۔ ایک صاحب نے شعر و ادب کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی۔ جب کسی نے ان کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا تو انھوں نے خود اپنی شان میں ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر کسی دوسرے کے نام سے شائع کرا دیا۔ اس تحقیقی مقالے میں جگہ جگہ اسباب کی دعوت دی گئی تھی کہ لوگوں کو ان کے فکر و فن پر داد تحریر دا گری کے لیے مقالات لکھ کر اردو زبان و ادب کا حق ادا کرنا چاہیے۔

——— نیاز من

ڈاکٹر شکیل احمد

راجندر سنگھ بیدی: ایک مُطالعہ

سعادت حسن منٹو نے ایک خط میں راجندر سنگھ بیدی کو لکھا تھا، "تمہاری مصیبت یہ ہے کہ تم سوچتے بہت زیادہ ہو، معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو لکھتے وقت سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد سوچتے ہو۔" بیدی کے فن پر منٹو نے برمحل بات کہی تھی۔ یوں تو ہر فن کار بغیر سوچے لکھ ہی نہیں سکتا مگر بیدی کے ساتھ معاملہ کچھ ایسا ہے کہ وہ بہت زیادہ ہی سوچتے ہیں۔ سستی انقلابیت اور جذباتیت سے ان کی تحریر پاک ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر قاری بہرحال بہت کچھ اور بہت دیر تک سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بیدی جو کچھ کہتے ہیں تجربے اور مشاہدے کے تعلق سے کہتے ہیں شروع میں قاری کی سوچ بیدی کے ساتھ چلتی ہے لیکن افسانے کے اختتام سے قبل قاری پیچھے رہ جاتا ہے، بیدی اپنی بات کہہ جاتے ہیں اور تب قاری کچھ دیر تک گہری سوچ میں ڈوب کر کسی نہ کسی نتیجے پر پہونچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اچھے افسانے کی خوبی یہی ہے۔ بیدی کو افسانے کے فن پر پورا عبور حاصل ہے۔ ان کا پہلا افسانہ "بھولا" اور اس کے بعد درجنوں افسانے پڑھ کر ہمیں اس بات کا یقین ہو جاتا ہے۔ کہ بیدی کسی محدود حلقے میں مقید نہیں ہیں اور نہ ہی اپنی تخلیقات کو کسی "ازم" اور نظریے کا مکمل پابند بننے دیتے ہیں۔ بیدی اپنی تخلیقات کی دنیا کس طرح تعمیر کرتے ہیں، خود ان کی ہی زبانی سنئے۔

"فن کسی شخص میں سوتے کی طرح نہیں پھوٹ نکلتا...

جا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں صلاحیتیں ہیں جن کا ہونا بہت ضروری ہے چاہے وہ جبلت میں ملیں اور یا وہ ریاضت سے ان کا اکتساب کرے۔ کوئی بھی چیز افسانے کے عمل کو چھیڑ سکتی ہے مثلاً کوئی راہ جاتا اس کی پگڑی اچھال دے، یا کوئی ایسا حادثہ پیش آ جائے جس پر اس غریب کا کوئی بس نہ ہو۔" (ص ۲۹

(اردو افسانہ، روایت و مسائل)

بیدی کے افسانوں میں اور ان کے ناول "ایک چادر میلی سی" میں جہاں ان کے فنی ادراک کا کمال ملتا ہے وہاں ان کی تہذیبی اور فکری وراثت کا بھی بہت زیادہ دخل ہے۔ بیدی عام طور پر اپنے افسانوں کی تعمیر میں کسی نہ کسی دیومالائی، تاریخی یا مذہبی واقعات کے پس منظر کا سہارا لے کر اس میں نئی جان پیدا کر دیتے ہیں۔ گرہن، من کی من میں، اندھ وغیرہ افسانوں میں اساطیری داستانوں کے متوازی پلاٹ تیار کیا گیا ہے۔ "اغوا" اور "لاروے" میں استعارے اور کنائے کے سہارے افسانوں کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس معاملے میں بیدی بہرحال منفرد ہیں۔ کم از کم اس وقت تک ضرور تھے جب سے انتظار حسین نے تاریخی واقعات کے پس منظر میں افسانے لکھنے نہیں شروع کیے تھے۔

بیدی کے افسانوں کا کچھ جداگانہ نقش تیار ہوتا ہے۔ بھولا، چھوکری کی لوٹ، گرم کوٹ اور رحمٰن دغیرہ میں بچوں کے نفسیات کا گہرا مطالعہ پیش کیا گیا ہے، خاص طور پر ان کے پہلے افسانے "بھولا" میں بچہ اپنے دادا سے سن کر سوچتا ہے کہ دن میں کہانی سننے سے رات کو مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ بھولا کے ماموں اس کے گھر آنے والے ہیں۔ رات دیر تک جب اس

کے ماموں نہیں آتے تو وہ سمجھتا ہے کہ دن میں کہانی سننے کی وجہ ہی سے ماموں راستہ بھول گئے ہیں اور وہ تاریک رات میں چراغ لے کر ان کی تلاش میں بہت دور تک چلا جاتا ہے اور واقعی اس کی ملاقات اپنے ماموں سے ہو جاتی ہے، جو سچ مچ راستہ بھول گئے تھے۔ اس افسانے میں بیدی نے بچے کی پاکیزہ نفسیات کا عمدہ مطالعہ پیش کیا ہے۔ بچے کی پر خلوص تنا ہیں لگتا ہے کہ ہر بھٹکے ہوئے کو راستہ دکھانے کی کوشش کرتی ہیں، بچے کے ساتھ ہی ساتھ اس کی ماں اور دادا کا کردار بھی کہانی کی فضا آفرینی میں مدد کرتا ہے۔

من کی من میں" مادھو کا کردار بھی بالکل طفلانہ قسم کا ہے۔ اس کا ہر ملاقاتی اسے کچھ یوں مخاطب کرتا ہے کہو "مادھو" من کی من میں رہی" اور یہ مادھو کی جواب میں بھی جواب دہرا تا ہے۔ "ہاں من کی من میں رہی" گرم کوٹ میں بھی بچوں کی خواہشات کی تکمیل کی فکر باپ کو ہے مگر ماں اپنے شوہر کے لیے گرم کوٹ کے لیے کپڑے کی خریداری کو اولیت دیتی ہے۔ وہ بچوں کو چپت لگا کر خاموش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ معصوم بچے تلملا کر رہ جاتے ہیں۔

— "پھر پپو، ببلی، منا اور میں شمی کے آگے پیچھے گھومنے لگے۔ اس نے میز پر بنڈل کھولا وہ میرے کوٹ کے لیے بہت نفیس سرژ تھا۔ پشپا منی نے کہا! بے بی میرے گلاب جامن؟ شمی نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگا دی۔"

دانہ و دام ص ۶۹-۷۶

بیدی کے یہاں یک رنگی نہیں۔ ان کے ہر افسانے میں کچھ انفرادی نقش ملتے ہیں۔ بچوں کی نفسیات کے علاوہ انھوں نے "عورت" کو اپنے اکثر افسانوں میں پیش کیا ہے۔ یہ پیش کش بھی عورت کے مختلف روپ کو نمایاں کرتی ہے

گھر گرہستی کی الجھنوں میں رومان اور جنس کی فضا میں ہر جگہ اس کی سانسوں کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ عورت گرہن میں اپنی تمام تر مجبوریوں کے ساتھ موجود ہے۔ اس کی فضا آفرینی میں راہل، کیتو اور چاند گرہن کی دیومالائی کہانی کے سہارے چار بچوں کی ماں ہونے کی نفسیاتی الجھنیں ہیں وہ سسرال میں بادلِ ناخواستہ ہی تلخ ایام گزار رہی ہے:

"کائستھوں کا تو بچے چاہئیں۔ ہولی جہنم میں جائے۔ گویا سارے گجرات میں یہ کائستھ ہی "کل ودھو" کا صحیح مطلب سمجھتے تھے بڑے کائستھ جب ڈانٹنے لگتے ہیں تو پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔ رسیلا کی بات دوسری ہے۔ شاستروں نے پرماتما کا درجہ دیا ہے۔ وہ جس چھری سے مارے اس چھری کا بھلا!"

گرہن ص۲

توہم پرست ساس کی ڈانٹ روایتی ساس سے ذرا بھی مختلف نہیں

"تو نے سرمہ کیوں لگایا ہے ری؟ رانڈ جانتی بھی ہے آج گہن ہے جو بچہ اندھا ہو جائے تو تیرے ایسی بیسوا اسے پالنے چلے گی؟" (گرہن ص۹)

توہم پرستی ہندوستان کے ہر معاشرے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ گجرات کے اس کائستھ خاندان کو مستثنیٰ نہیں سمجھا جا سکتا۔ بقول وقار عظیم "بیدی کو عورت کے لیے ہمدردی کا ایک لفظ کہنے کا موقع مل سکے تو یہ اس کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ہولی کی حالت زار ملاحظہ ہو:

"ہولی کو اجازت نہ تھی کہ وہ کوئی کپڑا پھاڑ سکے۔ پیٹ میں بچے کے کان پھٹ جائیں گے۔ وہ سی نہ سکتی تھی۔ منہ

سا بچہ پیدا ہوگا۔ اب وہ سسرال سے اتنا سیر ہو چکی تھی کہ
وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ چار بچوں، تین مردوں
دو عورتوں، چار بھینسوں پر مشتمل بڑا کنبہ اور اکیلی بہو تھی ۔ دوپہر
تک تو ہولی برتنوں کا انبار صاف کرتی رہی" ص

گرہن سے متعلق جو بھی عقائد ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ چاند ہو یا سورج، جب ان میں سے کسی پر گرہن لگتا ہے تو یہ ان پر برے وقت کی علامت ہوتے ہیں۔ اس برے وقت میں عبادت و ریاضت کے ذریعے ان کی مصیبت کے خاتمے کی دعا کے ساتھ ساتھ اپنی تطہیر بھی کی جاتی ہے لیکن اس عمل تطہیر پر بیدی کی نیم جذباتی اور طنزیہ لہجہ ملاحظہ ہو:

"ان گناہوں کا جن کا ارتکاب لوگ گزشتہ سال کرتے
رہے ہیں۔ اشنان سے سب پاپ دھل جاتے ہیں۔ بدن
اور روح پاک ہو جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ایک سال بعد پھر لوگوں
کے بدن گناہوں سے آلودہ ہو جاتے ہیں۔ پھر دریا کی ایک
لہر آتی ہے اور پھر پاک و صاف" ص

بیدی کی طنزیہ تحریر جو تلخ حقائق سے پر ہوتی ہے قاری کو اندر ہی اندر جذبات کی دھیمی آنچ میں سلگانے کا کام کرتی ہے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے لفظوں میں:

"وہ تمام جدید افسانہ نگاروں کے برخلاف، رومانیت
انقلابیت، جنس یا اسی نوع کے ہیجان انگیز تجربات سے ہٹ
کر زندگی کا مانوس اور چھوٹے چھوٹے مسائل کو اپنا موضوع بناتے
ہیں وہ کسی حقیقت کے فوری ردعمل کو بنیاد بنا کر خلا میں نہیں

اٹھنے لگتے ہیں ... وہ زندگی کے تاریک گوشوں میں بھی محبت، ہمدردی اور انسانیت کی وہ کرن دیکھ لیتے ہیں جس کی وجہ سے زندگی قابل برداشت ہو جاتی ہے۔"

(اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک صفحہ ۲۳۳)

گرہن کی ہی بابت پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"مجھے اب تک یاد ہے کہ گرہن کا پہلا ہی جملہ پڑھ کر ایک اہل زبان نے کہا تھا: یہ کون سی زبان ہے کیا یہ اردو ہے؟ اور مجھے کہنا پڑا تھا، ہاں یہ اردو ہے۔ لیکن ایک پنجابی نے لکھی ہے اور قصہ بحر عرب کے سواحل سے متعلق ہے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں سے نہیں۔ تنقیدی اشارے صفحہ"

"گرہن کے آخری جملے کچھ یوں ہیں:

"پھر شنکھ بجنے لگے، اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر بھاگی سرپٹ، بگٹٹ، وہ گرتی تھی، بھاگتی تھی، پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی تھی، ہانپتی اور دوڑنے لگتی۔ اس وقت آسمان پر پورا چاند گہنا چکا تھا۔ راہو اور کیتو نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا تھا۔"

گرہن صفحہ ۱۶

"جو گرمائی کی لاٹ" میں بھی ایک رسم کے سہارے افسانے کی ترتیب دی گئی ہے۔ ہر لڑکی عمر کے ایک حصے پر پہونچ کر پرائے گھر ہو بیاہی جاتی ہے۔ سگے بھائی بہن جو ایک دوسرے سے از حد پیار کرتے ہیں جدا نہیں ہونا چاہتے۔ لیکن بہن سسرال کے لیے الوداع کہہ دی جاتی ہے۔ بھائی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر "رتنی" سسرال کیوں چلی گئی۔ کیا اس میں اس کی مرضی کا بھی دخل ہے؟

پھر رتی میکے آئی کچھ دن رہ کر پھر سسرال کی ہو گئی۔ بھائی کو بات سمجھ میں آ گئی کہ یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آ رہا ہے، چاہے یا بغیر چاہے سبھی لڑکیاں لوٹ لی جاتی تھیں۔ رتنی کے بھائی پرسادی کو اس کی ماں سمجھاتی ہے۔ بالکل غیر احتجاجی انداز میں مصالحت سے بھرپور انداز میں:

"بیٹا! یہ رسم آج سے نہیں جب سے دنیا بنی ہے چلی آئی ہے"
اب کی جو رتنی آئی تو پرسادی نے چھوکری کی لوٹ سے متعلق اپنا نظریہ بالکل الٹ دیا: در اصل یہ لوٹ سب کے لیے اچھی ہوتی ہے۔ تائی، اماں، جگت گورو جی اور خود رتنی بھی اسے پسند کرتی ہے۔ رتنی نے اسے جیجا کی طرح دبلا پتلا مگر اپنی طرح کا گورا چٹا منا کھیلنے کے لیے لا دیا تھا۔" دانہ و دام ص۵۹

زندگی کے اس موڑ پر جہاں لڑکی اپنے والدین سے بچھڑ کر نئے گھر میں قدم رکھتی ہے اور اپنے اوپر نئے گھر کی بہت ساری ذمہ داریاں سنبھالنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس سے وابستہ تلخ واقعات بیدی کے افسانے میں ملتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہندو گھرانوں میں مروجہ رسم و رواج اور واقعات کی سچی اور بے لاگ تصویریں ملتی ہیں۔ چھوکری کی لوٹ کا ہی ایک اقتباس پیش نظر ہے:

"پرسادی نے دیکھا۔ اتنی آپے سے باہر ہو رہی ہے۔ پرسادی کی ماں نے اسے بتایا کہ چھوکری کی لوٹ کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ تمہاری رتنی بہن کو کوئی لوٹ کر لے جائے گا۔۔۔ اسے سر سے پاؤں تک اپنی ہی ملکیت بنا کر ڈولی میں بٹھا چلے دے اور بڑے شور و غوغا کے ساتھ اور پھر گھر میکے آ گئی

"چابلداد سمیٹ کرلے جائے۔" (دانہ ودام ۴۰)

پرسادی کی ماں جس انداز سے بچے کو رسم ورواج کے تعلقات سے روشناس کرا رہی ہے اس میں دیرینہ تجربہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ معاشرے کے سامنے بے دست و پا ہو کر اس کے اشارے پر چلنے کو تیار رہتی ہے۔ بچے کی نفسیات کی عمدہ ترجمانی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"جب رتنی چلی گئی تو پرسادی اسی بجھے ہوئے تنور پر اداس خاطر بیٹھا ادھیڑ بن کرتا رہا۔ ... رتنی بھی تو یہی کہتی تھی کہ تمہارا چچا ملو کنھیا ہے کبھی کسی کے دو دو چچے بھی ہوتے ہیں۔ میں تو ملو کنھیا کو ہی چچا کہوں گا اس مردوے کو کبھی نہیں۔"

عورت کا ایک روپ ایک پیکر "من کی من میں" امبو کا اور کلکارنی کا بھی ہے مادھو اپنی پڑوسن بیوہ امبو کا صرف انسانی اخوت کے جذبے کے سبب کام آتا ہے۔ اس کی مشکلات میں معاون بنتا ہے۔ مادھو کی بیوی کلکارنی کو یہ خدمت خلق ہرگز پسند نہیں۔ اسے اپنے شوہر سے بدگمانی رہا کرتی ہے۔ مادھو بڑا ہی رحم دل ہے اسے عورت کی حیثیت کا اپنے طور پر جو احساس ہے وہ کچھ یوں ہے۔ اپنے دوست گریب داس سے کہتا ہے:

"بھائی گریب داس! اگر دنیا عورت کی بجائے آدمی کے پیٹ سے پیدا ہونے لگے تو دیا، پریم اور نرمی کا نام ہی نہ رہے۔ عورت آدمی کو اپنی کوکھ سے جنم دے کر اس کے اکھڑپن کو دور کر دیتی ہے۔"

(دانہ ودام ۵۶)

مکر سنکرانت کے موقع پر مادھو بیس روپے گھر سے لے کر نکلتا ہے بیوی کے زیور خریدنے کے لیے لیکن خرچ کر دیتا ہے امبو بیوہ کی حاجت روائی میں کلکارنی اسے

کی حرکت پر سخت ردعمل کا اظہار کرتی ہے۔ بیدی نے یہاں بھی تاریخی اور مذہبی روایات کے پس منظر میں کہانی کے کرداروں کو پیش کیا ہے۔ ایک طرف وہ کرشنا کانت کے فلسفے کا حوالہ دیتے ہیں اور دوسری طرف ٹھیک اسی وقت اس دنیا کے فرسودہ کی واہیات حرکتوں پر طنزیہ انداز تحریر پیش کرتے ہیں۔

"جب کلکارنی کی بہو کی مانگ میں پڑوس کی ایک دلہن نے سیندور لگایا تو امبو وہیں کھڑی رہی سہاگن کے پاس بیوہ کھڑی ہے۔ رام رام ۔"

دانہ و دام ص۲۵

"سنکرانت کی دیوی نے سماج کے کلنک یعنی امبو کے باپ کے سوا تمام دنیا میں سے پاپ کی بیخ کنی کے لیے اپنی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھوں کو پھیلا اور ترشول تان کر دنیا کا سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ادلی بدلی کرتے ہوئے دراز سے دراز اور سیاہ سے سیاہ زبان رکھنے والی عورت بھی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو۔"

ص۵۰

اور مادھو کا نظریہ کیا ہے:

"کسی بھائی بہن کو دکھی دیکھ کر مجھ سے مدن اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں نہ گائے جائیں گے۔"

ص۵۱

"من کی من میں" عورت کے دو روپ ہیں۔ دونوں صحیح ہیں۔ امبو بیوہ ہے وہ اپنے کو ابھاگن سمجھنے پر مجبور ہے۔ خوشی کے مواقع پر جب میٹھا میٹھا کھاؤ اور بولو کا دم بھرا جاتا ہے امبو کو اس موقع پر بھی حاضری کا موقع نصیب نہیں ہوتا۔ سماج کے بنائے کھوکھلے اصول الگ ہی رکھے رہتے ہیں صرف زبانی پندار کے لیے عملی زندگی میں اس کا بھونڈا پن جھلکتا ہے جو کہ بیدی کی اوٹ میں۔ "من کی من میں" اور کو انشین میں ہوتا ہے۔

ادھورے قدرے مختلف اور اس سے بھی زیادہ واضح انسانی خدمت کا جذبہ لیسانیو تھیم بھاگو رکھتا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے بھاگو کروب ہے۔ کوارنٹین میں ڈاکٹر کے ساتھ پلیگ کے زمانے میں کام کرتا ہے۔ وہ موت و اندوہ کے ماحول میں بھی ڈاکٹر سے زیادہ پرسکون اور زیادہ انسانیت نواز نظر آتا ہے۔ اسے اپنی موت کا مطلق خوف نہیں ہے۔ آخر کار پلیگ کی بیماری خود اس کی بیوی کو لاحق ہو جاتی ہے ڈاکٹر موقع پر نہیں پہنچ پاتا اور یوں اس کی بیوی اور بچہ مناسب علاج نہ ہونے کے سبب مر جاتی ہے پھر بھی بھاگو ایثار اور ہمدردی کی مثال سے باز نہیں آتا۔ شہر میں ڈاکٹر کی انسان دوستی کے اعتراف کے طور پر اعزاز دیا جاتا ہے۔ ولیم بھاگو کا کوئی نام تک نہیں لیتا۔ حالانکہ بڑا انسان ڈاکٹر نہیں بھاگو ہے جو ان کے عمل سے ثابت ہوا۔ شاید یہ ناانصافی صدیوں سے چلی آرہی ہے اور شاید بہت صدیوں تک چلتی رہے۔ بھاگو کا استعارہ قابل رشک ہے۔

”نہیں بابو جی۔ آپ کا بال بھی بیکا نہ ہو گا جب میری آئی ہو گی تو آپ کی دعا دوا بھی اثر نہ کرے گی۔

کل آج ایک مریض جو بیماری کے خوف سے بے ہوش ہو گیا تھا اسے مردہ سمجھ کر کسی نے لاشوں کے ڈھیر میں جا ڈالا۔ میں نے اسے سسکتے میں ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا پہچاننے کو دیکر اسے اٹھا لیا۔ اسے بچاتے ہوئے میرا ایمان بابو جی بالکل جل گیا ہے۔“ ماہ دوام ص۱۲۸

بھاگو یہ ڈاکٹر کہتا ہے۔

تو تم سب سے زیادہ مہربانی اور قربانی سے جراثیم کو گھر ہی آئے نا د... قربانی اسے تم سے ہی ہوتی ہے۔ میں اتنی بات کرکے تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ ماہ دوام ص۱۳۰

جب جاوید یہ بات کر رہے تھے [illegible]

انسان کے احساس پر جب [illegible] اور [illegible]

[illegible] بات کے [illegible]

[illegible] کی ہوتی ہے اور [illegible]

[illegible]۔ بار ان کے بارے میں مجھے [illegible]

ہوئی۔ آج اعزاز حاصل کرنے کے بعد [illegible] ہو کر اس

کردار خاص دنیا کا احترام کرتے تھے:

ہر نے [illegible] پر [illegible] اور

[illegible]

[illegible] اور اس کا [illegible]۔

"پان شاپ" میں بھی ایک ایسی لڑکی کشمکش میں مبتلا نظر آتی ہے جس کو اپنے ناگفتہ بہ حالات سے نبرد آزما ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی:

"لڑکی پان شاپ سے باہر آئی اور [illegible] سے [illegible]

[illegible] اے بہت [illegible]

[illegible] نہیں [illegible]

ہیں۔ وہ اپنے بیمار [illegible] اب اس کے

پاس [illegible] کیا تھا؟"

[illegible]

اور [illegible]

کی بیوی [illegible]

[illegible] عمری موت کی
[illegible]

[illegible] سوچتی ہوں مگر

[illegible]

"اور میں عمر کہاں تھی ؟"

وہ [illegible] کی صحبت [illegible] آگئی ۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
بازار کی عورت ہے اور [illegible]
[illegible] ظاہر کرتی ہے :

"۔۔۔ [illegible] کیا [illegible] ہو !"

۔ آپ کا مطلب ہے [illegible] اس جگہ [illegible] کوئی فرق نہیں !

۔ فرق کیوں نہیں ۔ ۔ یہاں بازار کی نسبت [illegible] ہے ، [illegible]
[illegible] کہنا پڑتا ہے کہ [illegible]
[illegible] لیکن وہ
[illegible] کرنے کی کوشش بہر حال [illegible] کرتے ہیں ۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

• جتنی بری [illegible] کا [illegible] [illegible]

چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ہو [illegible] [illegible]

ذہنیت متضاد ہو گئی ہے [illegible] [illegible]

کا اثر ہے پینے کی کمائی ہوئی روٹی سے [illegible] [illegible]

خون: ([illegible])

وہ بھی سکھ مندوں کی طرح ایک آبا سا گھر بنانے یا خط کا خواہش مند ہے مگر غریب اصول

کا اتفاقات [illegible] [illegible] والی کی اصلاح ہوئی

آخر [illegible] کے [illegible] [illegible] کی اس کی دیرینہ

خواہش پوری ہو گئی تھی [illegible]

• [illegible] جہاں [illegible] انسانہ [illegible] غریب

حوصلہ مند اور مشکل حالات سے نبرد آزما نوجوان کی امنگ [illegible] زندگی کی کہانی ہے

اسے قدم قدم پر مشکلات نے گھیر رکھا ہے لیکن وہ ہمت نہیں ہارتا۔ [illegible]

آخری جھوٹ میں سارا ادا ہوتی ہے۔

• آپ نے دفتر کے کام کے لیے مجھے کہا ہے [illegible]

کے لیے معاف کیجئے مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا [illegible]

— ... یہ ٹھیک ہے [illegible]

کسی کی جان کا بوجھ مجھ سے کبھی برداشت نہ ہو گا۔ ([illegible])

زیب النساء [illegible] ایک بیٹے [illegible]

حیثیت غائب کرتا ہے [illegible]

ہے پھر سب [illegible]

حالات کی زد پر گردش میں رہا کرتا [illegible]

گویا افسانے کے دل کے اندر چھپے ہوئے انسان کی طرح ہماری نظروں کو گرفتہ بنالیتی ہیں:

"— کیوں بے۔ بدمعاش کیا ہو رہا تھا یہاں؟"

"— چوری۔"

"— اگر خان دیکھ لے تو۔"

"زینو کانپ رہا تھا۔ خوف سے نہیں، سردی سے۔ اور بولا۔ دیکھ لے تو پکڑے جیسے آپ نے پکڑ رکھا ہے:"

گرہن صفحہ ۸۸

زینو اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے درمیان بے فکری اور بے غرضی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ مار کھا کر بھی چوری کی عادت نہیں چھوڑتا اس کی نفسیات کا مطالعہ بیدی نے جس انداز سے پیش کیا ہے اس کی بنیاد پر ہم زین العابدین کے کردار کو بیدی کے افسانے کو اردو کا معیاری اور منفرد کردار کہہ سکتے ہیں جس کی ہر حرکت اپنے آپ میں صاف گوئی کی بہترین مثال ہے:

"زینو کی قبیح عادت کے ہر پہلو پر غور کیا، زینو کی اس فطرت کا باعث محرومی ہے۔ بچپن ہی سے اسے ہر چیز ہر نعمت زندگی سے محروم رکھا گیا ہے۔ علم، تہذیب، مذہب، شرافت اور قانون کی آڑ میں اس کے قدرتی حقوق غصب کیے گئے ہیں۔ اسی لیے وہ چوری کرتا ہے۔"

خان کی شہد کی لنگی شب و روز کھونٹی پر لٹکتی رہتی ہے اور شریف کی گھڑی صبح و شام تانی چڑی ٹک ٹک کرتی رہتی ہے۔ جہانگیر ریسٹوران کا بل ادا کیا جا چکا ہے ۔ ۔ ۔ کے پیسے بھی چکا دیے گئے ہیں لیکن اب بھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے کسی کا کچھ ادا کرنا ہے لیکن میرا قرض خواہ زینو کتنا بے نیاز

آدمی ہے جو اپنے پیسے کی رتی بھر پروا نہیں ۔۔۔ بوڑھا کہیں کے کر بدنما زرد دانت پڑے ہیں اور ایک کونے میں سفید سے کھلتے ہے۔ زیبا ملا ہوتا۔"

(دگر ہیں ص ۱۰۱-۱۰۲)

افسانہ" لاروے "میں ایک لڑکی کی کہانی کو لاروے کے کیڑے مکوڑوں کے ساتھ استعارے کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ لاروے گندے پانی میں زندہ اور توانا رہتے ہیں۔ صاف پانی پاتے ہی ان کی موت قریب تر آجاتی ہے۔ لڑکی بھی جس پست ماحول میں پلی بڑھی ہے اور جس ماحول میں اس وقت بھی رہ رہی ہے وہی ماحول اس کے لیے صحت بخش ہے۔ کشمیر کی صحت افزا آب و ہوا کم بخت نے جان لیوا بیماری کا سامنا کروا دیا اور وہ اس دنیا سے اسی طرح سدھار گئی جیسے" لاروے" صاف پانی پاتے ہی مرگئے تھے۔

"صاف پانی کی وجہ سے پہلے جھانجھے مرچکے تھے۔ آسمان سے تازہ پانی پڑتے ہی یہ کیڑے ہلاک ہو جائیں گے اور جب تک یہ پانی پھر کثافت سے آلودہ اور باسی نہ ہوگا مزید لاروے وجود میں نہیں آئیں گے۔"

"۔۔۔ عزیزہ کو پہاڑ کا تندرست پانی راس نہ آیا اس کو پیٹ کی پیچش کی شکایت ہوئی اور آج اچانک صبح کے سات بجے مرگئی۔"

(دگر ہیں ص ۱۱۸-۱۱۹)

لاروے ایک علامت ہے۔ اس علامت کے توسط سے بیدی نے انسانی برادری میں" لاروے" کی نشان دہی کی ہے۔ ایسا نشان دہی جو اسعد افسانہ جیسا ایک نادر بن کر ابھری ہے۔ یہی حال" چڑیاں اور پھول" کا بھی ہے ایک موقع کی صنف نازک اور رومانیت سے ملی جلی حرکت کا نفسیاتی مطالعہ۔

اس [illegible] کی بیوی جو بیمار ہے صرف "پہاڑ چھیڑ" کے استعمال سے صحت یاب ہو جاتی ہے۔ بدمزاج اور شکی موچی جسطرح ایک معمولی واقعہ سے برگشتہ ہو کر پھر اپنی بیوی کو افسانے کے آخری جملوں میں زور کی جھڑکی سے نوازتا ہے وہ اس کی سنکی اور جذباتی افتادِ طبع کی علامت ہے۔

بیدی نے اپنے عہد و ماحول کے ساتھ اس عہد و ماحول کے کرداروں کا خوب سے خوب تر مطالعہ کیا ہے۔ کرداروں کی ساخت اور شناخت میں جتنی انفرادیت اور ریاضت کا بیدی کے یہاں امتزاج ملتا ہے وہ اردو افسانے میں اضافے کی چیز ہے۔ افسانے کے فن پر بیدی کی تحریریں گہری اترتی ہیں۔ البتہ زبان کے سلسلے سے ان پر ضرور اعتراضات ہوئے ہیں لیکن ایسے اعتراضات کی گنجائش ہر اس جگہ نکل سکتی ہے جہاں علاقائی ماحول اور کردار کی حقیقی عکاسی کی جائے گی۔ یہاں زبان کی نسبت سے مزید کچھ نہ کہہ کر فن کی نسبت سے بیدی کی فنکاری اور فکری رسائی کا بصد خلوص اعتراف کیا جا رہا ہے اور ان کی سچی اور منفرد کردار سازی کا بھی جن کی بدولت اردو افسانے کو 'بھولا'، 'مادھو'، 'بھولا تلوکا'، 'شمی'، 'اندو'، 'نتی'، 'ببل'، 'زینو'، 'رحمان' اور 'بھاگو' جیسے کردار نصیب ہوئے۔ یقیناً بیدی نے اپنے کرداروں کی تخلیق سے قبل بہت سوچا ہوگا — لکھتے وقت بھی سوچتے رہے ہوں گے اور لکھنے کے بعد قارئین کو سوچنے کے لیے موقع فراہم کر دیا اس وقت تک جب تک اردو افسانے کا نام و نشان باقی رہے گا۔

غزل

سب لوگ لئے سنگِ ملامت نکل آئے
کس شہر میں ہم اہلِ محبت نکل آئے

اب دل کی تمنا ہے تو اے کاش یہی ہو
آنسو کی جگہ آنکھ سے حسرت نکل آئے

ہر گھر کا دیا گل نہ کرو تم کہ نہ جانے
کس بام سے خورشیدِ قیامت نکل آئے

جو در پئے پندار ہیں ان قتل گہوں سے
جاں دے کے بھی سمجھو کہ سلامت نکل آئے

اے ہم نفسو کچھ تو کہو عہدِ ستم کی
اک حرف سے ممکن ہے حکایت نکل آئے

یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ مرے بعد
شاید کہ تمہارا قد و قامت نکل آئے

غزل

احمد فراز

تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدر کے ہو گئے
پھر جو بھی در ملا ہے اسی در کے ہو گئے

پھر یوں ہوا کہ غیر کو دل سے لگا لیا
اندر وہ نفرتیں تھیں کہ باہر کے ہو گئے

کیا لوگ تھے کہ جان سے بڑھ کر عزیز تھے
اب دل سے محو نام بھی اکثر کے ہو گئے

اے یادِ یار تجھ سے کریں کیا شکایتیں
اے دردِ ہجر ہم بھی تو پتھر کے ہو گئے

اب کے نہ انتظار کریں چارہ گر کہ ہم
اب کے گئے تو کوئے ستمگر کے ہو گئے

روتے ہو اک جزیرۂ جاں کو فراز تم
دیکھو تو کتنے شہر سمندر کے ہو گئے

غزلیں

چمن میں جب بھی وداعِ بہار ہوتا ہے
تو پھول پھول کا سینہ فگار ہوتا ہے

[illegible] دل تو محبت کا کچھ نہیں بگڑا
کہ دل کا درد بہت پائیدار ہوتا ہے

تمام عمر بھٹکتے ہیں منزلوں کے لئے
وہ راہرو جنہیں راہوں سے پیار ہوتا ہے

چھپاؤ لاکھ غموں کے الاؤ سینے میں
نظر اٹھاؤ تو سب آشکار ہوتا ہے

جلاؤ قلب و نظر میں چراغ آگہی کا
کہ پھر اندھیرا نظر کا غبار ہوتا ہے

(۲)

میسر ہو نہ جو اپنی خوشی سے
لہو کے اشک بہتر اس ہنسی سے

کہیں راز گلستاں کہہ نہ ڈالے
کلی کو نوچ لو اپنی ہنسی سے

سدا روشن رہا قندیل بن کر
وہ اک لمحہ جو ابھرا تیرگی سے

یہ محرومی تھی یا آسودگی تھی
جنوں کا رنگ چمکا تشنگی سے

قریب جاں ہوا محسوس اکثر
جسے ٹھکرا دیا تھا بے رخی سے

غزل

میرے لب پر مہر تم اک دن لگا کر دیکھنا
پھوس میں ننھی سی چنگاری دبا کر دیکھنا

ساتھیوں کی بھیڑ میں ہیں کتنے تیرہ دل نشاد
اپنے خیمے کا چراغ اک دن بجھا کر دیکھنا

کارزارِ زندگی میں حوصلہ ہے آج بھی
تم کسی اصغر کو ہاتھوں پر اٹھا کر دیکھنا

رہروِ راہِ صداقت کے قدم رکتے نہیں
عابدِ بیمار کو بیڑی پنہا کر دیکھنا

منزلِ مقصود آئے گی نظر دو گام پر
تم کبھی نیزے پر اپنا سر چڑھا کر دیکھنا

ہائے وہ شعلوں کے نغمے اس پہ ہو رقصِ خمو
تم بھی نازش اک دن اپنا گھر جلا کر دیکھنا

نجم ردولوی اور سکندر علی وجد کے انتقال پر اردو اکادمی میں تعزیتی جلسہ

اتر پردیش اردو اکادمی میں کہنہ مشق شاعر جناب نجم ردولوی اور سکندر علی وجد کے سانحۂ ارتحال پر اکادمی کے اسٹاف اور اراکین کا ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جلسے میں مندرجہ ذیل تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔

جناب سید اشر نجم ردولوی اردو کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کا تعلق بارہ بنکی کے مردم خیز ضلعے کے قصبہ ردولی سے تھا جہاں آپ کی ولادت سنہ ۱۹۰۷ء میں ہوئی۔ لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ مرحوم مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے۔ لکھنؤ کی شعری روایات کی چھاپ ان کے کلام پر نظر آتی ہے اور یہاں کی تہذیب کا رچاؤ ان کی شخصیت اور فن دونوں ہی میں نمایاں تھا۔ نجم صاحب امیر مینائی کے شاگرد محمد یوسف اثر ردولوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ ان کا مجموعہ کلام "ہنگام سحر" سنہ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا جس پر اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام بھی دیا تھا۔

نجم صاحب کی کمی ادبی دنیا بالخصوص شعری محفلوں میں ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔

یہ جلسہ مرحوم کے پسماندگان سے اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

جناب سکندر علی وجد اردو کے اعلیٰ پائے کے شاعر، نثر نگار اور ماہر سیاسیات تھے۔ آپ کی ولادت سنہ ۱۹۱۴ء میں ہوئی۔ وجد صاحب نے ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں حاصل کی جہاں کالج میگزین "نورس" کی ادارت کی۔ آگے کی تعلیم کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں داخل ہوئے اور "مجلہ عثمانیہ" کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے حیدرآباد سول سروس کا امتحان پاس کیا اور جج کے عہدے پر فائز ہوئے بعد میں سیشن جج کے عہدے سے قبل از وقت اختیاری سبکدوشی حاصل کی۔ وجد صاحب کو ۱۹۶۲ء میں راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کیا گیا۔ وہ کل ہند انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کے صدر رہے اور ترقی اردو بورڈ

اور چند برس تک اردو اکادمی میں نائب صدر کے عہدے پر فائز رہے۔ حکومت ہند کی طرف سے مرحوم کو پدم شری کا اعزاز بھی عطا ہوا۔

وحید صاحب کے کلام کے چار مجموعے "ہنوز رنگ" (۱۹۴۳ء)، "آفتاب تازہ" (۱۹۵۲ء)، "اوراقِ مصور" (۱۳۸۳ھ) اور "بیاضِ مریم" (۱۳۹۸ھ) شائع ہو چکے ہیں۔ بیاضِ مریم پر اترپردیش اردو اکادمی کا سب سے بڑا انعام دیا گیا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں ہی ان کو غالب اکادمی ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔

وحید صاحب نے لگ بھگ نصف صدی تک اپنے "رشحاتِ قلم" سے اردو ادب کی خدمت انجام دی اور ادب کے بلند معیاروں کی پابندی کرتے ہوئے وافر تخلیقی سرمایہ فراہم کیا۔ ان کے اٹھ جانے سے اردو دنیا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا اب ممکن نہیں۔ یہ جلسہ وحید صاحب کے اچانک سانحۂ ارتحال پر ان کے پسماندگان سے اپنے گہرے حزن و ملال کا اظہار کرتا ہے۔

اردو اکادمی کے دو کارکنوں کو صدمہ

اترپردیش اردو اکادمی کے تعلیمی رابطہ افسر و اترپردیش اردو اکادمی ملازمین یونین و اکادمی اشاعت کتب کے صدر جناب علی باقر زیدی کے صاحبزادے بیٹے زیدی کے اچانک انتقال پر اردو اکادمی ملازمین یونین کا ایک جلسہ اردو اکادمی ہال میں زیر صدارت شری حسین احمد نائب صدر یونین و اشاعت کتب منعقد ہوا۔ جس میں اس سانحہ پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور جناب علی باقر زیدی و دیگر متعلقین کی خدمت میں تعزیت پیش کی گئی۔

اس کے علاوہ اکادمی یونین کے سابق سکریٹری اکادمی کے اکاؤنٹنٹ جناب محمود دلشاد کے خلف اصغر کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ اکادمی ملازمین یونین کے جلسے نے جناب محمود دلشاد اور دیگر متعلقین کی خدمت میں قلبی رنج و الم کا اظہار کرتے ہوئے اظہار تعزیت کیا۔

اس تعزیتی جلسے میں صدر اکادمی جناب علی جواد زیدی اور سکریٹری اکادمی جناب ستیش چندر سنہا نے بھی شرکت کر کے اپنے قلبی رنج و غم کا اظہار کیا۔

اکادمی کی مطبوعات ایک نظر میں

قیمت	مصنف / مرتب	نام کتب	نمبر شمار
۵/-	ریاض الدین	انتخاب منیر شکوہ آبادی	۱
۴/-	ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی	〃 جوش	۲
۴/۰	ڈاکٹر افغان اللہ خاں	〃 فراق	۳
۳/۰	حسرت موہانی / ڈاکٹر احمر لاری	ارباب سخن	۴
۵/۰	نذیر احمد	ابن الوقت	۵
۶/۶۵	شری مراری سنہا	ادب کے نوبل انعام یافتگاں	۶
۷/-	پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب	انیسیات	۷
۳/۶۰	عابد سہیل	اردو کے ادبی رسائل کے مسائل	۸
۹/۰	محمد حسین آزاد	آب حیات	۹
۵/۸۰	ڈاکٹر سید سلیمان حسین	انتخاب مصحفی	۱۰
۴/۰	کاظم علی خاں	〃 صبا	۱۱
۶/۰	ایڈورڈ ٹامسن / شیخ حسام الدین	انقلاب ۱۸۵۷ء	۱۲
۲۳/۰	امیر مینائی	انتخاب یادگار	۱۳
۳/۵۰	ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی	〃 شاد پیرو میر	۱۴
۴/۰	ڈاکٹر فیروز [illegible]	〃 میر ناصر علی	۱۵
۵/۰	ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد	〃 نظیر اکبر آبادی	۱۶

نمبر شمار	نام کتب	مصنف/مرتب	قیمت
۱۷	اصلاح مع ایضاح	شوق نیموی	۲/۸۰
۱۸	شکاوۂ زنداں		۴/۵۰
۱۹	انتخاب نثر حصہ اوّل	پروفیسر سید شبیہ الحسن	۳/۰
۲۰	" نثر حصہ دوم	حکم چند نیر	۳/-
۲۱	" منظومات حصہ اوّل	پروفیسر محمود الہٰی	۴/-
۲۲	" " حصہ دوم	پروفیسر خورشید الاسلام ڈاکٹر مسعود عالم	۳/-
۲۳	" قصائد	حکم چند نیر	۲/۴۵
۲۴	" مرثیہ		۸/-
۲۵	" افسانہ	ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی	۶/۵۰
۲۶	" آغا حشر	کاظم علی خاں	۳/۰
۲۷	" ذکاء اللہ	ڈاکٹر اصغر عباس	۵/-
۲۸	" رشید احمد صدیقی	شہاب الدین ثاقب	۶/-
۲۹	" مستقل	محمد حامد علی	۴/-
۳۰	ایک کہانی	پروفیسر نور الحسن ہاشمی	۲/۶۰
۳۱	بنات النعش	نذیر احمد	۵/-
۳۲	بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب	مرزا جعفر حسین	۱۲/-
۳۳	بہت دیر کر دی	ڈاکٹر علیم سعد	۹/-
۳۴	پنجاب میں اردو	پروفیسر محمود شیرانی	۳/۴۵
۳۵	تنویر الشمس	منشی شمس الدین اعجاز رقم	۴/-
۳۶	توبۃ النصوح	نذیر احمد	۶/۰

نمبر شمار	نام کتب	نام مصنف/مرتب	قیمت
۳۷	جدید اردو تنقید اصول و نظریات	شارب ردولوی	۲۵/-
۳۸	جدید ادب منظر پس منظر	سید احتشام حسین	۱۱/۰
۳۹	جہان آرزو	آرزو لکھنوی	۹/۸۰
۴۰	حسن فطرت	عبرت گورکھپوری	۳/۵۰
۴۱	دلی کا دبستان شاعری	پروفیسر نور الحسن ہاشمی	۱۴/-
۴۲	خطبات آزادی		۱۸/۰
۴۳	دیوان غالب (نسخہ حمیدیہ)	مرزا غالب	۱۳/-
۴۴	رباعیات حالی		۳/-
۴۵	رباعیات انیس	محمد حسن بلگرامی	۴/۱۰
۴۶	روح نظیر	مخمور اکبرآبادی	۱۱/۴۵
۴۷	روسی کہانیاں	حامد اللہ افسر	۴/۴۰
۴۸	رباعیات فراق	فراق	۳۴/-
۴۹	روح رواں	جگت موہن لال رواں	۹/-
۵۰	زرد پتوں کی بہار	رام لعل	۱۱/۸۰
۵۱	سیاسی نظریے	پروفیسر نور الحسن ہاشمی	۷/۶۰
۵۲	سیارۂ افسری	آرزو لکھنوی	۵/۱۵
۵۳	سخندان فارس	محمد حسین آزاد	۱۱/۵۰
۵۴	سخن جوہر	کلام جوہر مرتبہ ڈاکٹر اختر بستوی	۴/۵۰
۵۵	سخن شعرا	عبدالغفور نساخ	۲۲/۵۰
۵۶	سرود زندگی	اصغر گونڈوی	۲/۵۰

نمبر شمار	نام کتب	نام مصنف/مرتب	قیمت
۵۷	صبح جگت	مہاراجہ کشن پرشاد شاد	۴/۵۰
۵۸	[illegible] پتھر کا تک	غلام [illegible]	۹/۲۵
۵۹	فسانۂ عجائب	ڈاکٹر سید سلیمان حسینی	۱۶/۵۰ ۱۸/۰
۶۰	فغان آرزو	آرزو لکھنوی	۵/۵۰ ۶/- مجلد
۶۱	فرہنگ شفق	لالتا پرشاد شفق	۱۲/۰
۶۲	قصیدہ نگاران اتر پردیش	[illegible] چودھری	۱۸/۷۵
۶۳	قومی شاعری کے سو سال	"	۱۷/۰
۶۴	کلیات نعت محسن کاکوروی	نورالحسن	۳/۰
۶۵	گنجینۂ تحقیق	[illegible] موہانی	۱۰/۵۰
۶۶	گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ	عشرت علی صدیقی	۹/۵۰
۶۷	گلشن بے خار	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۵/۴۰ مجلد
۶۸	گلستان بے خزاں	قطب الدین باطن	۱۰/۹۰
۶۹	گلستان سخن	قادر بخش صابر	۱۳/۲۵
۷۰	لالۂ شاداب	مسعود اختر جمال	۷/۳۰
۷۱	[illegible]	آنند نرائن [illegible]	۶/۵۰
۷۲	مراثی دبیر	ڈاکٹر اکبر حیدری	۱۸/۵۰
۷۳	مقدمہ شعر و شاعری	حالی	۵/۰
۷۴	مرأۃ العروس	نذیر احمد	۶/۰
۷۵	[illegible]		[illegible]
۷۶	[illegible]	[illegible]	[illegible]

قیمت	نام مصنف/مرتب	نام کتب	نمبر شمار
۳/۴۰	آرزو لکھنوی	متفرقات آرزو	۷۷
۶/-		مطالعہ اقبال	۷۸
۳/۵۰	کالیداس مترجمہ [illegible] صدیقی	مالویکا اگنی مترا	۷۹
۱۱/۵۰	مولانا شبلی نعمانی	موازنہ انیس و دبیر	۸۰
۱۵/-	نازش پرتاپ گڑھی	نیا ساز نیا انداز	۸۱
۵/۱۵	آرزو لکھنوی	نشانِ آرزو	۸۲
۳/۱۵	" "	نظامِ اردو	۸۳
۱۹/-	محمد عمر نور الٰہی	ناٹک ساگر	۸۴
۵/-	اصغر گونڈوی	نشاطِ روح	۸۵
۱/۲۰	سلطان علی شیدا	[illegible] ہے ایک سفر	۸۶
۶/-	خلیل الرحمٰن اعظمی	زندگی اے زندگی	۸۷
۸/-	مولانا حالی	یادگارِ غالب	۸۸
۳/۵۰	شاہ عبدالسلام	انتخاب مرزا شوق	۸۹
۳/۲۵	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	انتخاب غزلیات حالی	۹۰
۳/۲۰	محمد انصار اللہ	انتخاب رشک	۹۱
۳/-	دونوں ملکوں کی مصنفین کے [illegible]	دستاویز	۹۲
۵/-	ڈاکٹر قیصر جہاں	اردو کے منتخب گیت	۹۳
۳/۰۰	مفتی محمد رضا انصاری	انتخاب حسرت موہانی	۹۴
۲/۵۰	سید محمد [illegible]	انتخاب [illegible]	۹۵
۱۵/-	سید محمد عقیل رضوی [illegible]	اردو [illegible] کا انتخاب	۹۶

قیمت	نام مصنف/مرتب	نام کتب	نمبر شمار
۶/-		مقالات ام جوہر	۹۷
۴/-		پریم چند صدی کے افسانے	۹۸
۶/-	ظفر احمد صدیقی	انتخاب مومن	۹۹
۵/۲۵	امجد علی خاں	انتخاب قلق	۱۰۰
۲/-	نجم الدین انصاری	" شاد عظیم آبادی	۱۰۱

درج ذیل کتب زیر طبع ہیں:

۱	افادات	خورشید لکھنوی
۲	نظریۂ تنقید	کلیم الدین احمد
۳	سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوستان سے شیفتگی و محبت کے جذبات	سید صباح الدین عبدالرحمٰن
۴	لکھنؤ کا دسترخوان (طبع دوم)	مرزا جعفر حسین
۵	مقالات صدیقی (اوّل)	عبدالستار صدیقی
۶	انتخاب مہدی افادی	پرویز احمد
۷	" واجد علی شاہ	کوکب قدر
۸	" فسانۂ عجائب	قمر جہاں
۹	" رند لکھنوی	علی جواد زیدی
۱۰	ولی ویلوری	قاضی جمال حسین
۱۱	" صفی لکھنوی	سید زائر حسین کاظمی
۱۲	" محاکم	انیس اشفاق

۱۳	انتخاب آبرو	آغا محمد باقر
۱۴	• ظرافت لکھنوی	سید عبدالباری
۱۵	• سودا	غلام حسین
۱۶	عکسِ گل	شمیم کرہانی
۱۷	انتخاب ناسخ	کاظم علی خاں
۱۸	رامائن فراقی	رائے سدھ ناتھ علی فراقی
۱۹	رسالہ زمانہ کی ادبی خدمات	شفیع احمد عثمانی
۲۰	مقالات یوم دیا نرائن نگم	
۲۱	انتخاب سخن	حسرت موہانی گیارہ جلدوں میں فوٹو آفسیٹ ایڈیشن
۲۲	انتخاب سب رس	نورالحسن ہاشمی
۲۳	• کربل کتھا	حنیف نقوی
۲۴	• فسانۂ آزاد	صباح الدین عمر
۲۵	• شرر	حامد سہیل
۲۶	• آتش	ولی الحق انصاری
۲۷	• یگانہ	شمس الرحمٰن فاروقی
۲۸	• اساس اردو قاعدہ	وجاہت علی سندیلوی
۲۹	• تذکرہ ظہور حق	محمود الٰہی
۳۰	دستاویز جلد دوم	(سوانحی خاکے مصنفین کے [illegible])